۷ شمارہ ۱۰] لاہور [جنوری ۱۹۵۵ء

اس شمارہ میں

مدیر تحریر { پروفیسر سراج الدین / ایم - اے - مخدومی }

معاونین { عبدالغفور چوھدری / فضل احمد }

دہلی
تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

جنوری ۱۹۵۵ء
جلد ——— ۷
شمارہ ——— ۱۰

سالانہ چندہ
پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز
یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

اداریہ

ایم۔ اے۔ مخدومی

ہماری ثانوی تعلیم کا سارا انتظام ان متعدد موثرات کی پیداوار ہے جو پچھلی ایک صدی میں اس پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں، اول اول یہ نظام یورپ سے درآمد کیا گیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ ایک محکوم ملک کی مخصوص ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اس میں رد و بدل ہوتا گیا۔ بالآخر ثانوی تعلیم واضح طور پر یونی ورسٹی تعلیم کی تیاری بن کر رہ گئی۔ آج تک اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

موجودہ صدی کے آغاز ہی میں یہ احساس پیدا ہونے لگا تھا کہ ثانوی مدرسے پر علمی مضامین کا ضرورت سے زیادہ بوجھ لاد دیا گیا ہے۔ آزادی کی آمد کے بعد یہ احساس بہت شدید صورت اختیار کر گیا۔ صنعتی زندگی کے تقاضے اس حقیقت کو واشگاف کرنے لگے کہ ثانوی تعلیم کو یونی ورسٹی کی تیاری قرار دے دینا سراسر غیر موزوں ہے، چناں چہ اس بات کا مطالبہ ہونے لگا کہ ثانوی تعلیم یونی ورسٹی کے تابع نہ رکھی جائے بلکہ اسے نوجوانوں کی گوناگوں ضرورتوں کو زیادہ موثر طور پر پورا کرنے کا ذریعہ بنایا جائے، رفتہ رفتہ ثانوی تعلیم کی تنظیم نو کا مطالبہ زور پکڑتا گیا۔

کچھ عرصہ سے یہ کوشش جاری ہے کہ ثانوی تعلیم کو ایسی شکل دی جائے جو نہ صرف اس کے تاریخی پس منظر سے ہم آہنگ ہو بلکہ موجودہ صنعتی دور کی ضرورتوں کا بھی ساتھ دے، اس سوال پر قدرتی طور پر طرح طرح کی بحثیں چھڑ گئی ہیں۔ ایک طرف اصلاح کے شیدائی ہیں جو چاہتے ہیں کہ ثانوی مدرسے کو ماضی کے بوسیدہ اثرات سے پوری طرح پاک کر دیا جائے، دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کی

نگاہ میں پرانے طریق تنظیم۔ پرانا نصاب اور پرانا تصور مقصد بڑی خوبی کا حامل ہے۔

اس ضمن میں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ثانوی مدرسہ ایک معاشرتی ادارہ ہے اور ہر دوسرے معاشرتی ادارے کی طرح یہ ارتقائی ترقی کی پیداوار ہے۔ فہمیدہ معاشرتی ارتقا کے لیے ضروری ہے کہ متخاصم نعروں کے ہنگامے میں پس منظر کے احساس کو مٹنے نہ دیا جائے۔ موجودہ عناصر میں سے بقا اور نشو نما کے لیے صرف وہی عناصر چنے جانے چاہئیں جو اس وقت نہ صرف قدر و قیمت رکھتے ہوں بلکہ قابل عمل بھی ہوں۔

پنجاب میں ثانوی تعلیم اس وقت تبدیلی کے ایک نئے دور میں داخل ہونے والی ہے۔ دوسروں کے مقابلے میں اساتذہ پر یہ فرض سب سے زیادہ عائد ہوتا ہے کہ وہ موجودہ افرا تفری اور اس کے اسباب کو اچھی طرح سمجھے، اگر وہ احساس پس منظر کو برقرار رکھ سکا اور حالات کا بے لاگ جائزہ لے سکا تو لامحالہ ثانوی تعلیم اور پیشہ معلمی سے متعلق بے اطمینانی گھٹنے لگے گی۔

ہر تعلیمی اصلاح کی کامیابی یا ناکامی کی آخری ذمہ داری انہیں لوگوں پر ہونی چاہیئے جن کے ہاتھ میں نئی پود کو تعلیم دینے کا اہم کام سونپا گیا ہے۔

اعلیٰ ثانوی تعلیم کے لیے ایک نئی طرز کے ادارے کے قیام کے متعلق سب سے پہلے کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے سفارش کی تھی اس کے بعد اس طرح کی کچھ اور سفارشیں بھی ہوئیں۔ کمیشن نے اس بات پر زور دیا تھا کہ ان اداروں میں تدریس اور ضبط کے جو طریقے استعمال ہوں وہ کالج کی بجائے مدرسوں کے طریقوں سے ملتے جلتے ہوں۔ ان اداروں کی کامیابی یا ناکامی کا اندازہ ہی اس معیار سے ہونا چاہیے۔ ہمارے ماہرین تعلیم کی تخلیقی قوت فکر کے لیے یہ مسئلہ ایک کھلی ہوئی دعوت ہے، انہیں ایک ایسے ثانوی مدرسے کی تعمیر کرنی چاہیئے جو نوجوانوں کی ضرورتوں کو زیادہ موثر طریقے پر پورا کرے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

صدر معلم کی خدمت میں گذارش

فضل احمد

"آموزش" کے پچھلے شمارہ میں مفتی محمد اقبال صاحب کے قلم سے ایک لمبا مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "سمعی بصری معاونات اور تشکیل کردار" ہر چند کہ مضمون کا ایک بہت بڑا حصہ غیر ضروری اشعار سے لبریز تھا اور اس کے عام مندرجات سے ہمیں اصولی اختلاف تھا۔ پھر بھی یہ مضمون جوں کا توں شائع کر دیا گیا تاکہ ہمارے تجربہ کار صدر معلموں کے اسلوب فکر کا کچھ اندازہ ہو جائے۔ مفتی صاحب موصوف سالوں تک اے ڈی۔آئی۔ر ہے ہیں۔ اور اب ایک گورنمنٹ ہائی اسکول کے صدر معلم ہیں۔ اس لیے ان کے افکار کو پرانے اور سیانے نگران حضرات کے انداز فکر کا بڑی حد تک ترجمان خیال کیا جا سکتا ہے۔

تربیتی درس گاہوں سے شکایت

فاضل مضمون نگار نے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا ہے کہ تعلیمی سیر کو مدرسے کے نصاب کا مرکز بننا چاہیے اس کے بغیر کتابوں کی لفظی علامتیں اور استاد کے زبانی الفاظ بالکل بے جان رہتے ہیں۔ اس نظریہ کی تائید میں انہوں نے قرآن حکیم سے بھی سند پیش کی ہے۔ اس سند پر یہاں بحث کی گنجائش نہیں، ہم صرف ان کی اس شکایت کا جواب دیں گے جو انہیں تربیتی درس گاہوں سے ہے انہیں اس بات کا بڑا گلہ ہے کہ ٹریننگ کالج اور نارمل اسکول اپنے نصاب میں تعلیمی سیر و سیاحت کا کچھ اہتمام نہیں کرتے نتیجہ یہ ہے کہ ان کے فارغ التحصیل اساتذہ اس بصیرت سے خالی رہتے ہیں جو عبرت گاہ عالم کے زنگا رنگ مشاہدہ ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ نیم پختہ استاد مدرسوں میں جا کر بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں، مگر خود زندگی کی اصل حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں، اس لیے بچوں کے لیے مناسب تعلیمی سیر و سیاحت کا بندوبست کرنے کے معاملہ میں یکسر نااہل ثابت ہوتے ہیں ان کی یہ نااہلی تدریس کو بے معنی اور بے جان رکھتی ہے۔ بے چارہ

صدر معلم بے بسی کے عالم میں تعلیمی ضیاع کے اس افسوس ناک منظر کو دیکھتا ہے اور خون کے گھونٹ پی کر چپ رہتا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ جی ہی جی میں ٹریننگ کالج یا نارمل اسکولوں کو کوسے وہ اور کیا کر سکتا ہے ؛ اگر احساس فرض نے زیادہ ابال کھایا تو ان تربیتی اداروں کو کھلم کھلا برا بھلا کہہ لیا اور معاملہ ختم ہو گیا۔

یہ اسلوب فکر صرف کسی خاص صدر معلم تک محدود نہیں، ہم نے کئی تجربہ کار صدر معلموں اور دوسرے نگراں حضرات کو اسی انداز پر سوچتے دیکھا ہے۔ مدرسے میں انگریزی کے معیار گرتے جا رہے ہیں تو صدر معلم صاحب اس کی ساری ذمہ داری جھٹ ٹریننگ کالج پر ڈال دیتے ہیں کہ اگر ٹریننگ کالج بی۔ ٹی اور سی۔ ٹی کے طالب علموں میں انگریزی زبان کی ٹھوس قابلیت پیدا کر دیا کرے تو یہ لوگ مدرسوں میں آکر غلط انگریزی کیوں بولا یا لکھا کریں ؛ یہی حال، سائنس، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، اردو اور دوسرے مضامین کا ہے، اگر ٹریننگ کالج اور نارمل اسکول ایسے استاد پیدا کریں جو ان مضمونوں پر پوری قدرت رکھتے ہوں تو مدرسوں کے تدریسی معیار کیوں گریں ؛ اب ایک تجربہ کار صدر معلم نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ تربیتی درس گاہوں کے ذمہ یہ فرض بھی عائد ہونا چاہیے کہ وہ متعلم اساتذہ کو مارکو پولو یا ابن بطوطہ نہیں تو کم از کم پختہ کار جہاں دیدہ افراد بنا کر ضرور بھیجا کریں، جب تک وہ اس فرض کو پورا نہیں کرتے اس وقت تک ان کا سارا کام اکارت جائے گا۔

تربیتی درس گاہوں کی ذمہ داری

یہ اسلوب فکر اس قدر عام ہے اور اس نے ہمارے تعلیمی فکر میں اتنی بے مقصدی پیدا کر رکھی ہے کہ اس کا ذرا گہری نگاہ سے جائزہ لینا ضروری ہے، اس ذہنی انتشار کو دور کرنے کے لیے ہمیں دو سوالوں کا جواب دینا چاہیے

(۱) کیا تربیتی درس گاہوں کی ذمہ داری ایک عام تعلیم دینا ہے یا مخصوص پیشہ ورانہ تعلیم ؟

(۲) کیا نوجوان اساتذہ میں عقل کی اسپ پختہ کاری تربیتی درس گاہیں چھوڑنے سے پہلے پیدا ہونی چاہیے یا یہ پختہ کاری رفتہ رفتہ عملی تجربہ اور تخلیقی رہنمائی سے پیدا ہو گی ؟

(۱) پہلے سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں پہلے یہ طے کر لینا چاہیے کہ آیا استاد کے لیے صرف اتنا ہی

کافی ہے کہ نفس مضمون پر پوری قدرت ہو یا اسے مقاصد تعلیم اور بچوں کی نفسیات کا علم بھی ہونا چاہیے
غالباً اس امر میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ محض علمی تبحر کسی شخص کو اچھا استاد نہیں بنا سکتا۔
علمیت کے ساتھ اسے مقاصد تعلیم اور طریقہ ہائے تدریس کی بھی خبر ہونی چاہیے۔ اگر وہ اس دوسری
خوبی سے عاری ہے تو وہ ایک اچھا عالم ہونے کے باوجود ضروری نہیں کہ ایک اچھا استاد بھی
ہو۔ ایک اوسط شخص پیشہ ورانہ تربیت کے بغیر مقاصد تعلیم اور طریقہ ہائے تدریس سے آگاہ نہیں
ہو سکتا۔ تربیتی درس گاہوں کی اولین غایت یہ ہے کہ نئے آنے والے استادوں کو پیشہ ورانہ تربیت دیں
ان کے دوسرے فرائض ثانوی درجہ رکھتے ہیں۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ انگریزی، ریاضی، اردو، تاریخ، جغرافیہ اور دوسرے مضامین میں
ٹھوس قابلیت پیدا کرنا بھی تربیتی درس گاہوں ہی کی ذمہ داری ہے تو پھر مدرسے اور کالج
کس مرض کی دوا ہیں؟ جو طالب علم تربیتی درس گاہوں میں آتے ہیں وہ زندگی کے کئی سال عام تعلیم
کی نذر کر چکے ہوتے ہیں۔ تربیتی درس گاہوں میں وہ عموماً آٹھ نو مہینوں سے زیادہ عرصہ نہیں گذارتے
اگر یہ درس گاہیں اس مختصر عرصہ میں مضامین کی طرف توجہ کرنا چاہیں بھی تو کچھ زیادہ موثر کام نہیں کر
سکتیں۔ تربیتی عرصہ اتنا چھوٹا ہے کہ یہ درس گاہیں بمشکل تمام اپنا مخصوص فرض پورا کر پاتی ہیں۔
چہ جائیکہ متعلم اساتذہ کو، زبانوں، ریاضی، سائنس، اور دوسرے مضامین کی اعلیٰ تعلیم دینے کے لیے
بہت زیادہ وقت نکالیں، اب اگر یہ مطالبہ بھی کیا جائے کہ چند ماہ کے تربیتی عرصہ میں متعلم اساتذہ
کو "سیروا فی الارض" کے فریضہ سے سبکدوش کرنا بھی ٹریننگ کالج اور نارمل اسکولوں ہی کی ذمہ داری
ہے تو اس کے جواب میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؎

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

ٹریننگ کالج کے متعلق ہمیں علم ہے کہ اس کی تاریخی، جغرافیائی اور سائنسی انجمنیں ہر سال
تعلیمی سیر وتفریح کا کچھ نہ کچھ اہتمام ضرور کرتی ہیں، اسی طرح مختلف مضامین کے اساتذہ طریقہ ہائے تدریس
کے ساتھ ساتھ اپنے مضامین میں طلبہ کی علمیت کو معیاری بنانے کے لیے بھی حتی الامکان کوشش

کرتے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ نارمل اسکول بھی ان ثانوی تربیتی سرگرمیوں کے معاملے میں کوتاہی نہیں کرتے ہوں گے، لیکن جیسا عرض کیا جا چکا ہے یہ کام اِن اداروں کا اولین فرض نہیں، وہ اس کی طرف صرف ضمناً ہی توجہ دے سکتے ہیں۔

(۲) ہمارے کئی صدر معلموں اور نگران حضرات کو دوسری بڑی شکایت یہ ہے کہ ٹریننگ کالج اور نارمل اسکول جن استادوں کو تیار کر کے مدرسوں میں بھیجتے ہیں وہ عموماً عقل کی پختہ کاری سے عاری ہوتے ہیں، "بر نیم پختہ" نوجوان صدر معلموں اور ڈی۔ آئی صاحبان کے لیے مستقل دردِ سر کا باعث بنے رہتے ہیں، یہ شکایت کوئی نئی نہیں، آج سے کوئی ایک چوتھائی صدی پہلے جب ایک صدر معلم نے مدرسے کی سالانہ کارکردگی کی رپورٹ انسپکٹر مدارس کو بھیجی تو اس میں راقم کو "ایک پیارا سا چھوکرا" کہہ کر پکارا گیا تھا، اس کے کئی سال بعد ہم دونوں کو ایک بار پھر یکجا ہونے کا مختصر سا موقع ملا، لیکن اس دفعہ صدر معلم صاحب پس قدمی کر کے مدرسی کے درجہ پر آ چکے تھے اور راقم متعلم اساتذہ کی مشقی تدریس کی نگرانی کے لیے مقرر تھا۔

ایک بہت بڑے مدرسے میں اردو مدرس کی ایک جگہ خالی تھی، کئی لوگ وہاں تبادلہ کرانے کے خواہاں تھے۔ راقم کے ایک نوعمر دوست انسپکٹر مدارس سے ملے اور درخواست کی کہ انہیں وہاں تبدیل کر دیا جائے۔ انسپکٹر صاحب نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا اور فرمایا وہاں کسی پختہ کار استاد کو بھیجنا چاہتا ہوں، اس پر انہوں نے عرض کی کہ بے شک میں ابھی پختہ کار نہیں اور غالباً دس پندرہ سال تک اس پختگی کو نہیں پہونچوں گا جو ایک استاد کا خاصہ ہونی چاہئے لیکن میں اصلاحِ نفس کے لیے کوشاں ضرور رہتا ہوں، انسپکٹر صاحب۔ صاحبِ نظر تھے فوراً ان کا تبادلہ اس جگہ کر دیا۔

ترقی یافتہ ملکوں میں اب یہ بات پوری طرح تسلیم کر لی گئی ہے کہ تربیتی درس گاہوں کا کام استادوں کی دورانِ ملازمت بالیدگی کی بنیاد رکھنا ہے اور بس۔ استاد کی حقیقی بالیدگی کا کام اس وقت شروع ہوگا جب وہ ملازمت میں قدم رکھے گا۔ تربیتی درس گاہ نے اسے زیادہ تر

نظری تعلیم دی تھی۔ مدرسے کی دنیا میں وہ ان اصولوں اور نظریات کی عملی کارفرمائیوں کو جانچے گا۔ وہ ان بنیادی اقدار کی عملی قدر و قیمت کو آزما کر دیکھے گا جو فلسفۂ تعلیم اور مقاصد تعلیم کے نام پر اس کے ذہن میں پیوست کی گئی تھیں، مدرسے کی زندگی وہ تجربہ گاہ ہے جس میں استاد عقل کی پختہ کاری سیکھتا ہے۔ پس تربیتی درس گاہوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ تربیت کے چند مہینوں میں نکلنے والے استادوں کو فنی پختہ کاری سے لیس کر دیں گی ایک سراسر بے جا توقع ہے۔

دورانِ ملازمت بالیدگی

اساتذہ کی دورانِ ملازمت بالیدگی کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے یعنی صدر معلم اور نگران حضرات جھٹ کہیں گے کہ اگر یہ ذمہ داری ٹریننگ کالج اور نارمل اسکولوں کے کندھوں پر نہیں تو پھر اس کا سارا بوجھ خود استاد کے کندھوں پر ہے، یہ جواب صحیح نہیں دورانِ ملازمت بالیدگی کی ذمہ داری مدرسہ کی فضا پر ہے، اس میں سب سے موثر عنصر لامحالہ خود نگران مدرسہ یعنی صدر معلم یا انسپکٹر مدارس ہے، اگر وہ تخلیقی رہنمائی کرنا جانتا ہے۔ اگر وہ اپنے ساتھیوں کے دلوں میں امید اور اعتماد کی روح پھونک سکتا ہے تو یقیناً نو آموز اساتذہ کی خام طبعی اور نیم پختگی رفتہ رفتہ پختہ کاری میں تبدیل ہونے لگے گی۔ اس کے برعکس اگر صدر معلم نے اپنے ارد گرد خوف و تہدید اور یاس و تاریکی کا ماحول پیدا کر رکھا ہے تو لازمی طور پر نوجوان اساتذہ اس ماحول میں اپنی فنی تر و تازگی کھونے لگیں گے اور رفتہ رفتہ اسی ماحول کے رنگ میں ڈوب جائیں گے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں یہ بات پوری طرح تسلیم کر لی گئی ہے، کہ لگاتار فنی بالیدگی استاد کی سب سے نمایاں خصوصیت ہونی چاہیئے۔ اسے ملازمت میں قدم رکھنے کے وقت سے لے کر سبک دوش ہونے تک ذہنی اور فنی طور پر لگاتار بڑھتے رہنا چاہیے تعلیم اساتذہ کا یہ متحرک تصور اس بات کی شدت سے نفی کرتا ہے کہ استادوں کو عقل کی سب پختہ کاری تربیتی درس گاہوں ہی سے لے کر آنا چاہیے۔ اس قسم کا جامد تصور جدید تعلیم کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ تعلیم لگاتار نشو و نما کا نام ہے، جو شخص اس نشو و نما کا اہتمام کرے گا خود اس کے اپنے اوپر نشو و نما کے دروازے بند نہ ہونے چاہئیں، بالکل جس طرح بچوں کی تسلی بخش نشو و نما کے لیے سازگار ماحول کا ہونا ضروری ہے

بالکل اسی طرح استاد کی بالیدگی کے لیے بھی ضروری ہے کہ اسے سازگار ماحول میسر آئے۔

جو صدر معلم اور نگران نو آموز استادوں کی "نیم پختگی"، خام طبعی اور بد دلی کی شکایت کرتے نہیں تھکتے انہیں پہلے اپنے دلوں کو اچھی طرح ٹٹولنا چاہیے۔ انہیں اپنے آپ سے یہ سوال پوچھنا چاہیے کہ کیا وہ تخلیقی رہ نمائی کے فرائض انجام دے رہے ہیں؟ یہ بجا ہے کہ انہیں سرکاری طور پر قائدانہ حیثیت دی گئی ہے، اس حیثیت کے آگے ہر استاد کو چار و ناچار سر جھکاتے ہی بنے گی۔ لیکن کیا وہ ذاتی مراسم، باہمی تعاون اور مشترکہ مقاصد کی بنا پر بھی قائدانہ درجہ قائم کرنے میں کام یاب ہوئے ہیں؟ اگر ان کی قیادت کا تمام تر سہارا ان کی سرکاری حیثیت ہی ہے اور ان کے ذاتی اوصاف کو اس میں کچھ دخل نہیں تو پھر سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے مدرسے کا ماحول اساتذہ کی بالیدگی کے لیے سازگار نہیں۔ اس ماحول میں کام کرنے والے اساتذہ "نیم پختہ"، خام طبع اور بد دل ہی رہیں گے۔ لیکن اس کی ذمہ داری اساتذہ کی نسبت صدر معلم پر زیادہ ہوگی۔

صدر معلم انسانوں کے ایک ایسے گروہ کی رہ نمائی کرتا ہے جس کے ہاتھوں میں ایک نہایت اہم قومی خدمت سونپی جاتی ہے۔ یہ رہ نمائی حکم اور سرکاری حیثیت کے رعب سے انجام نہیں پا سکتی۔ اس کے لیے ایک حقیقی طور پر پاکیزہ سیرت کی ضرورت ہے۔ ڈین ملیی نیو یارک یونی ورسٹی میں سکول آف ایجوکیشن کے [illegible] کئی سال تک [illegible] وہ ایک مدرسے کے نگران تھے۔ ان کے ایک رفیق کار نے راقم کو [illegible] ان کی تنخواہ میں چند صد ڈالر کا اضافہ کیا۔ انہوں [illegible] اس طرح بانٹا جائے۔ استادوں [illegible] بعینہٖ منظور کیا اور سالوں تک [illegible] ایک ایسے صدر معلم کے ساتھ [illegible] تنخواہ میں گراں قدر اضافہ [illegible] ملی کی [illegible] قیادت کی بنیاد

خالی سرکاری حیثیت پر نہ تھی، یہ ماحول ان کے ساتھیوں کی بالیدگی کے لیے از بس سازگار تھا، انھیں اپنے کسی ساتھی کی "نیم پختگی" کی شکایت کرنے کا موقع مل ہی نہیں سکتا تھا، اس کے برعکس جس بزرگوار کا تجربہ راقم کو ہے وہ اپنے استادوں کو ان کی بددلی اور نیم پختگی کے لیے صلواتیں سنانے نہیں تھکتے تھے اور مدرسے کی ساری برکات کا سرچشمہ صرف اپنی ذات بابرکات کو قرار دیتے تھے، ان کی ساری قیادت سرکاری منصب کے سہارے قائم تھی، اس سرکاری رعب کا بھرم ٹوٹا تو اکثر پرانے ساتھی حضرت کی شکل دیکھنے کے روادار نہ رہے جس مدرسے کو اس قسم کا صدر معلم ملا ہو وہاں استادوں پر امید اور اعتماد کے دروازے کیسے کھلیں؟ ان کی "نیم پختگی" بددلی اور خام طبعی کیسے دور ہو۔

خاتمہ کلام

دور حاضر کے تقاضوں نے تعلیم کو جو فوق العادۃ اہمیت دی ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ باقی قوموں کی طرح ہم بھی مقدور بھر اس کوشش میں لگے ہیں کہ ملک کی تعلیمی حالت بہتر ہوتی جائے، اس موضوع پر قلم اٹھانے یا زبان کھولنے والے حضرات میں سے اکثر اساتذہ کی درسگاہوں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ انھیں اعلیٰ قسم کے استاد تیار کرنے چاہئیں اور اساتذہ سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ انھیں اپنے کردار میں بلندی اور نگاہ میں گہرائی پیدا کرنی چاہیے، یہ مطالبے اپنی جگہ بالکل بجا ہیں، لیکن اس ضمن میں استاد اور استادوں کی تربیتی درسگاہیں بجا طور پر یہ مطالبہ کر سکتی ہیں کہ دوران ملازمت استادوں کی تخلیقی رہ نمائی کا خاطر خواہ بندوبست کیا جائے، اچھی موثر تدریس کے لیے استاد کی لگاتار بالیدگی ضروری شرط ہے، یہ بالیدگی تخلیقی رہ نمائی کے بغیر ممکن نہیں، نظام تعلیم میں نگران یا صدر معلم کی آسامی ایک کلیدی آسامی ہے، یہ آسامی ایسے لوگوں سے پر ہونی چاہیے جو تخلیقی رہ نمائی کے اوصاف سے مالا مال [illegible] امید ہے کہ پرانے اور نئے صدر معلم اور نگران حضرات اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کریں گے [illegible]یات کی ضمانت ہوں گے کہ "نیم پختہ" اور بددل استاد بھی زود و بدیر پختہ کار اور [illegible]یں جو صدر معلم یا اے۔ ڈی۔ آئی تخلیقی رہ نمائی کرنا جانتا ہو، اغلب یہ ہے کہ اسے [illegible] کام کرنے والوں کی "نیم پختگی" اور بددلی کی شکایت کرنے کا موقع بہت شاذ ملے گا۔

❖

مدارس میں عربی کی تعلیم

محمد مظفر الدین

عربی ہماری مذہبی زبان ہے، قرآن مجید، احکامات الٰہی، احادیث رسول، ارشادات ائمہ و تابعین، اقوال اولیا و مرشدین اور تصنیفات اکابرین عربی زبان میں ہیں۔ ان کے افہام و تفہیم کیلیے عربی زبان کا سیکھنا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ نماز جس کا روزانہ پڑھنا ہر مسلمان پر فرض ہے، اسی زبان میں ہے، اسے سمجھنے اور اس سے اثر پذیر ہونے کے لیے عربی زبان آنی چاہیے ورنہ بغیر سمجھے بوجھے نماز کے فقرات یاد کر لینے اور طوطے کی طرح بول دینے سے نماز پڑھنے والوں کے دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور نماز کا مقصد کما حقہ، پورا نہیں ہوتا۔ اسکولوں میں اب دینیات پڑھائی جانے لگی ہے، اس سے پورے طور پر بہرہ ور ہونے کے لیے طلبا کو عربی سے شناسا ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کے آبا و اجداد کی معرکۃ الآرا تصانیف و تحقیقات اور علوم و فنون کا ذخیرہ جس کی وجہ سے وہ بقائے دوام سے ہم کنار ہیں۔ علوم فلسفہ، منطق، طب، کیمیا، ریاضی، اخلاق، نفسیات، جلسیات، فلکیات، معانی، بیان، عروض، صرف و نحو، تاریخ و جغرافیہ، فقہ، تفسیر، حدیث وغیرہ سب عربی زبان میں ہیں

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

اس عظیم الشان ورثہ کو حاصل کرنے اور اس سے مستفید ہونے کے لیے لازمی ہے کہ عربی زبان کو سیکھا جائے اور اکتساب علم کیا جائے۔

سیاسی دنیا میں ہم آج کل اسلامی بلاک بنا رہے ہیں، عربی اس بلاک کے بیشتر حصے کی زبان ہے۔ اس بلاک میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور قریب آنے کے لیے ہمارے لیے عربی زبان پر حاوی ہونا ضروری ہے۔ تاکہ ہم مذہبی، اقتصادی اور معاشرتی میل ملاپ قائم کر سکیں اور

مسلم برادرہڈ کو سمجھ سکیں، احیائے ملت کے لیے ضروری ہے کہ زبان کو فروغ دیا جائے اور لسانی یگانگت پیدا کی جائے۔

عربی زبان دنیا کی سب زبانوں سے وسیع ہے، جتنا ذخیرہ الفاظ اس زبان میں ہے دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں۔ اس لیے اس کو اُمّ اللسان کہا جاتا ہے۔ لہٰذا مدارس اور عربی کے معلمین کو جو اس زبان کی تعلیم کے ذمہ دار ہیں اس کی اہمیت اور اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنا چاہیے اور عربی کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے پڑھنا چاہیے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ انگریزی مدارس میں اس زبان کی اہمیت نظرانداز ہو رہی ہے اور یہ ایک مردہ زبان کی طرح پڑھائی جا رہی ہے۔ عام نقائص جو اس کی تدریس میں پائے جا رہے ہیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) عام طلبہ عربی کی قرأت (ریڈنگ) صحیح طور پر نہیں کر سکتے۔ ان کے پڑھنے کا لب و لہجہ ناقص ہے۔ رُک رُک کر پڑھتے ہیں جن الفاظ کو اکٹھا پڑھنا چاہیے انہیں وقفہ ڈال کر علیحدہ علیحدہ پڑھتے ہیں اور جہاں نہیں رکنا چاہیے، وہاں رک جاتے ہیں۔ ہمزہ وصلی والے الفاظ جن کے پہلے کوئی دوسرا لفظ یا حرف آجائے غلط پڑھتے ہیں، مثلاً فَاذْكُرْهُ کو فَـا ذْكُرْ پڑھتے ہیں، ان الفاظ کا جن کے شروع میں حروف شمسی آتے ہیں تلفظ صحیح طور پر نہیں کرتے مثلاً وَالشَّمْسُ کو وَلْشَمْسُ، اَلنُّوْرُ کو اَلْنُوْر اور عَبْدُ الرَّحْمٰنِ کو عَبْدُ اَلْرَحْمَان پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ادغام کا خیال نہیں رکھتے مثلاً مَنْ يَّشَآ کو مَنْ يَشَا یعنی "ی" کو بغیر مشدد کیے پڑھتے ہیں اور قُلْ رَّبِّ کو قُلْ رَبِّ پڑھتے ہیں۔

(۲) طلبا عام طور پر حروف کے مخارج سے ناآشنا ہوتے ہیں مثلاً ک، ق، ء، ا، ع۔ ت، ط۔ ز، ظ، ض۔ ذ، س، ص وغیرہ حروف کی ادائیگی صحیح طور پر نہیں کر سکتے۔

(۳) طلبا قواعد عربی میں خاص طور پر کمزور ہوتے ہیں، الفاظ کی ماہیت نہیں سمجھتے۔ انہیں بہت تھوڑی گردانیں یاد ہوتی ہیں اور جو ہوتی ہیں وہ بھی رواں نہیں ہوتیں۔ بدیں وجہ سناتے وقت اغلاط کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مخصوص افعال کے علاوہ دوسرے افعال کی گردانیں نہیں کر سکتے۔ فَعَلَ

اور اِنَّا جیسے الفاظ کو فَعَلَ اور اِنَّ کی طرح بولتے ہیں۔

(۴) عربی کے اسباق اس طریقہ سے کہ لڑکے طوطے کی طرح کہانی تو بیان کر دیتے ہیں لیکن انفرادی طور پر الفاظ کے معانی سے نابلد رہتے ہیں۔

(۵) وہ اردو سے عربی میں ترجمہ نہیں کر سکتے اور غیر درسی یا ناخواندہ عبارت کا مفہوم سمجھنے سے عاری ہوتے ہیں۔

(۶) عربی رسم الخط کی طرف ضروری توجہ مبذول نہیں ہوتی، بیشتر طلبہ صحیح طور پر نہیں لکھ سکتے: مثلاً۔ عملاً، حقیقتاً، فی الحقیقت، دار الخلافہ جیسے الفاظ غلط لکھتے ہیں۔

(۷) کتاب میں اسباق کے اختتام پر دیے ہوئے سوالات حل نہیں کرائے جاتے۔

(۸) تحریری کام تھوڑا کرایا جاتا ہے۔

(۹) الفاظ کے لغوی معانی نہیں بتائے جاتے۔

(۱۰) عام طور پر عربی مدرسین کا کوئی کمرہ نہیں ہوتا، وہ باہر بیٹھتے ہیں۔ وہاں انہیں تختہ سیاہ میسر نہیں ہوتا۔ اور وہ عربی کی تعلیم زبانی زبانی بغیر تختہ سیاہ کی مدد کے دیتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ:۔

(۱) عربی پڑھنے اور نہ پڑھنے والوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا، اس مضمون میں طلبا کی طلبیت سطحی ہوتی ہے جو اس کو چھوڑ دینے کے بعد جلد ہی موقوف ہو جاتی ہے۔

(۲) عربی کے مضمون کو طلبا بہت مشکل اور بے سود خیال کرنے لگ جاتے ہیں۔ اور اس کے متعلق ان کے دلوں میں بجائے کشش کے نفرت جاگزیں ہو جاتی ہے۔

(۳) لڑکے صرف اسی عبارت کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں جو انہوں نے پڑھی ہوتی ہے نہ پڑھی ہوئی کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

(۴) اکثر الفاظ کا تلفظ غلط اور لب ولہجہ ناقص ہوتا ہے طلبہ کتابت صحیح طور پر نہیں کر سکتے۔

(۵) عربی پڑھنے والے طلبا عربی میں ایک فقرہ بھی نہیں بول سکتے۔

ان نقائص کی اہم وجوہ حسب ذیل معلوم ہوتی ہیں :-

۱) مدرس کا ناقص طریقۂ تدریس۔ آج کل عربی معلمین کی تربیت کا کوئی انتظام نہیں جو مدرس ہائی کلاسوں کو دو سال یہ مضمون پڑھائے اسے سند حاصل ہو جاتی ہے اور وہ اس مضمون کی تدریس کا اہل خیال کیا جانے لگتا ہے، لیکن حقیقت میں دو سال کا تجربہ ناکافی ہے۔ ٹریننگ نہ ہونے کی وجہ سے مدرس اسباق کو دلچسپ بنانے کے وسائل اختیار نہیں کرتا، لڑکوں کا تعاون حاصل نہیں کرتا، لڑکوں سے اخذ کرانے والی باتیں اخذ نہیں کراتا، خود ہی بتا دیتا ہے اور جیسے مٹکے میں پانی ڈالا جاتا ہے لڑکوں کے دل و دماغ میں عربی کا علم ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے۔

۲) مدرسین کا لکیر کا فقیر ہونا۔ وہ اسی طریقہ سے تعلیم دیتے ہیں جس طرح انہوں نے خود پڑھا تھا اسباق کو دلچسپ بنانے یا ذہن نشین کرنے کے طریقے اختیار نہیں کیے جاتے۔

۳) عربی کے مدرسین کا احساس کمتری ۔ عام طور پر اسکولوں میں عربی اور فارسی کو دیگر مضامین کے مقابلے میں کم وقعت دی جاتی ہے اور ان مضامین کے پڑھانے والوں کی دوسرے معلمین کے مقابلہ میں قدر کم ہوتی ہے۔ اس وجہ سے عربی معلمین کا وقار کم ہو جاتا ہے، وہ طلبا کو کچھ نہیں کہتے، طلبا کے دلوں میں بھی ان کا خاص احترام۔ رعب، ڈر یا خوف نہیں ہوتا اور وہ عربی کے مضمون کی طرف مناسب توجہ نہیں دیتے۔

۴) عربی کے مضمون کے لیے تھوڑے پیریڈ مخصوص ہونا۔ طبقہ مڈل میں عربی کو بیشتر مدارس میں ہفتہ میں چار پیریڈ دیے جاتے ہیں۔ جتنا کام اس مضمون میں کرنا چاہیے اس کے لیے ناکافی ہے،

۵) مدرسین کی محدود لیاقت : بہت سے عربی مدرسین کی اپنی لیاقت محدود ہوتی ہے، وہ عام طور پر خلاصے رٹ کر تھرڈ ڈویژن میں مولوی فاضل کیے ہوتے ہیں۔ گرامر اور الفاظ کی ماہیت پر انہیں اعلیٰ درجہ کی دسترس نہیں ہوتی۔ ملازم ہو جانے پر اکثر مطالعہ چھوڑ بیٹھتے ہیں اور اپنے علم کو فراموش کر جاتے ہیں۔

۶) مشاہرہ کی قلت : عربی مدرسین کو عام طور پر ایس۔ وی کا گریڈ جو ۶۰ روپے سے شروع ہوتا ہے

دیا جاتا ہے، یہ فی زمانہ قلیل ہے۔ اس لیے اعلیٰ قابلیت رکھنے والے عربی دان اس طرف کم آتے ہیں جو آتے ہیں انہیں قلیل مشاہرہ ملنے کی وجہ سے اپنا فارغ وقت بجائے مطالعہ پر صرف کرنے کے ضروریات زندگی مہیا کرنے کی تگ و دو یا بڑھے ہوئے اخراجات زندگی پورا کرنے کے لیے اپنی آمدنی کو بڑھانے کی فکر پر صرف کرتے ہیں۔

(۷) عام طور پر پرائمری اور مڈل جماعتوں میں اردو گرامر اچھی طرح نہیں پڑھائی جاتی جس کی وجہ سے طلبہ گرامر میں طاق نہیں ہوتے اور عربی گرامر شروع کرتے وقت طلبہ کو زیادہ دقت ہوتی ہے۔

(۸) نصاب تعلیم میں عربی کو غیر اہم مضمون رکھا گیا ہے، اس وجہ سے طلبا اس مضمون کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

(۹) ہیڈ ماسٹر صاحبان اور افسران معائنہ کی عربی سے عدم دلچسپی اور اس پر ان میں سے بہتوں کا کما حقہٗ عبور نہ ہونا۔

ان حالات کی اصلاح کے لیے حسب ذیل تجاویز بطور مشورہ پیش کی جاتی ہیں:

(۱) مدرسہ میں ہر ماہ ایک دن انجمن معلمین کے اجلاس کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ اس میں مختلف موضوعات پر معلمین کے اسباق اور تعلیمی مسائل پر بحث و تمحیص ہونی چاہیے تاکہ غیر تربیت یافتہ مدرسین اصول اور طریق تعلیم سے آشنا ہو جائیں۔

(۲) عربی کے معلمین صاحبان کو عربی کی مختلف کتب کا مطالعہ کرنا اور اپنی قابلیت کو وسیع کرنا چاہیے۔ مختلف مصنفین اور مؤلفین کی مرتبہ کتب اور قواعد صرف و نحو کو پڑھنا چاہیے اور ان میں دی ہوئی نئی باتوں کو نوٹ کر لینا چاہیے، اس سے ان کی علمیت میں اضافہ ہوگا اور جو تعلیم وہ دیں گے وہ مؤثر ہوگی۔

(۳) طلبا کو جو سبق پڑھا جائے اس کی ریڈنگ یعنی قرأت کرائی جائے، اغلاط کی درستی دوسرے طلبا کی مدد سے کلاس میں کی جائے۔ کمزور لڑکوں سے بیریڈ میں ضرور پڑھایا جائے اور طلبا کو کہا جائے کہ گھر پر بھی قرأت کی مشق کریں، دوسرے روز ان سے نہ صرف سبق سنا جائے بلکہ قرأت بھی

کرائی جائے ابتدائی جماعتوں میں قرأت پر خاص طور پر زور دیا جائے اور اس کی مشق کرائی جائے۔ باقی جماعتوں میں بھی شروع شروع میں ریڈنگ پر زور دیا جائے۔ بولنے کا اب و لہجہ اور الفاظ کا صحیح تلفظ ذہن نشین کیا جائے، حرکات و سکنات۔ تنوین و تشدید۔ حروف مدولین۔ ہمزہ وادغام کی مختلف صورتیں واضح کی جائیں جن الفاظ کو طلبہ غلط پڑھیں ان کی حسب ضرورت مشق کرائی جائے۔

(۴) قواعد عربی پر خاص زور دیا جائے، کیوں کہ عربی زبان کے صحیح اصول کا انحصار گریمر پر ہے جب تک طلبا کو گریمر اچھی طرح نہیں آئے گی انہیں عربی اچھی نہیں آئے گی۔ الفاظ کا مادہ اور ابتدا افعال کی صورتیں وزن، باب اور مختلف اقسام بنانے کے طریقے، صرف صغیر، ونزترکیب بتائی جائے۔ بڑی جماعتوں میں صرف کبیر بھی بتائی جائے اور سنی جائے۔ گردانیں خوب از بر کرائی اور سنی جائیں مخصوص افعال کے علاوہ دوسرے افعال کی گردانیں بھی کرائی جائیں۔ بڑی جماعتوں کے طلبا کو ابواب اور ان کے خواص بھی یاد کرائے جائیں، کیوں کہ ابواب کے تغیر سے مصدر میں بھی تغیر ہو جاتا ہے۔

(۵) عربی مدرسین کو تختہ سیاہ دیا جائے اور وہ اسے خوب استعمال کریں، جو کچھ بتانا ہو وہ صرف زبانی ہی بتادینے پر اکتفا نہ کریں بلکہ تختہ سیاہ پر لکھ کر ذہن نشین کرائیں۔

(۶) اقوال و امثال، احکامات اور اچھے اچھے چیدہ فقرے بھی طلبا کو یاد کرائے جائیں، اسی طرح اشعار بھی بامعنی یاد کرائے جائیں۔

(۷) درسی کتاب کا سبق پڑھانے وقت بھی طلبہ سے گریمر سے متعلق ایسے سوالات پوچھے جائیں جو عبارت کا مفہوم سمجھنے میں مدد ہو سکتے ہیں، مثلاً کسی فعل کا باب، کسی کا صیغہ، کسی عامل کا عمل وغیرہ ترجمہ پہلے لفظی اور پھر با محاورہ کرایا جائے۔ کسی کسی فعل یا لفظ کو فقروں میں استعمال کرایا جائے اس طرح کتاب کے سبق، گریمر اور ترجمہ کو باہم مربوط کیا جائے جس سے اسباق زیادہ ذہن نشین ہو سکیں مثلاً نَظَرَ رَجُلٌ اِلیٰ فَیلَسُوفٍ یُؤَدِّبُ تِلمِیذًا پڑھاتے وقت طلبا سے پوچھا جائے نَظَرَ کس قسم کا فعل ہے؟ کون سا صیغہ ہے؟ اس کے کیا معنی ہیں؟ اس سے فعل مضارع کیا ہوگا؟ "میں نے دیکھا" کی عربی کیا ہوگی یُؤَدِّبُ کس قسم کا فعل ہے؟ کس باب سے ہے؟ اس کا

وزن کیا ہے؛ ادب کرنے والے کو کیا کہیں گے؛ شیئًا کیوں منصوب ہے؟ اِلیٰ گرامر میں کیا ہے اس کا کیا عمل ہوتا ہے؟

(۸) ہر جماعت میں شروع شروع میں نچلی جماعت میں پڑھی ہوئی گرامر کا اعادہ کیا جائے تاکہ وہ پختہ ہو جائے۔ ہائی کلاسوں میں گرامر کے اصولوں کا استعمال کرا کر عبارت کو اعراب لگانے کی مشق بھی کرائی جائے۔

(۹) عربی میں چھوٹے چھوٹے مکالمے بھی طلبا سے تیار کرائے جائیں۔

(۱۰) الفاظ کے مشتقات بھی پوچھے اور پڑھائے جائیں مثلاً اگر پڑھتے پڑھتے فعل بَلَغَ آیا ہے تو اس سے نکلنے والے افعال اور اسما پوچھے جائیں اور واضح کیے جائیں، مثلاً۔

افعال: يَبْلُغُ، لَمْ يَبْلُغْ، لَنْ يَبْلُغَ، لَا تَبْلُغْ،......

اسمأ: بَالِغٌ، مُبَلِّغٌ، مَبْلَغ، بُلُوْغٌ، ....

(۱۱) مادہ سمجھانے کے لیے لفظ کے مختلف مشتقات لیے جائیں اور پھر طلبا کو کہا جائے کہ وہ ان کو بغور دیکھ کر بتائیں کہ وہ کون کون سے حروف ہیں جو ان سب الفاظ میں پائے جاتے ہیں مثلاً جِلْسَه۔ اِجلاس، جَلَسَ، جُلُوْس، يَجْلِسُ، مَجْلِسْ وغیرہ۔

(۱۲) عام الفاظ کو فقرات میں بھی استعمال کرایا جائے اور طلبا سے کہا جائے کہ ہر ایک اپنا اپنا فقرہ بنائے۔ مثلاً لفظ ذَهَبَ لیا جائے اور لڑکے اسے اپنے اپنے فقروں میں استعمال کریں۔ ذَهَبَ عَبْدُ الْحَمِيْدِ اِلَى الْمَدْرَسَةِ، ذَهَبْتُ اِلَى السُّوْقِ، ذَهَبْنَ اِلَى دَارِهِنَّ وغیرہ

(۱۳) بعض جملوں میں بعض الفاظ گھٹا بڑھا کر یا ان کی جگہ دوسرے الفاظ لگا کر ان کا مطلب پوچھا جائے اور فقرے بنوائے جائیں مثلاً: ذَهَبَ الرَّجُلُ اِلَى السُّوْقِ میں خط کشیدہ الفاظ کی بجائے کوئی اور فعل اور حرف لگائے جائیں تو یہ فقرہ ہو جائے گا، جَاءَ الرَّجُلُ مِنَ السُّوْقِ۔

(۱۴) پڑھے ہوئے فقروں اور عبارت پر عربی میں آسان آسان سوالات پوچھے جائیں اور طلبہ سے عربی میں جواب لیا جائے۔ مثلاً حسب ذیل عبارت یا اس کے نیچے لکھے ہوئے سوالات ہو سکتے ہیں جن کا جواب طلبہ مشق کے بعد عربی میں دے سکیں گے۔

سَرَقَ رَجُلٌ صُرَّةً مِنَ الدَّرَاهِمِ وَمَضَى حَتَّى أَتَى إِلَى الْمَسْجِدِ فَدَخَلَ يُصَلِّيْ. فَقَرَأَ الْإِمَامُ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يَا مُوْسٰى، وَكَانَ اِسْمُ الْأَعْرَابِيِّ مُوْسٰى. فَقَالَ لَا شَكَّ إِنَّكَ سَاحِرٌ ثُمَّ رَمَى الصُّرَّةَ وَخَرَجَ هَارِبًا۔

سوال	جواب
(i) أَيُّ شَيْءٍ سَرَقَ رَجُلٌ؟	سَرَقَ رَجُلٌ صُرَّةً۔
(ii) إِلٰى أَيْنَ ذَهَبَ سَارِقٌ؟	ذَهَبَ السَّارِقُ إِلَى الْمَسْجِدِ۔
(iii) مَا قَرَأَ الْإِمَامُ؟	قَرَأَ الْإِمَامُ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يَا مُوسٰى
(iv) مَا كَانَ اِسْمُ الْأَعْرَابِيِّ؟	كَانَ اِسْمُ الْأَعْرَابِيِّ مُوْسٰى
(v) لِمَ رَمَى السَّارِقُ صُرَّةً؟	لِأَنَّهُ ظَنَّ السَّارِقُ أَنَّ الْإِمَامَ خَبِيْرٌ بِحَالِهِ۔

(۱۵) ترجمہ کو گرامر سے مربوط کیا جائے جن الفاظ و فقرات کا اردو سے عربی میں ترجمہ کرنا ہو ان کے افعال و صیغے وغیرہ پوچھ کر عربی میں ان کے متقابل الفاظ اخذ کرائے جائیں، ترجمہ پہلے زبانی کرا کر ذہن نشین کیا جائے اور پھر اس کو کاپیوں پر لکھا کر کرایا جائے، درستی احتیاط اور باقاعدگی سے کی جائے یہ سرخ سیاہی سے ہو۔ تصحیحات کی طلبا سے مشق کرائی جائے۔

گرامر میں اگر فعل ماضی اور اس کی گردان پڑھائی اور یاد کرائی جائے تو اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے بھی ایسے فقرے لیے جائیں جن میں فعل ماضی کا استعمال ہو مثلاً وہ بیٹھا جَلَسَ، تم بیٹھے جَلَسْتُمْ۔ ایک عورت بیٹھی جَلَسَتْ، میں بیٹھا جَلَسْتُ وغیرہ۔

فعل مضارع پڑھایا جائے تو ترجمہ کے لیے ایسے فقرات لیے جائیں جن میں فعل مضارع ہو

مثلاً وہ بیٹھتا ہے یا بیٹھے گا یَجْلِسُ ، وہ نہیں بیٹھا مَا جَلَسَ وغیرہ ۔

(۱۶) کاپیوں میں جو کچھ لکھایا جائے وہ درس کے بعد طلبا کو یاد کرنے کو کہا جائے اور ان سے سنا جائے اگر سنا نہیں جائے گا تو وہ اسے یاد نہیں کریں گے، کیوں کہ عام طلبا اسی بات کو یاد کرتے ہیں جو ان سے سنی جاتی ہو۔

(۱۷) تحریری کام خصوصاً اردو سے عربی میں ترجمہ زیادہ ہونا چاہیے ۔

(۱۸) کتاب میں اسباق کے آخر پر دیے ہوئے سوالات جماعت میں طلبا کو کرائے جائیں۔ پہلے زبانی پھر تحریری۔

(۱۹) لڑکوں کو کتاب کا بازاری خلاصہ خرید کر استعمال کرنے سے باز رکھا جائے۔ اس کی بجائے انھیں الفاظ اور معانی کی کاپیاں بنوائی جائیں اور ان پر ان کو سبق کے ان الفاظ و محاورات کے معانی جو ان کو نہیں آتے لکھائے جائیں ۔ ان کاپیوں کی اصلاح بھی کی جائے اور طلبا کو کہا جائے کہ ان کو یاد کرلیں۔ معانی لکھاتے وقت تختہ سیاہ کا استعمال کیا جائے ۔

(۲۰) جو سبق طلبا کو پڑھایا جائے وہ دوسرے روز ان سے ضرور سنا جائے چاہے ایک آدھ سوال ہی پوچھا جائے۔ گاہے گاہے آموختہ کا اعادہ کرایا جائے۔ ہر مہینہ مختصر سا امتحان لیا جائے اور نتیجہ کا ریکارڈ باقاعدہ ڈائری میں رکھا جائے۔

(۲۱) عربی کو زیادہ وقت ملنا چاہیے، کم از کم پانچ پیریڈ ہفتہ میں مڈل کی جماعتوں میں ہونے چاہییں

(۲۲) اچھے قابل معلمین حاصل کرنے کے لیے مشاہرہ معقول ہونا چاہیے ۔

(۲۳) عربی معلمین کی تربیت کے لیے خواہ ٹریننگ کلاسز کھولی جائیں خواہ ریفریشر کورس منعقد کیے جائیں اور انھیں اصول تعلیم اور طریق تدریس سے روشناس کرایا جائے ۔

نصاب کی ماہیت

فضل احمد

کیا اور کیسے؟

ہر تعلیمی ادارہ اپنا مخصوص لائحہ عمل تیار کرتا ہے جو اس چیز کا فیصلہ کرتا ہے کہ طالب علموں کو کیا کچھ پڑھایا جائے اور کس طرح پڑھایا جائے، یہ دونوں سوال نصاب سازی کا سنگ بنیاد ہیں۔ مدرسے کا سارا نصاب انہی دو سوالوں کے جوابوں سے عبارت ہوتا ہے۔ ہر مدرسہ ان دو سوالوں کے جواب اپنے خاص حالات اور اپنے ماحول کے تقاضوں کے مطابق دے گا۔ وہ اس بات کا پورا لحاظ رکھے گا کہ اس کے سامنے کون سا نصب العین ہے اور وہ یہ بات بھی پیش نظر رکھے گا کہ اس کی تعلیم سے استفادہ کرنے والے کون ہیں۔ مدرسے کا نصاب گویا بچوں یا نوجوانوں کے ایک خاص گروہ کو تعلیم دینے کا ایک ایسا منصوبہ ہوتا ہے جو کسی مقررہ نصب العین کی خاطر انہیں مسلسل اور ترقی پذیر تعلیم دینا چاہتا ہے، یہ ہمہ گیر منصوبہ مدرسے کے تمام تدریسی اور غیر تدریسی مشاغل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، اس میں نہ صرف مختلف درسی کتابوں کو شامل کیا جائے گا، بلکہ کھیلوں، تفریحی مشاغل اور سیر و سیاحت کو بھی، مختلف جماعتوں کے سلیبس اسی ہمہ گیر منصوبے کی شاخیں ہوں گے اور یہ سب کو مل کر مدرسے کے نصاب کا مقصد پورا کریں گے، نصاب مرتب کرتے وقت مدرسہ صرف اسی بات کو نگاہ میں نہیں رکھے گا کہ اس کے طے شدہ مقاصد کی مناسبت سے کون کون سے مضامین اور کون کون سی سرگرمیاں نصاب میں شامل ہونی چاہئیں وہ اس بات کا بھی لحاظ رکھے گا کہ یہ مضامین اور سرگرمیاں کس طور پر پیش کی جائیں، اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے نہ صرف نفس مضمون ایک اہم چیز ہے بلکہ طریق تدریس اور طرز کار بھی یکساں اہم ہے، نصاب کے مندرجات اور ان کی تدریس کا طریقہ وہ دو اہم سہارے ہیں جن پر نصاب کی ساری عمارت کا انحصار ہے، ان دونوں میں سے کسی ایک کو نظر انداز کر کے اس عمارت کے استحکام کو قائم نہیں رکھا جا سکتا۔

نصاب سازی کا یہ تصور حال ہی کی پیداوار ہے، صدیوں تک نصاب کے مندرجات ہی سب کچھ تھے
پھر ترقی پسندی کی دھن میں مندرجات کو یک قلم نظر انداز کر کے طریق کار ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا
اس نکتہ پر تفصیلی بحث بعد میں ہو گی۔ پہلے نصاب سازی کے دو اہم اصولوں پر بحث کی جائے گی۔

دو بنیادی اصول

نصاب کے لیے سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ وہ ان طلبا کی فوری تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرے جن کے لیے اسے وضع کیا گیا ہے، غالباً اس بات میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ بچوں کی پہلی ضرورت نشو و نما کی ضرورت ہے ان کے اعضا و قوا، بڑی شدت کے ساتھ بڑھنے پھولنے کے مواقع کا مطالبہ کرتے ہیں ان کی بدنی اور ذہنی قوتوں کے لیے بڑھنے پھولنے کے مواقع بہم پہونچانا گویا بچوں کی فوری تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے، کیونکہ تعلیم کا واحد منشا ہی یہ ہے کہ بچوں کی تمام خوابیدہ صلاحیتوں کو جگا کر ان کی صحت مند اور متوازن نشو و نما کا بندوبست کرے۔

آئیے بچوں کی ان فوری تعلیمی ضرورتوں پر ذرا تفصیلی نگاہ ڈالیں، یہ ضرورتیں تین قسموں میں بانٹی جا سکتی ہیں (۱) جسمانی (۲) معاشرتی (۳) ذہنی اور روحانی۔

(۱) بچوں کی اہم ترین جسمانی ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنے اعضاء کو حسب ضرورت آسانی اور خوبی کے ساتھ استعمال کر سکیں، وہ اپنے ہاتھ پاؤں، ٹانگوں، بازوؤں اور دوسرے اعضا کو اس سہولت اور کمال کے ساتھ استعمال کر سکیں کہ اس طرح نہ صرف اپنی اہم ضرورتوں کو پورا کر لیں بلکہ اس معاملہ میں وہ اپنے ہمجولیوں سے کسی طرح پیچھے بھی نہ رہیں۔ اعضاء کا ایسا استعمال انہیں اس قابل بنا دے گا کہ اپنے ماحول کی اچھی طرح چھان بین کریں اور اس کے اجزا کو ادھر ادھر کر کے اچھی طرح دیکھ سکیں، ان کی دوسری بدنی ضرورت یہ ہے کہ انسان نے صدیوں کے علم اور تجربہ کی مدد سے طبعی ماحول پر قابو پانے کے لیے جو آلے اور اوزار بنائے ہیں انہیں استعمال کر سکیں مختصر یہ کہ بچوں کی فوری جسمانی ضرورت یہ ہے کہ وہ خوب دوڑ، اچھل اور پھلانگ سکیں۔ اور ان عام آلوں کو استعمال کر سکیں جن کو وہ رات دن گھر میں اور گھر سے باہر استعمال ہوتا دیکھتے ہیں۔

(۲) بچوں کی معاشرتی ضرورت یہ ہے کہ وہ جس معاشرتی ماحول میں پیدا ہوئے ہیں اسکو اچھی طرح

سکیں، دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنا انسانی خمیر میں داخل ہے، دوسروں سے کلی طور پر کٹ کر
لی گزارنا انسانی فطرت کے خلاف ہے، یہ فطری مطالبہ بچے کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ جس
شرے میں پیدا ہوا ہے اس کے رنگ ڈھنگ اختیار کرے۔ بچے کو جس معاشرتی ماحول سے
قہ پڑتا ہے، اس کا دائرہ قدم بقدم بڑھتا جاتا ہے، اول اول اسے کنبے کے محدود افراد سے
سطہ پڑتا ہے، پھر گلی محلے کے رہنے والوں سے، اس کے بعد مدرسے کی دنیا سے غرض بلوغت کو
پہنچنے تک معاشرتی تعارف کا یہ دائرہ وسیع سے وسیع ہی ہوتا چلا جاتا ہے، اس ترقی پذیر معاشرتی
رے میں اپنے مقام کو معین کرنا اور اس مقام کی ذمہ داریوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کرنا بچے کی
بولتی معاشرتی ضرورت ہے، اگر یہ ضرورت پوری نہ ہوگی تو بچہ اپنے معاشرتی مقام کو برقرار نہیں رکھ
ے گا اور اس کے لیے دوسروں کے ساتھ نباہ کرنا دوبھر ہو جائے گا۔ نصاب مدرسہ میں ایسے مشاغل
علوم موجود ہونے چاہئیں، جو بچے کی اس اہم ضرورت کو اچھی طرح پورا کریں۔

(۳) بالغ انسانوں کی طرح بچوں کی ذہنی اور روحانی ضرورتیں اطمینان قلب سے پوری ہوتی
۔ مادی آسائشوں کی رکھ فراوانی ہو، انسانی قلب و روح کو ایک اور بھوک ستاتی رہتی ہے
ادی ساز و سامان سے دور نہیں ہو سکتی، یہاں اس بھوک کی ماہیت میں جانے کی ضرورت نہیں
ت پوری طرح مسلمہ ہے کہ جسمانی قوا، اور گرد و پیش کی دنیا پر ذہنی قابو حاصل کر لینے سے انسان
ایک خاص قسم کی اندرونی راحت محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح نگاہ میں گہرائی اور وسعت پیدا ہونے سے
یہ اور مشاہدہ کے حسن اور رنگینی میں جو اضافہ ہوتا ہے وہ بھی دلی راحت کا موجب ہوتا ہے بالکل
ی طور پر تخلیقی قوتوں کے بروئے کار آنے سے انسان کو دلی سکون حاصل ہوتا ہے، نصاب میں
سی سرگرمیوں کا اہتمام ہونا چاہیئے جو بچوں کی ان ذہنی اور روحانی ضرورتوں کو پورا کریں۔

نصاب سازی کا دوسرا بڑا اصول یہ ہے کہ بچوں کو بالغ زندگی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے
اہل بنانے کی کوشش کی جانی چاہیے، لیکن اس اصول پر ذرا احتیاط کے ساتھ عمل ہونا چاہیئے
دائمی نصاب میں صرف اسی اصول کو اولیت دی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ بچوں پر اس قسم کے

علوم اور شاغل ٹھونسے جاتے تھے جن کا خود ان کی اپنی نگاہ میں کوئی فائدہ نہیں تھا، استاد ہر چند ڈنڈے کی مدد سے یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتا تھا کہ یہ چیزیں تمہیں آگے چل کر کام دیں گی لیکن ان کی طبیعت کے فوری تقاضے اس وعظ و تلقین کو جھٹلاتے تھے، اس کا نتیجہ اکثر حالتوں میں یہ ہوتا تھا کہ طالب علم آگے آگے بھاگا جا رہا ہے اور تعلیم لٹھ لیے اس کا پیچھا کر رہی ہے، جدید نفسیاتی دریافتوں نے اس طریق کار کی لغویت اچھی طرح واضح کر دی ہے، بچے کو بے شک آئندہ زندگی کے لیے بھی تیار کرنا چاہیے، لیکن یہ تیاری اس طور پر ہونی چاہیے کہ اس کی طبیعت کے فوری تقاضوں کا راستہ رکنے نہ پائے، نصاب میں ایسی سرگرمیاں اور اس قسم کی معلومات کا اہتمام ہو جو بچے کی موجودہ صلاحیتوں اور ضرورتوں کے حسب حال ہوں۔

برنارڈ شاہ کا قول ہے کہ بچہ اس بات کا پورا حق رکھتا ہے کہ اس کی زندگی کی ہر منزل کو مقصود بالذات سمجھا جائے اور اس کی زندگی کے کسی حصے کو آنے والی امید کی بنا پر تلخ نہ بنا دیا جائے۔ زندگی کی ہر منزل اپنے جداگانہ تقاضے رکھتی ہے۔ آئندہ منزل کی بہترین تیاری اس کے سوا کچھ نہیں کہ موجودہ منزل میں بھرپور زندگی بسر کی جائے، اگر بچپن کی منزل میں بھرپور زندگی بسر کرنے کے مواقع موجود ہیں تو یہ اس امر کی بہترین ضمانت ہے کہ بالغ زندگی کے بوجھ سنبھالنے کی صلاحیت از خود پیدا ہو جائے گی۔ بچے کو اس بات کا پورا احساس ہونا چاہیے کہ اس نے کوئی قابل ذکر کام انجام دیا ہے تعلیمی میدان میں یہ احساس اس وقت پیدا ہوگا جب اسے ان اغراض و مقاصد کی پوری طرح خبر ہو جن کے لیے اسے کام کرنے کو کہا جاتا ہے، اور ساتھ ہی اسے یہ بھی یقین ہو کہ یہ کام اسے فوری طور پر فائدہ دینے والا ہے یہ کام کسی موہوم "وعدہ فردا" کے لیے نہیں بلکہ فوری حاصل ہونے والے سکون و اطمینان کے لیے کیا جانا چاہیئے۔

دوسرے اصول کو اس کی جائز حدود میں رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اصول کو پل بھر کے لیے بھی نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے، جدید استاد مدرسے کی اس ذمے داری سے انکار نہیں کرتا کہ اسے ثقافت اور فکر انسانی کی عظیم الشان روایات کی بقا و اشاعت کا آلہ بننا چاہیے۔

تاہم وہ اس بات کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرتا ہے کہ بچے کا تعلق جدید زندگی کے ان پہلوؤں کے ساتھ پیدا کیا جائے جو اس کی ذہنی سطح اور عمر کے تقاضوں کے لحاظ سے اس کے لیے حقیقی دلچسپی کا سبب ہوں، غرض بچوں کی فوری اور حقیقی ضرورتوں میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ بچوں کی فوری جسمانی، معاشرتی ذہنی اور روحانی ضرورتوں کے پورا ہونے سے ایک ایسی پائدار بنیاد قائم ہو سکتی ہے جس پر بالغ زندگی کی جسمانی، معاشرتی، ذہنی اور روحانی ذمہ داریوں کی عمارت اٹھائی جا سکتی ہے اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ بچہ جس دنیا پر قابو حاصل کرنا چاہتا ہے اس میں بالغ زندگی کے مشاغل بھی شامل ہیں، لہٰذا اس کی تعلیم کے لیے جن مشاغل کو نصاب میں شامل کیا جائے ان میں سے بعض مشاغل بالغ زندگی سے بھی لیے جا سکتے ہیں، لیکن اس ضمن میں اتنی احتیاط ضرور ملحوظ رہنی چاہیے کہ یہ مشاغل بچوں کے نقطۂ نگاہ سے دیکھے جائیں، بالغوں کے نقطۂ نگاہ سے نہیں، غرض اگر بچے کی فوری ضرورتوں کو نظر انداز نہ کیا گیا تو بھی نصاب میں بہت سی ایسی چیزیں شامل ہو سکتی ہیں جو آگے چل کر اس کے لیے زندگی میں سود مند نہ ہوں۔

مندرجات کا انتخاب

معلم اساتذہ تربیتی درس گاہوں سے فارغ ہو کر مدرسہ کی عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو ان میں سے کسی کو نظر آتا ہے کہ مدرسوں میں جو نصاب چالو ہیں وہ اوپر دیے گئے دو اصولوں کے مطابق نہیں حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مروجہ نصاب بہت سے مؤثرات کی پیداوار ہیں، نصاب میں بعض چیزیں محض اس لیے چلی آرہی ہیں کہ وہ عرصہ سے اس میں موجود ہیں۔ ان کی قدامت ہی ان کے وجود کا جواز بن گئی ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جو محکمہ نے تجویز کر رکھی ہیں، کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو صدر معلم اور پہلے مدرسوں کی داخل کی ہوئی ہیں، یہ سب کچھ ہے لیکن یہاں یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ نصاب میں یک دم انقلاب پیدا کر دینا قریباً ناممکن ہے، اس کی اصلاح و ترمیم تدریجی طور پر ہی ممکن ہے۔ البتہ یہ امر ناقابل انکار ہے کہ نصاب کی اصلاح و ترمیم کے سلسلے میں اب جو قدم بھی اٹھایا جا رہا ہے وہ مندرجہ بالا اصولوں ہی کی رہنمائی میں اٹھایا جا رہا ہے اور عام میلان یہی ہے کہ نصاب کو بچوں کی استعداد کے

حسب حال بنایا جائے نہ کہ بچوں کو نصاب کے ساتھ ہم قدم ہونے پر مجبور کیا جائے۔

اب ہم آگے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مدرسے کے نصاب میں جو علوم مہارتیں اور مشاغل شامل ہوں وہ انسانی زندگی کے کون سے حصوں سے چنے جائیں؟ انسانی زندگی کے بنیادی مشاغل کو آٹھ دس گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ انسان نے جب سے اس دنیا میں قدم رکھا ہے اسوقت سے دو بڑے سوال اس کے سامنے رہے ہیں۔ پہلا یہ کہ طبعی ماحول میں کیا رد و بدل کیا جائے اور اس سے کس طرح کام لیا جائے کہ زیادہ سے زیادہ بدنی آسائش میسر ہو۔ دوسرا سوال یہ کہ نظام کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کے متعلق کیا عقیدہ قائم کیا جائے کہ زیادہ سے زیادہ ذہنی اور روحانی چین نصیب ہو۔ انسانی زندگی کے رنگا رنگ مشاغل دنیا کے ساتھ انسان کے اس دوگونہ تعلق ہی کی تفسیر ہیں انسان کی جسمانی، ذہنی اور روحانی تخلیقی قوتیں جن نکاسوں میں بہتی رہی ہیں وہ بنیادی انسانی روایات کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ یہ بنیادی انسانی مشاغل حسب ذیل ہیں:

(۱) طرح طرح کی چیزوں کی پیداوار

(۲) ان چیزوں کی تقسیم

(۳) ان چیزوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا یعنی رسل و رسائل

(۴) اپنے اور اپنے عزیزوں کے جان و مال کا بچاؤ۔

(۵) نئی پود کو ثقافتی ترکہ سونپنا یعنی اسے تعلیم دینا۔

(۶) تفریح و دل لگی کا سامان کرنا۔

(۷) ایک برتر ہستی کی عبادت کرنا۔

(۸) حکومت قائم کرنا اور اس کے کاروبار کو چلانا۔

یہ مشاغل گویا انسان کی بنیادی ضرورتوں کے حل ہیں۔ طرح طرح کی دستکاریاں، فنون لطیفہ موسیقی۔ مذہب۔ علم و ادب۔ تربیت جسمانی، سائنس، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ وغیرہ ہی وہ نکاس ہیں جن میں انسان کی سہ گونہ تخلیقی قوتیں (جسمانی۔ ذہنی اور روحانی) بہتی رہی ہیں۔ یہی علوم و فنون دراصل بنیادی

انسانی روایات ہیں، مدرسہ بچوں کی فوری ضرورتیں پوری کرنے اور انہیں آئندہ زندگی کے لیے تیار کرنے کے واسطے انہی بنیادی مشاغل میں سے بعض کا انتخاب کرے گا، کیوں کہ انسانی جسم، ذہن اور روح کی قوتوں کے لیے ان کے سوا اور کوئی نکاس موجود نہیں۔ انسان نے اپنے تمام مسائل کے حل انہی ذرائع سے ڈھونڈے ہیں۔ مدرسہ جن بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اپنے ذمے لیتا ہے وہ انہیں اسی قسم کی جسمانی، ذہنی اور روحانی تربیت دینا چاہتا ہے جو انہیں اپنی فطرت کے سہ گونہ مطالبوں کو پورا کرنے کے قابل بنا دے، اس مطلب کے لیے ایسے مسائل حل کرنے کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے کیوں کہ یہی وہ طریقہ ہے جس کی مدد سے انسان نے اپنے بنیادی سوالوں کے جواب ڈھونڈے، یہ غرض پوری کرنے کے لیے مدرسہ اپنی الگ دنیا قائم کرتا ہے، ہر چند کہ یہ دنیا مصنوعی ہوتی ہے۔ تاہم اسے حقیقت کا رنگ دینے کی ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے۔

مدرسہ بچوں کے مسائل حل کرنے کے لیے جو ذرائع اختیار کرتا ہے وہ مختلف مضامین کے ناموں سے پکارے جاتے ہیں، یہ مضامین گویا ایسے مشاغل کا مجموعہ ہیں جو بچوں کے مسائل حل کرنے کا ذریعہ بنیں گے، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ مضامین ایسی معلومات اور مواد کا مجموعہ نہیں ہونے چاہئیں جیسے امتحان پاس کرنے کے لیے رٹا جائے اور جو بہ جبر و اکراہ طالب علموں پر ٹھونسا جائے، بلکہ یہ ایسے مشاغل اور سرگرمیوں کا مجموعہ ہونے چاہئیں جن میں طالب علم خوشی خوشی حصہ لیں، یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ان مضامین کو خالص بچوں کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تاکہ یہ ان کے لیے پُرمعنی اور دلچسپ بن جائیں۔

مختلف مدارج

نصاب کے معقول طور پر منظم ہونے کے لیے ضروری ہے کہ نہ صرف اس کی وسعت متعین کر دی جائے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی تدریجی درجہ بندی کر دی جائے تاکہ یہ اول سے آخر تک مربوط بھی رہے اور اس کی مشکلات بھی تدریجاً بڑھیں، وسعت کے متعلق ہم اوپر کی سطروں میں بیان کر چکے ہیں، نصاب کی وسعت انسانی زندگی کی بنیادی سرگرمیوں تک محدود ہونی چاہیے اور بس، رہا درجہ بندی کا مسئلہ تو مدرسے کا نصاب عموماً تین حصوں میں بانٹ

دیا جاتا ہے (۱) ابتدائی (ب) وسطانی (ج) ثانوی ۔

ابتدائی نصاب کے متعلق یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اس میں وہ علوم اور مہارتیں شامل ہونی چاہئیں جو باقی علوم کے لیے آلہ کا درجہ رکھتی ہیں، یہ آلاتی مضامین کہلاتے ہیں، کیوں کہ ان کے بغیر دوسرے علوم کا اکتساب ممکن ہی نہیں وہ مضامین یہ ہیں ۔

(۱) مادری زبان کو پڑھنے لکھنے اور خوبی کے ساتھ بولنے کی قابلیت ۔

(۲) بنیادی اعداد اور ان دوسرے مقداری تصورات کا علم جن کے بغیر جدید زندگی کا کام کاج ممکن نہیں ۔

(۳) حفظان صحت کے موٹے موٹے عملی اسباق چوں کہ یہ مضامین آئندہ تعلیم کے لیے بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں، اس لیے ان کے ضمن میں پسند و انتخاب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ ہر ایک کو پڑھنے پڑتے ہیں، خواندگی کی تعلیم گویا ابتدائی نصاب کا لب لباب ہے، یہ وہ کم از کم تعلیمی استعداد ہے جو علم کے ہر متلاشی کو پیدا کرنی پڑتی ہے ۔ اگر کچھ اختیاری مضامین کا نصاب میں شامل کرنا ضروری بھی ہو تو انہیں نصاب کے آخری ایک دو سالوں میں شامل کیا جا سکتا ہے ۔

وسطانی درجے میں ابتدائی درجے کے بنیادی مضامین کو جاری رکھا جاتا ہے تاکہ ان میں مزید مہارت اور پختگی پیدا ہو، اس کے ساتھ بعض اور مضامین کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جو جدید زندگی کے لیے تقریباً ناگزیر ہو چکے ہیں مثلاً کوئی جدید غیر ملکی زبان اور ڈرائنگ وغیرہ ۔ اس کے ساتھ ہی بعض اختیاری مضامین بڑھا دیے جاتے ہیں ۔ مثلاً کلاسیکی زبانیں ۔

ثانوی نصاب میں انتخاب و پسند کی گنجائش بہت بڑھ جاتی ہے ۔ اب طالب علم اس قدر پختگی حاصل کر چکے ہوتے ہیں کہ اپنے مخصوص میلانوں کو کافی حد تک پہچان سکیں، ان میلانوں کی روشنی میں انھیں بعض مضامین میں سے اپنی پسند کا مضمون چننے کی اجازت ہوتی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اس منزل پر بھی بعض مضامین لازمی طور پر لینے پڑتے ہیں ۔ مثلاً ایک جدید غیر ملکی زبان جو آگے چل کر اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بننے والی ہو ۔ ملکی تاریخ و جغرافیہ تاکہ وہ اپنی شہری ذمہ داریوں

اور قومی ثقافت کی روح کو سمجھنے لگیں اور اس ثقافت کے نگہبان بن سکیں۔

کیا نصاب میں فنی یا پیشہ ورانہ تعلیم بھی شامل ہونی چاہیے؟ شاید کئی لوگ اس سوال کا جواب اثبات میں دیں، جب تک تہذیب نے ترقی نہ کی تھی اور رسمی تعلیم کا رواج نہ ہوا تھا اس زمانے میں بھی نئی پود کو پیشہ ورانہ تعلیم ضرور ملتی تھی، ہر کاریگر اور ہنرور اس بات کا خاص اہتمام کرتا تھا کہ اس کا بیٹا باپ کا پیشہ یا ہنر سیکھ لے، آج بھی ہمارے بہت سے بچے جو مدرسوں میں سرے سے داخل ہی نہیں ہوتے اپنا بچپن عموماً کسی نہ کسی پیشہ سیکھنے میں صرف کرتے ہیں، ایسی نیم وحشی قومیں جن کے ابھی رسمی تعلیم و تربیت کا کوئی وجود نہیں وہاں بھی بچوں کو آبائی پیشوں کی تربیت دی جاتی ہے لیکن مہذب قومیں اپنے بچوں کو اچھے کاریگر اور پیشہ ور ہونے کے ساتھ ہی اچھے انسان بھی دیکھنا چاہتی ہیں انہیں مدرسوں میں ایسی تعلیم دی جاتی ہے جو انہیں انسانی ذہن و فکر کی بنیادی سرگرمیوں سے باخبر کردے اور انہیں اس تجرباتی طریق کار کی تربیت دے جس کی قدر سے انسانی زندگی کے ہر شعبے میں پیش قدمی ہوئی ہے، اس تعلیم و تربیت کی غرض یہ ہے کہ یہ بچے بڑے ہو کر جب مختلف پیشوں میں داخل ہوں تو ایک تنقیدی نگاہ اور تجرباتی طریق کار ساتھ لے کر جائیں تاکہ انسانی سعی کے ان میدانوں میں ترقی اور پیش قدمی رکنے نہ پائے۔

اب یہ بات صاف ہو گئی ہوگی کہ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم سے پہلے ایک عام نوعیت کی تعلیم ضروری ہے، مدرسے کی بڑی غرض یہ عام تعلیم بہم پہونچانا ہے جو بچے کسی خاص فن یا ہنر کی طرف طبعی جھکاؤ رکھتے ہوں وہ مدرسہ کی اوپر کی جماعتوں میں اس میلان کی مناسبت سے مضامین چن سکتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مدرسہ نصاب کے ایک دو آخری سالوں میں اس قسم کی نیم فنی تعلیم کا بندوبست کردے جو آگے آنے والی فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے زمین ہموار کردے۔ لیکن مدرسہ اپنے آپ کو خالص پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے وقف نہیں کر سکتا وہ ابتدائی منزل میں خواندگی کی تعلیم دے گا جو سب کے لیے یکساں لازم ہوگی اور وسطانی اور ثانوی منزلوں میں انسان کے بنیادی مشاغل کو شامل نصاب کرے گا، ان منزلوں میں طلبا کے مخصوص رجحانوں کا اس حد تک خیال رکھا جائے گا کہ

انہیں بعض مضامین کے انتخاب کا حق ہوگا، فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے مدرسہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ اس کے لیے راستہ ہموار کر دے اور بس، وہ اس کے لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔

نصاب کے دو ستون

آج سے ایک پشت پہلے اکثر والدین بچے کو استاد کے حوالے کرتے وقت عموماً یہ کہا کرتے تھے کہ اس کا گوشت و پوست آپ کا ہے ہم صرف اس کے پنجر کے مالک ہیں، اس سے مراد یہ ہوتی تھی کہ استاد پڑھائی کے سلسلے میں بچے کو جس قدر چاہے مارے پیٹے۔ والدین کو اس پر بالکل کوئی اعتراض نہیں ہوگا وہ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ بچہ زندہ رہے اور تعلیم مکمل کر لے، ابھی ایسے استاد موجود ہیں جنہوں نے یہ زمانہ دیکھا ہے، یہ استاد عموماً بڑی حسرت کے ساتھ ان پہلے زمانوں کو یاد کیا کرتے ہیں اور موجودہ پست تعلیمی معیار کی ساری ذمہ داری اس بات پر ڈالتے ہیں کہ آج استاد کو بچوں پر وہ بے پناہ اختیارات حاصل نہیں جو پہلے ہوا کرتے تھے۔

آخر کیا وجہ ہے کہ آج سے بیس پچیس برس پہلے اساتذہ اور والدین دونوں سزا کی افادیت پر اتنا یقین رکھتے تھے، اس کی وجہ نصاب کا وہ پرانا تصور تھا جس کا ماحصل یہ ہے کہ نصاب کی جان وہ مضامین ہیں جن پر یہ مشتمل ہے، یہ مضامین انسانی عقل و تجربہ کا نچوڑ ہیں، یہ ملکی ثقافت کا خلاصہ ہیں، ان پر عبور حاصل کر لینا تعلیم کی سب سے بڑی غایت کو پورا کر لینا ہے، تدریس کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ طالب علموں کے ذہنوں میں کسی نہ کسی طرح یہ علوم ٹھونس دے۔ اگر وہ بخوشی ان کو قبول نہ کریں تو انہیں سختی اور تشدد کے ساتھ اس بات پر مجبور کرنا چاہیے، یہ درست ہے کہ کئی طالب علم اس جبر و تشدد سے بیزار ہو کر ہمیشہ کے لیے مدرسے سے بھاگ جاتے تھے۔ لیکن یہ ان کا اپنا قصور سمجھا جاتا تھا، مدرسے کی پڑھائی سب کے لیے یکساں طور پر موجود تھی، ایک ایسے دور میں جب ابھی بہت کم بچے مدرسوں کا رخ کرتے تھے، یہ نظریہ بالکل واقعی نظر آتا تھا، نسبتاً چیدہ چیدہ بچے مدرسوں میں آتے تھے، ان میں سے اکثر جبر و اکراہ کی فضا کے باوجود تعلیم حاصل کر لیتے تھے، جو ایسا نہیں کر سکتے تھے اس کی ساری ذمہ داری خود ان کے سر تھوپی جاتی تھی، مدرسہ اور اس کے طریق کار کو کسی طرح

ذمہ دار نہیں گردانا جاتا تھا۔

بیسویں صدی کا ربع اول انقلاب آفریں تعلیمی اور نفسیاتی حقائق کے انکشاف کا زمانہ ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ بالکل یہی زمانہ دنیا میں عوامی تحریکوں کے ابھرنے کا زمانہ ہے، ادھر علمی تحقیقات نے یہ بات ثابت کر دکھائی کہ ہر بچہ یگانہ استعدادیں ساتھ لے کر آتا ہے اور مختلف بچوں کی پیش قدمی کی رفتار مختلف ہوتی ہے، اُدھر عوام نے ہر جگہ یہ مطالبہ کرنا شروع کیا کہ تعلیمی سہولتوں کی اتنی فراوانی ہونی چاہیے کہ ان کے بچے خواص کے بچوں کے پہلو بہ پہلو ان سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکیں تعلیمی اور نفسیاتی انکشافات نے تعلیمی دنیا میں ترقی پسند تحریک کو جنم دیا، اس تحریک نے اول اول ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور مغربی یورپ میں سر اٹھایا، پھر رفتہ رفتہ اس نے ساری دنیا کے تعلیمی فکر کو اپنی گرفت میں لے لیا، اس تحریک کا نعرہ یہ تھا کہ نصاب کا اہم مسئلہ یہ نہیں کہ اس میں کون کون سے مضامین شامل ہوں بلکہ اس کا اہم مسئلہ یہ ہے کہ تدریس کا کام کن طریقوں پر ہو۔ تعلیم کا بڑا مقصد یہ ہے کہ بچوں میں سوچ بچار کی عادت پیدا کرے، بچے قدرتی طور پر انہی باتوں کے متعلق سوچ بچار کریں گے جو ان کے نقطۂ نگاہ سے اہم ہوں، نصاب میں خواہ ہم کیسے ہی کارآمد اور پُرحکمت مضامین جمع کر دیں، اگر بچے ان میں دلچسپی نہیں لیتے تو وہ تعلیم کے نقطۂ نگاہ سے بیکار ہیں۔ تعلیمی طور پر اہم بات یہ ہے کہ ہر بچے کی انفرادی صلاحیتوں اور اس کے فطری تقاضوں کا خیال رکھا جائے، نصاب کے مضامین اور مشاغل اتنے اہم نہیں جتنا ان کے پیش کرنے کا طریقہ، اصل چیز نفس مضمون نہیں بلکہ طریق تدریس ہے، اول اول پرائیویٹ مدرسوں نے اپنے ہاں اس قسم کے ترقی پسند نصاب رائج کیے، پھر سب مدرسے ان کی پیروی پر مجبور ہو گئے۔

ہمارے ملک میں اس قسم کی ترقی پسند تعلیم کے کوئی قابل ذکر تجربے نہیں کیے گئے۔ یہاں روائتی نصاب کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اس کے ڈھیلا ہونے کے لیے بہت وقت چاہیے تھا، پھر بھی نصاب کے نئے نظریے نے یہاں بھی نصاب سازی کو کچھ نہ کچھ متاثر ضرور کیا لیکن امریکہ میں بالخصوص اور مغربی یورپ میں بالعموم دو عالمی جنگوں کے درمیانی وقفہ میں ترقی پسند

تحریک نے خوب پرورش پائی، اس تحریک کا سب سے بڑا نعرہ یہ تھا کہ "ہم مضامین نہیں پڑھاتے، بچوں کو پڑھاتے ہیں" اس سے مراد یہ ہے کہ نصاب کے مندرجات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اصل چیز وہ سرگرمی اور ولولہ ہے جس کے ساتھ بچے تعلیمی کام میں حصہ لیتے ہیں۔ تعلیمی نقطۂ نگاہ سے یہ بات چنداں اہم نہیں کہ آیا ہم تاریخ پڑھائیں یا جغرافیہ یا سائنس اور یا کوئی اور مضمون۔ اصل اہمیت طریق تدریس کو حاصل ہے۔ اس انتہائی ترقی پسندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ نصاب کے مندرجات کے نظم و ترتیب کا سرے سے خاتمہ ہو گیا، ترقی پسند مدرسے ایسے مشاغل اور سرگرمیوں کے مرکز بن گئے جن کا انحصار طالب علموں کی پسند پر تھا۔ بچوں کی دل چسپی اور پسند نصاب کی موزونیت کا واحد معیار بن گئی۔

دوسری عالمگیر جنگ نے عوامی توجہ کو ملکی دفاع کے مسائل پر مرکوز کیے رکھا، جنگ کے بعد ترقی پسند تعلیم کی انتہا پسندی موضوع بحث بننے لگی۔ سوجھ بوجھ رکھنے والے عام شہریوں اور بعض تعلیمی مفکروں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ نصاب اپنا توازن کھو چکا ہے، انہوں نے اس نکتہ پر زور دیا کہ ثقافت کی بقا اور ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بنیادی اجزا ایک سوچے سمجھے منصوبے کے ماتحت نئی پود کی ذہنی ساخت میں پیوست کیے جائیں۔ یہ سوچا سمجھا منصوبہ نصاب کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی، قومی زندگی اور مخصوص قومی روح کی صحت مند نشو و نما کی پہلی شرط یہ ہے کہ قوم کا ثقافتی ترکہ من و عن نئی پود کے حوالے کیا جائے، یہ مقصد نصاب کے مندرجات کے ذریعہ ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تعلیمی نقطۂ نگاہ سے نصابی مندرجات از حد اہم ہیں، ان کی اہمیت کو نظر انداز کر دینا ثقافتی زندگی کی بنیادوں سے بے پرواہ ہو جانا ہے، اس کا مطلب تعلیم کو بے مقصد بنا دینا ہے، ایک ایسے دور میں جب متخاصم نظریہ ہائے حیات زندگی اور موت کی کشاکش میں مصروف ہوں تعلیم کی یہ بے مقصدی تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔

تاہم ترقی پسند تعلیم کے نکتہ چین بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ اس تحریک نے ایک اہم تعلیمی خدمت انجام دی ہے، اس نے بچوں کے فطری تقاضوں اور ان کی جداگانہ استعدادوں پر زور دے کر ان بے کیف اور روح کش طور طریقوں کا خاتمہ کر دیا ہے جو تدریس کا لازمہ بن چکے تھے، چناں چہ ترقی پسندی کا کڑے سے کڑا نکتہ چین بھی یہ نہیں چاہتا کہ روایتی نصاب کو پھر سے رواج دے دیا جائے، اس کا

مطالبہ صرف یہ ہے کہ ترقی پسند نصاب کے عدم توازن کو ختم کیا جائے۔ اس وقت یہ نصاب صرف ایک پاؤں پر کھڑا ہے، اس کا اکیلا سہارا طریقہ ہائے تدریس ہیں۔ اسے اپنے دونوں پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے یعنی اسے مندرجات نصاب اور طریقہ ہائے تدریس دونوں کو ایک سی اہمیت دینی چاہیے یہ دونوں نصاب کے ستون ہیں، ان میں سے کسی ایک کے نہ ہونے سے نصاب ایک صحت مند توازن حاصل نہیں کر سکتا، اس کے استحکام اور پیش قدمی کے لیے ضروری ہے کہ یہ ان دونوں ستونوں پر پاؤں جما کر کھڑا ہو۔

پہلے کہا جا چکا ہے کہ ہمارے ملک میں ترقی پسند نصاب کا تجربہ نہیں کیا گیا۔ ترقی پسند تحریک کی عمر ابھی بہت زیادہ نہیں، اس کا آغاز پہلی عالم گیر جنگ کے بعد ہوا۔ اور اب اس کے خلاف ردعمل شروع ہو چکا ہے، ہمارے مدرسوں میں جو نصاب رائج ہے وہ یورپ کے اس روائتی نصاب کی ایک شاخ ہے جو ذہنی ضبط کے نظریے پر مبنی تھا، اس نصاب کے مختلف مندرجات صرف اس غرض سے چنے گئے تھے کہ ان سے مختلف قسموں کا ذہنی ضبط حاصل ہو، اس نصاب کا سنگ بنیاد یہ عقیدہ تھا کہ مختلف مضامین مختلف ذہنی استعدادیں پیدا کرنے کے لیے جادو اثر ہیں۔ یہ نظریہ اب عرصے سے بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے لیکن اس کی باقیات اب تک ہمارے نصاب میں موجود ہیں۔ یورپی نصاب کے آنے سے پہلے ہمارے مکتبوں کا نصاب ساری توجہ ثقافتی مندرجات پر مرکوز رکھتا تھا۔ گلستان بوستان اور نظامی اور جامی کی کتابوں کو صرف اس لیے داخل نصاب کیا جاتا تھا کہ وہ ہماری ثقافتی اقدار کا بڑا خزانہ خیال کی جاتی تھیں۔ زمانے کی کروٹ نے ہمارے اس ثقافتی نصاب کو ختم کیا۔ یورپ کا روائتی نصاب مدتوں سے لایعنی قرار دیا جا چکا ہے۔ ترقی پسند نصاب کی کمی اب اس کے سرگرم حامیوں کو بھی نظر آنے لگی ہے۔ ہم ان دونوں نئے نصاب کی تشکیل میں لگے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ثقافتی اقدار اور معقول طریقہ ہائے تدریس کے امتزاج سے ایک ایسا نصاب مرتب کریں جو مخصوص قومی ضرورتوں اور نفسیاتی حقائق دونوں کا ساتھ دے۔

نصاب ایک متحرک شے ہے اوپر کی بحث سے یہ قیاس نہیں کر لینا چاہیے کہ ثقافتی ضرورتوں اور

نفسیاتی حقائق کو سامنے رکھ کر کوئی ایسا نصاب وضع کیا جا سکتا ہے جو ہمیشہ کے لیے کارآمد ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نصاب جن اجزا سے مل کر تیار ہوگا ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو ترقی پذیر اور متحرک ہیں ہم دیکھ چکے ہیں کہ طریق تدریس اور ثقافتی مواد نصاب کے دو اہم ستون ہیں۔ ان میں سے اول الذکر کی بنیاد نفسیاتی حقائق پر ہے، اگرچہ پچھلی نصف صدی میں بچوں کے جبلی مطالبوں اور ان کی نشوونما کے اصولوں کے متعلق ہماری معلومات میں انقلاب آفرین اضافہ ہوا ہے، پھر بھی یہ کہنا خود فریبی ہوگا کہ اس میدان میں ہمارا موجودہ علم حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے، تعلیمی نفسیات ابھی نسبتاً ایک کم عمر سائنس ہے، اس میں آئے دن نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں، یہ دریافتیں اور معاشرتی علوم کے انکشافات لامحالہ طریقہ ہائے تدریس پر نظر ثانی کی ضرورت پیدا کرتے رہیں گے اور اس طرح نصاب میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت پیدا ہوتی رہے گی۔

نصاب کا دوسرا بڑا ستون اس کے مندرجات ہیں، پیچھے یہ شرح گذر چکی ہے کہ یہ مندرجات انسانی زندگی کے بنیادی مشاغل کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان کو ہم نے دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا تھا۔

(ا) وہ مشاغل جو انسان کو مادی اور طبعی ماحول پر قابو پانے میں مدد دیتے ہیں۔

(ب) وہ مشاغل جو انسان کی ذہنی اور روحانی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔

ان دونوں میں سے ثانی الذکر کا تعلق ان معتقدات سے ہے جو نظام کائنات میں انسان کا درجہ معین کرتے ہیں۔ یہ وہ بنیادی اقدار ہیں جن پر ثقافتی زندگی کی تعمیر ہوتی ہے، یہ زندگی کے تندوتیز دھارے کی طوفانی سطح سے بہت نیچے بہنے والے سوتے ہیں، جو نہ کبھی بند ہوتے ہیں اور نہ وقتی طغیانیوں سے متاثر ہوتے ہیں، یہ بنیادی ثقافتی اقدار نصاب کے مستقل اور کبھی نہ بدلنے والے عناصر ہیں، نصاب کی تعمیر میں یہ خشت اول کا درجہ رکھتے ہیں، یہ قوم کا روحانی ترکہ ہیں قوم کی دوامی زندگی کا مدار اسی روحانی ترکہ کی بقا پر ہے، اس لیے قومیں اس کے تحفظ اور بقا کے معاملہ میں غفلت نہیں برت سکتیں، وہ اس بات کا پورا یقین کرنا چاہتی ہیں کہ جن عقاید نے ان کی روحانی زندگی کو تروتازگی بخشی تھی، وہی عقائد پشت در پشت ان کی اولادوں کی روحانی زندگی کا سہارا بنیں۔

ان بنیادی یقینوں کے دوام ہی میں قوموں کا دوام ہے، ان کے ہٹ جانے سے قومیں مٹ جاتی ہیں۔ چونکہ افراد کی طرح قوموں کو بھی زندگی بہت عزیز ہے، اس لئے وہ تعلیم کی وساطت سے اپنے بنیادی یقینوں کو نئی پود کے رگ و ریشہ میں پیوست کر دیتی ہیں، یہ بنیادی ثقافتی قدریں نصاب میں ہمیشہ جوں کی توں چلی آتی جائیں۔

لیکن انسانی زندگی کے بنیادی مشاغل میں سے بہت سے مشاغل ایسے ہیں جو انسان کو گرد و پیش کے ماحول پر قدرت حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں، جب سے انسان نے زمین پر قدم رکھا ہے وہ لگاتار ماحول کے ساتھ جنگ میں لگا ہے۔ ماحول پر اس کی قدرت ہمیشہ بڑھتی ہی گئی ہے اور جب تک دنیا باقی ہے بڑھتی ہی رہے گی، اس پیش قدمی کا رک جانا قوم کی مادی زندگی کا ایک کھلا ہوا انحطاط ہوگا تاریخ میں جن قوموں نے مادی ماحول پر قابو پانے کی دوڑ میں کسی ایک منزل کو آخری منزل کی غلطی کی انہوں نے نکبت اور زیر دستی کے دروازے اپنے اوپر کھول لیے۔ یہ تاریخ کے اس سبق کا صدقہ ہے کہ آج دنیا کی کوئی قوم بھی مادی ترقی کے معاملہ میں پیچھے رہنا پسند نہیں کرتی، چونکہ طبعی ماحول پر قدرت بجلی کی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے، اس لیے ان بنیادی مشاغل کے متعلق جو نصاب میں انسانی زندگی کے اس پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہمیشہ ہیجان میں ہوتی رہنی چاہیے۔

غرض نصاب کے مختلف عناصر میں سے ہمیں صرف ایک عنصر ایسا ملا ہے جو مستقل اور نہ بدلنے والا ہے، اس کے علاوہ باقی تمام عناصر تغیر پذیر ہیں۔ بعض کی تغیر پذیری کی رفتار ہوش ربا حد تک تیز ہے، ان باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ بالکل واضح ہے کہ نصاب کی لگاتار ہیجان میں ہوتی رہنی چاہیے تاکہ اس کے دوامی عناصر اپنی جگہ باقی رہیں اور تغیر پذیر عناصر جدید زندگی کی برق رفتاری کے ساتھ ہم قدم رہیں۔ نصاب کوئی جامد شے نہیں۔ بلکہ ایک حد درجہ متحرک چیز ہے ؎

سمعی بصری معاونات

یا

تدریس بذریعہ تعلیمی سیر

قاضی محمد ظریف

علم کا حصول اور پیدائش آدم ایک دوسرے کے اتنے قریب ہیں کہ حضرت آدم کو ابتدا سے ہی اشیا کے اسماء خواص کے علم سے نوازا گیا (قرآنِ حکیم ۲ : ۲۱) اللہ تعالےٰ کی طرف سے انسان کو اس علم کا عطا فرمانا گویا تمام اشیاء کو اس کے تصرف میں دینے کا پیش خیمہ تھا ۔ زمانہ کی ترقی کے ساتھ علم کی حدود بھی وسیع ہوگئیں اور انسان ابتدائی زمانہ کی محدود واقفیت سے بڑھ کر تجربات و علوم کے ایک بحرِ ناپیدا کنار میں آگیا ، ابتدائی زمانۂ تہذیب میں جہاں انسان کو صرف چند ایک ضروریاتِ زندگی کے ناموں اور خواص کے جاننے کی ضرورت تھی وہاں موجودہ دور کا انسان ایک ایسے عظیم انقلاب سے دوچار ہے جس میں اس کا سامنا بجلی گیس ۔ ایٹمی قوت ، راڈار اور جیٹ طیارون جیسی اشیا سے ہے ۔ موجودہ تیز رفتار دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان سائنس کی نت نئی ایجادات کے علم کے ساتھ ساتھ انسانی تمدن کی حیرت انگیز ترقی اور اس کی تاریخ ، سیاست اور تجارت معاشیات اور فلسفہ وغیرہ سے بھی اپنے آپ کو خبردار رکھے ۔

اس تبدیلی نے ہماری تعلیم اُس کے مقاصد اور طریقہ ہائے تعلیم پر گہرا اثر ڈالا ہے ۔ اساتذہ اب بچے کو محض درسی کتاب یاد کرا کے اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے ۔ جدید مقاصد تعلیم میں بچے کی مکمل شخصیت کی نشو و نما کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ کتابوں کے علم کے ساتھ ساتھ بچے کی اخلاقی و جسمانی ترقی کو مد نظر رکھنا ضروری ہے ، استاد نے ہر بچے کو وہ مواقع بہم پہنچانے ہیں جن سے اس کی شخصیت کی ایسی تکمیل ہو سکے جو اس کے مکمل انسان بننے میں مدد ہو اور جس سوسائٹی یا جماعت کا وہ فرد ہے

اسے بہتر بنانے کا ذریعہ بنے۔ بچے کی شخصیت کو آزادی سے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مدرس ضروریات زمانہ کے مطابق بڑھتے ہوئے نصاب کو ایسے سانچے میں ڈھال کر پیش کرے کہ بچہ حصول تعلیم کے لیے بالذات ترغیب اور شوق محسوس کرے اور نئی معلومات کو کم وقت میں صحیح طور اخذ کرکے اپنے علم میں اضافہ کرسکے۔

اس مقصد کے حصول میں سمعی بصری معاونات تعلیم کو ایک اہم مقام حاصل ہے، ان کے استعمال سے ہم بچوں میں نسبتاً تھوڑے وقت میں بہتر اور صحیح قسم کا تخیل ایسے طریق سے پیدا کرتے ہیں جو تدریس کو دلچسپ بھی بناتا ہے اور بچے کی مختلف قوتوں کو بروئے کار لانے کا موقع بھی بہم پہونچاتا ہے سب سے زیادہ مستعمل ذریعہ تعلیم جو استاد کے خیالات کو طلبا تک پہونچانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے زبان سے بولے ہوئے کلمات ہیں لیکن ابتدائی مدارس کے بچوں کے لیے صرف اس ایک ذریعہ کا استعمال غلط اور غیر مفید نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔ زبان کے توسط سے ادا کردہ الفاظ کو ان کا اصل مقام تب حاصل ہو سکتا ہے جب زبان میں الفاظ کی اتنی وسعت ہو کہ ہم موضوع زیر بحث کی ایسی مکمل تشریح کرسکیں کہ کوئی پہلو باقی نہ رہے اور نہ کسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وقت کی فراوانی ہو اور ہمارا مخاطب گروہ عقلی و دماغی طور پر وہ بلندی حاصل کر چکا ہو جو صرف الفاظ کے توسط سے مکمل مفہوم کو پانے کے لیے لازم ہے۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ کسی بچے کو جس نے آم نہ دیکھا ہو اس کی مفصل زبانی تشریح اور لفظی دہ سمجھ نہ دے سکے گی جو ایک اصلی آم کے ذریعہ وہ حاصل کرے گا۔ وہ آم کو دیکھ کر، سونگھ اور چکھ کر جو تصور قائم کرے گا وہ یقیناً کسی بڑے سے بڑے قادرالکلام مقرر کے الفاظ سے زیادہ وسیع اور معنی خیز ہوگا۔ البتہ آئندہ کے لیے آم کی تصویر بلکہ آم کے تلفظ میں ہی سابقہ جملہ معنویت سمٹ کر آجائے گی اور مدرس کا کام آسان ہو جائے گا۔

اسی لیے وہ تعلیم زیادہ مفید خیال کی جاتی ہے جس کی بنیاد ذاتی تجربات پر ہو یا جو ایسے معاونات کے ذریعہ دی جائے جس میں براہ راست یا بالارادہ تجربہ کو فوقیت ہو۔ انگریز فلسفی و ماہر تعلیم ہربرٹ سپنسر نے

اسی لیے کہا ہے کہ بہترین طور پر تعلیم یافتہ وہ شخص ہے جس نے بحرِ حیات میں خوب غوطہ زنی کی ہو، اور جس نے زندگی کو زیادہ سے زیادہ مقامات پر چھوا ہو۔ علامہ اقبال نے بھی انسانی خودی کی تکمیل کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ انسان زندگی کی جدوجہد میں پورے طور پر شریک ہو کر طوفان سے دوچار ہو ؎

میاسا بہ مہ بر ساحل کہ آنجا　　نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز　　حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

ایڈورڈ ڈیل جو امریکہ میں سمعی بصری معاونات پرستند شخصیت تسلیم کیے جاتے ہیں تعلیمی معاونات کی مندرجہ ذیل دس اقسام اپنی افادیت کی ترتیب سے یوں بیان کرتے ہیں۔

(۱) براہ راست بالارادہ تجربات DIRECT PURPOSEFUL EXPERIENCE

دریا کو سمجھنے کے لیے دریا پر جانا۔ کھانا تیار کرنا۔ پکنک کو جانا۔

(۲) خود ساختہ تجربات یا نمونے۔ CONTRIVED EXPERIENCES.

ان میں (الف) ماڈل (ب) ماک اَپ وغیرہ شامل ہیں۔ یہ نمونے حقیقی چیز کی تسلیم شدہ نقل ہوتی ہے جو لکڑی، پلاسٹک، دھات، کپڑے یا گتے وغیرہ سے تیار کیے جاتے ہیں۔

(۳) ڈرامائی حصہ گیری DRAMATIC PARTICIPATION.

ڈرامہ، کٹ پتلیاں، گونگوں وغیرہ کی نقل

(۴) توضیحات DEMONSTRATIONS.

نمونے و سائنس کے تجربات وغیرہ

(۵) تعلیمی سیر FIELD. TRIPS

یہ مدرسہ کی عمارت کے اندر بھی ہو سکتی ہے اور باہر بھی

(۶) تعلیمی نمائش EXHIBITS.

یہ تعلیمی سیر سے نسبتاً زیادہ مصنوعی چیز ہے۔

(۷) متحرک تصاویر MOTION PICTURES.

(۸) ریڈیو، صدابندی اور ساکن تصاویر۔ چارٹ، نقشہ جات وغیرہ

(۹) بصری علامات VISUAL SYMBOLS.

(۱۰) لفظی علامات VERBAL SYMBOLS.

لفظی و بصری علامات کی اصل اشیا کی شکل سے کوئی شباہت نہیں ہوتی۔ لفظ بلی یا کتا نہ تو ان جانوروں کی طرح دکھائی دیتا ہے نہ ایسا سنائی ہی دیتا ہے۔ یہ علامات خیالات کے لیے بھی استعمال ہوتی ہیں مثلاً الفاظ ذیل: انصاف، حق پرستی، جمہوریت وغیرہ۔

اس لحاظ سے بصری و لفظی علامات یعنی لکھے ہوئے یا زبان سے ادا کیے ہوئے الفاظ و کلمات سب سے مشکل خیال کیے جاتے ہیں، کیوں کہ ان میں حقیقی اشیا کی جگہ محض علامات استعمال ہوتی ہیں۔

تعلیمی سیر کو اس تمام سلسلۂ تدریس میں درمیانی درجہ حاصل ہے اور اس کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ ایک ایسا امدادی ذریعہ تعلیم ہے جس میں ایک خاص طریق پر کسی سیر یا سفر کو تعلیمی نقطۂ نظر کے ماتحت سرانجام دیا گیا ہو، یہ ضروری نہیں کہ تعلیمی سیر طویل ہو۔ کمرۂ جماعت کے باہر صحن مدرسہ کے اندر ایک درخت کا مشاہدہ یا ایک دیوار کی تعمیر کا دیکھنا تعلیمی لحاظ سے ایسا ہی مفید ہے جتنا کہ کوئی اور زیادہ وقت لینے والا مطالعہ۔ البتہ ہمیں اس قسم کی سیر سے کوئی سروکار نہیں جس کا براہ راست کوئی تعلیمی مقصد نہ ہو تعلیمی سیر کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ طلبا میں براہِ راست معلومات حاصل کرنے کی ایک قدرتی خواہش اور آرزو ہوتی ہے جس کا پورا کرنا ان کی تخلیقی قوتوں کی ترقی کے لیے ضروری ہوتا ہے، ایسی سیر میں طلبا کو ایک سکیم اور پلان کے مطابق ایسے مقامات پر بھیجا جاتا ہے جہاں مطلوبہ معلومات اپنے قدرتی ماحول میں مہیا ہوتی ہیں۔ استاد بہت سی چیزیں باہر سے اپنے مدرسہ یا کمرۂ جماعت میں لا کر طلبا کو دکھا سکتا ہے، لیکن بہت سی ایسی بھی ہیں جو اپنی جسامت، نوعیت یا کسی اور وجہ سے وہاں لانی ناممکن ہیں۔ ان کے براہِ راست مطالعہ کے لیے ضروری ہے کہ استاد بچوں کو ان کے پاس لے جائے۔

اس قسم کے جملہ معاونات چھوٹے بچوں کے لیے زیادہ مفید ہوتے ہیں، کیوں کہ عمر کے لحاظ سے

ان کی زبان اور تجربہ کی وسعت اتنی محدود ہوتی ہے کہ استاد کو الفاظ کا استعمال کم کر کے دوسرے معاونات کے ذریعے اس کی تعلیم و تجربہ میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً ڈاک خانے یا چڑیا گھر پر مضمون لکھنے کے بجے اگر بچے خود وہاں جا کر سب کچھ دیکھ سکیں تو وہ زبانی لیکچر سے زیادہ موثر اور دیرپا ثابت ہوگا۔

بہت سے امدادی طریقوں کی مانند تعلیمی سیر بھی ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہیں تدریس میں اس کا استعمال قدیم زمانہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ لیکن غالباً اسے سب سے زیادہ فروغ پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنی کی پبلک میں ہوا۔ ۱۹۳۳ء میں جب ہٹلر کو اقتدار حاصل ہوا تو اس نے ایک جماعت ہٹلر یوتھ کے نام سے قائم کی اور اس کے پروگرام میں سیر اور TRIPS کو اہم درجہ حاصل ہوا۔ نوبت آخر کار یہاں تک آئی کہ دنوں سے بڑھ کر ہفتوں اور مہینوں کے پروگرام تیار ہونے لگے اور بعض اوقات تو پورا سیزن ہی اسی کام کے لیے وقف ہو گیا۔ اسی طرح اپنے گرد و پیش سے بڑھتے بڑھتے حدود ملک سے باہر تک بھی دائرہ وسیع ہو گیا۔ ہٹلر کے پروگرام میں سیر کا اہم جزو جسمانی صحت اور مادر وطن کی خدمت تھا۔ لیکن انگلستان میں اسے تدریس میں بطور ایک معاون کے استعمال کیا گیا اور حب الوطنی کے جرمن مدعا کی جگہ تعلیمی ضروریات کو حاصل ہوئی۔ امریکہ نے بھی ان ممالک سے اثر قبول کیا اور رفتہ رفتہ اس ملک میں بھی تعلیمی سیر کو نمایاں جگہ حاصل ہو گئی ہے۔

تعلیمی سیر کو کامیاب بنانے کے لیے چار چیزوں کی طرف توجہ ضروری ہے:

(۱) سیر کے مقاصد　　(۳) اصل سیر اور
(۲) اس کی تیاری اور پروگرام　　(۴) نظر ثانی

مقاصد

سیر ایک قسم کا شغل ہے لیکن تعلیمی سیر جہاں تفریحی ہوتی ہے وہاں اس کے خاص مقاصد بھی ہوتے ہیں، یہ مقاصد بہت سے ہو سکتے ہیں اور ہم ان میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنا پروگرام تیار کر سکتے ہیں، چند اہم مقصد یہ ہیں:

(۱) طلبا میں نئی معلومات فراہم کرنے کا شوق پیدا کرنا۔

(۲) اشیا، واقعات اور ماحول کے ذاتی مشاہدہ کے ذریعے نیچر سٹڈی۔ زراعت۔ تاریخ

سائنس جغرافیہ وغیرہ علوم کے ان حصوں کا براہ راست علم حاصل کرنا جو کمرۂ جماعت میں ممکن نہیں
(۳) درسی کتب میں دی ہوئی معلومات میں اداد یا اضافہ کا ذریعہ بنانا مثال کے طور پر جہانگیر کے مقبرہ کے متعلق درسی کتاب میں سبق کو مقبرہ کی اصل سیر سے مکمل کرنا۔
(۴) نئی معلومات کا استعمال اور ان کے ذریعہ اپنے ماحول میں ترمیم کی کوشش
(۵) بچوں کے نقطۂ نظر میں وسعت پیدا کرنے کا ذریعہ بنانا ان سے نظریۂ زندگی میں خوش گوار تبدیلی پیدا ہوتی ہے، طلبا کو آپس میں مل جل کر کام کرنے کی عادت پڑتی ہے، دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور سب سے زیادہ اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے کے مواقع ملتے ہیں۔ انسان کو سوچ بچار اور تفکر کے لیے تحریک کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن جماعت یا سوسائٹی ایک ایسا ذریعہ ہے جو کسی شخص کے کردار کو جلا دے سکتا ہے۔
(۶) سب سے آخری لیکن اہم پہلو یہ ہے کہ نئی معلومات کی فراہمی کی آرزو سے طلبا میں وہ نظر پیدا کی جائے جو کامیاب زندگی کا اہم جزو ہے۔ ہم اپنے گرد و پیش کو روزانہ دیکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بہت سی چیزوں کو نہیں دیکھتے، انسان کو انسانیت کے مقام پر پہونچانے کے لیے غور و فکر کے ساتھ نظر و تدبر بھی ضروری ہیں۔ اسی لیے تخلیق ارض و سما، موسموں کا تغیر و تبدل، دن اور رات کی تبدیلی، نباتات اور جمادات کے مظاہر اور نظام فلکی کا قیام غرضیکہ ہر چیز میں اللہ تعالےٰ نے انسان کو غور و فکر کا حکم دیا اور ایسے انسانوں کو جو آنکھوں سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے حیوانوں سے بدتر قرار دیا کیوں وہ ایسے لوگ ہیں جو غفلت میں ڈوب گئے ہیں۔ (قرآن الحکیم ۷/۱۷۹، ۲۲/۴۶)

سیر کی تیاری اور پروگرام سیر کی تیاری میں ان تمام تفاصیل پر غور کیا جائے جو سیر میں پیش آنی ہوں۔ اصل پروگرام سے کافی عرصہ پہلے یا اگر ممکن ہو تو شروع سال میں ہی پورے سال کی منصوبہ بندی کر لی جائے، یہ کام تعلیمی کمیٹیوں کے توسط سے سٹاف میٹنگ میں زیر بحث لایا جائے۔ استاد اپنے تعلیمی نصاب اور ضروریات کے مطابق فہرست تیار کرلے، مثال کے طور پر اگر

چھٹی جماعت کے اردو کورس میں عجائب گھر کا حال درج ہو تو لاہور یا گردونواح کے ورنیکلر ٹیچر کے لیے یہ بالکل موزوں ہوگا کہ وہ سال کے اس وقت جب اس نے سبق پڑھانا ہے تعلیمی سیر کا منصوبہ بھی اپنی سکیم میں شامل کرے۔ دیہاتی علاقوں میں قدرتی مناظر وغیرہ کی قسم کے پروگرام کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگی۔

پہلے اگر سیر کے لیے کسی ایسے مقام پر جانا ہے جہاں محافظ یا مہتمم متعلقہ سے اجازت حاصل کرنی ضروری ہے تو وہ بھی لے لی جائے، عدالتی کارروائی دیکھنے کے لیے مجسٹریٹ کی اجازت ضروری ہوگی شاہدرہ میں کپڑے کے کارخانے کے لیے وہاں کے منیجر کو لکھنا ہوگا، ہر حالت میں ان کے ساتھ تاریخ اور وقت کا تعین کرنا ضروری ہے متعلقین سے یہ بھی استدعا کی جائے کہ وہ بچوں کو معلومات بہم پہنچانے کے لیے ایک رہنما مہیا کریں۔

اس قسم کے اجازت نامے اور خط و کتابت فائل میں استاد کے پاس ہونے چاہئیں تاکہ ضرورت کے وقت پیش کیے جا سکیں۔ اگرچہ خط و کتابت کے کام کی ذمہ داری استاد کی ہوگی لیکن طلبا کو بھی اس میں شامل کر لینا چاہیے، ان سے ایسے اجازت ناموں کے حصول کے لیے خطوط لکھوانے کی مشق کرائی جائے۔ اور جہاں ممکن ہو ان کی طرف سے ہی استدعا کی جائے۔

طالب علموں کے والدین کو آگاہ کرنا اور ان کی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ انہیں اندازاً خرچ کی پوری تفصیل پہلے ہی بھیج دی جائے۔

جانے سے قبل سیر کے مقصد کے مطابق طلبا کو ضروری معلومات بہم پہونچائی جائیں، استاد پہلے خود متعلقہ واقفیت حاصل کرے اور بچوں کی عمر اور ضرورت کے مطابق انہیں ایسے امور سے واقف کرائے جن سے ان کا شوق زیادہ ہو۔ اس کے لیے ایک رضا نامہ تیار کر کے بچوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح طلبا میں مشاہدے اور معلومات حاصل کرنے کی عادت پڑے گی اور سیر میں زندگی پیدا ہوگی۔

اس قسم کی تمام تفاصیل پہلے طے ہوں گی کہ کتنے طالب علم ہوں کتنے گروہ بنائے جائیں۔ ہر گروہ کا لیڈر کون ہو، کون سا راستہ اختیار کیا جائے۔ سفر کے لیے سواری کا کیا انتظام ہو، اور

کھانے پینے کا کیا بندوبست کیا جائے۔ کیمرہ، دوربین۔ برتن، دری، پنسل۔ نوٹ بک، کاغذ وغیرہ کیا کیا چیزیں ہمراہ ہوں گی اور کب روانگی ہوگی، طلبا کو ان کے متعلق قبل از وقت آگاہ کرنا ضروری ہے۔

پروگرام ایسا بنایا جائے کہ دلچسپی متواتر قائم رہے، اس کی نوعیت اس طرح بدلتی رہے کہ کبھی چلنے پھرنے کا کام ہو تو کبھی بیٹھنے کا۔ مختصر یہ کہ کوئی امر محض اتفاق یا سہولت پر نہ چھوڑا جائے۔

اصل سیر سیر کے دوران میں مشاہدہ کے ساتھ ساتھ استاد مفید معلومات بہم پہونچائے اور طلبہ کی توجہ ان چیزوں کی طرف خاص طور پر منعطف کرائے جو عموماً ان کی نگاہ سے بچ نکلنے والی ہوں۔ استاد یہ بات کبھی نہ کہے کہ فلاں چیز غور سے دیکھ لو میں مدرسہ میں جا کر اس کے متعلق دریافت کروں گا یا امتحان میں سوال دوں گا۔ اس طرح بچے اسے طوطے کی طرح رٹنے پر مجبور رہوں گے۔ اور ہم اسی دنیا میں پھنس جائیں گے جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کمرۂ جماعت سے باہر آئے تھے۔ سیر کی بہت سی خوشی اور اصل افادیت ضائع ہو جائے گی۔

خطرے والے مقامات پر طلبہ کی حفاظت کا انتظام، وقت کی پابندی اور طے شدہ پروگرام کے مطابق ہر پہلو کی تکمیل اشد ضروری ہے۔ دورانِ سیر میں استاد ان امور کا خاص خیال رکھے:

بچوں میں تجسس اور مشاہدہ کی قوت کا بیدار کرنا، آپس میں مل کر کام کرنا، شکوک کا سوالوں کے ذریعہ رفع کرنا اور بحث میں حصہ لینا۔ نمونے، پوسٹر، پمفلٹ اور اشتہار وغیرہ حاصل کرنا، اپنے پاس یادداشت رکھنا۔ خاکے بنانا، ڈرائنگ کرنا یا تصویریں لینا وغیرہ۔

نظرِ ثانی نظرِ ثانی تمام پروگرام کا اہم حصہ ہے۔ سیر ختم ہونے کے فوراً بعد واپس آنے سے قبل مختلف ٹولیاں اپنے مشاہدات کو بیان کریں، تاکہ معلومات دیرپا ہو جائیں اور غلطیاں و شکوک دور ہو جائیں۔

اسکول میں آنے پر طلبا کو اپنے مشاہدات لکھنے کو کہا جائے خواہ وہ اپنی کاپی میں اپنے ذاتی استعمال کے لیے لکھیں خواہ مدرسہ کے نوٹس بورڈ یا اپنے اسکول کے رسالہ کے لیے، ہر حالت میں انھیں اس میں حصہ لینا چاہیئے، یہ کام اس طرح پر بھی ہو سکتا ہے کہ مشاہدات کے مخصوص حصے طلبا میں

لکھنے کے لیے تقسیم کر دیے جائیں، ان کی جو رپورٹیں آئیں وہ ایک فائل میں جمع کر لی جائیں، اس فائل میں تصاویر، سکیچ، ڈرائنگ اور خاکے وغیرہ بھی طلبا سے حاصل کر کے لگائے جائیں، بچے جو شیا یا نمونے باہر سے لائے ہیں وہ مدرسہ کے عجائب گھر میں رکھے جائیں، ہر حالت میں بچوں کی علیم کا صحیح تخلیقی پہلو نمایاں کیا جائے۔

واپسی پر اُن تمام اصحاب کا جنہوں نے اس سیر کو کامیاب بنانے میں مدرس کی امداد کی شکریہ ے خطوط لکھنے ضروری ہیں، یہ کام بچوں سے کرانا چاہیے۔

استاد کا کام یہاں ہی ختم نہیں ہو جاتا اُسے اس سیر کو اپنے نصاب میں سمونے کے لیے ابھی اور رلیق کار اختیار کرنے ضروری ہیں، اگر اس کے متعلق کوئی چارٹ، ماڈل، فلم پارہ یا فلم جیسا ہو سکے تو ہ دکھائے جائیں، کتابوں اور رسالوں سے تصاویر دکھائی جائیں اور آسان مضمون سنائے جائیں، لائبریری ب اس کی متعلقہ کتابوں کی طرف توجہ دلائی جائے اور بچوں کی رہنمائی کی جائے، غرضیکہ ہر طریق سے س سبق کو مختلف معاونات کے ذریعہ بچے کے دماغ میں مستقل طور پر پائندہ کر دیا جائے اور آئندہ ے لیے شوق، جستجو، مشاہدہ، علمی تحقیق اور مل جل کر کام کرنے کی عادات کی ایسی ٹھوس داغ بیل ڈال ی جائے کہ وہ بچہ مستقبل میں ایک اچھا طالب علم، نیک بھائی، بہتر باپ اور مفید شہری بن سکے۔

...یلٹ جمع کرنا

...لغفور چودھری

ننھا سلمان آج اسکول سے واپس آیا تو سیدھا اپنے بڑے بھائی کے کمرے میں گھس گیا، جا کر کیا
...ھتا ہے کہ حسن نے اپنے میز پر ڈاک کے ٹکٹ ایسے لگا کر رکھے ہیں جیسے ٹکٹ بیچنے والے بابو کی
...ی کا بورڈ ہو، سلمان کہنے لگا بھائی جان اگر آپ گھر پر ہی ڈاک خانہ کھول لیں تو بڑا مزہ ہو۔ ہم گھر میں
... بیٹھے دنیا بھر کو خط بھیجا کریں اور یہ کہہ کر چپکے سے جو ایک جھپٹا مارا تو میز پر سے ایک ٹکٹ اڑا کر
...ا گا اور کہنے لگا واہ آپ تو کہتے ہیں کہ ڈاک کے ٹکٹ ہیں۔ ٹکٹ کہاں یہ تو بڑے مزے کی تصویریں ہیں
... کہنے لگا سلمان یہ تصویریں نہیں، سچ مچ ڈاک کے ٹکٹ ہیں، اس پر سلمان نے جو غور سے دیکھا
...س پر ڈاک خانے کی مہر لگی ہوئی تھی اور ڈاک کی قیمت بھی لکھی ہوئی تھی۔ لیکن تصویر اس پر ایسی عمدہ
...دی تھی کہ اسے اعتبار نہیں آیا۔ کچھ سوچ کر بولا، بھائی جان میں تو اسے دیا سلائی کی ڈبیہ والی
...ھا تھا، یہ تو سچ مچ ٹکٹ ہی نکلا۔ مگر اس پر یہ پہاڑ اور برف کے تودے سے کیا دکھائے گئے
...سن بولا بھئی یہ کوئی معمولی ٹکٹ نہیں، یہ تو ایک یادگاری ٹکٹ ہے، ہمارے یہاں پچھلے دنوں
...ے لوگوں نے کوہ ہمالیہ کی ایک چوٹی کو فتح کیا تھا، پاکستان کے لوگوں نے ان کی اس فتح کی
... حوصلہ افزائی کی اور اس کی یادگار میں یہ ٹکٹ چھپوا دیا، اب جہاں جہاں یہ ٹکٹ لفافوں پر
...لگ جائے گا وہاں اس چوٹی کی فتح ہونے کی خبر تازہ ہوتی رہے گی۔ اور لوگوں کو پتہ چلے گا کہ
...ستان والے بہادر لوگوں کی کس طرح حوصلہ افزائی کرتے ہیں، اس پر سلمان نے کہا بھائی جان کیا
...ے ہاں کا یادگاری ٹکٹ ایک یہی ہے حسن بولا نہیں سلمان یہ ٹکٹ تو پچھلے دنوں چھپا ہے اس سے
... ہمارے ہاں کئی قسم کے یادگاری ٹکٹ چھپ چکے ہیں، جب پاکستان پہلے پہل بنا تھا تو اس کی
...ار پر ٹکٹ چھاپے گئے، قائد اعظم کی یادگار کے لیے ٹکٹ تیار کیے گئے۔ اس کے علاوہ ہر ملک

لکھنے کے لیے تقسیم کر دیے جائیں، ان کی جو رپورٹیں آئیں وہ ایک فائل میں جمع کر لی جائیں، اس فائل میں تصاویر، سکیچ، ڈرائنگ اور خاکے وغیرہ بھی طلبا سے حاصل کر کے لگائے جائیں، بچے جو اشیا یا نمونے باہر سے لائے ہیں وہ مدرسہ کے عجائب گھر میں رکھے جائیں، ہر حالت میں بچوں کی تعلیم کا صحیح تخلیقی پہلو نمایاں کیا جائے۔

واپسی پر اُن تمام اصحاب کا جنہوں نے اس سیر کو کامیاب بنانے میں مدرس کی امداد کی شکریہ کے خطوط لکھنے ضروری ہیں، یہ کام بچوں سے کرانا چاہیے۔

استاد کا کام یہاں ہی ختم نہیں ہو جاتا کہ اس سیر کو اپنے نصاب میں سمونے کے لیے ابھی اور طریق کار اختیار کرنے ضروری ہیں، اگر اس کے متعلق کوئی چارٹ، ماڈل، فلم پارہ یا فلم جیسا ہو سکے تو وہ دکھائے جائیں، کتابوں اور رسالوں سے تصاویر دکھائی جائیں اور آسان مضمون سنائے جائیں، لائبریری میں اس کی متعلقہ کتابوں کی طرف توجہ دلائی جائے اور بچوں کی رہنمائی کی جائے، غرضیکہ ہر طریق سے اس سبق کو مختلف معاونات کے ذریعہ بچے کے دماغ میں مستقل طور پر پائندہ کر دیا جائے اور آئندہ کے لیے شوق جستجو، مشاہدہ، علمی تحقیق اور مل جل کر کام کرنے کی عادات کی ایسی ٹھوس داغ بیل ڈال دی جائے کہ وہ بچہ مستقبل میں ایک اچھا طالب علم، نیک بھائی، بہتر باپ اور مفید شہری بن سکے۔

ٹکٹ جمع کرنا

عبدالغفور چودھری

ننھا سلمان آج اسکول سے واپس آیا تو سیدھا اپنے بڑے بھائی کے کمرے میں گھس گیا۔ جا کر کیا دیکھتا ہے کہ حسن نے اپنے میز پر ڈاک کے ٹکٹ ایسے لگا کر رکھے ہیں جیسے ٹکٹ بیچنے والے بابو کی کھڑکی کا بورڈ ہو۔ سلمان کہنے لگا بھائی جان اگر آپ گھر پر ہی ڈاک خانہ کھول لیں تو بڑا مزہ ہو۔ ہم گھر میں بیٹھے بیٹھے دنیا بھر کو خط بھیجا کریں اور یہ کہہ کر چپکے سے جو ایک جھپٹا مارا تو میز پر سے ایک ٹکٹ اڑا کر لے بھاگا اور کہنے لگا واہ آپ تو کہتے ہیں کہ ڈاک کے ٹکٹ ہیں۔ ٹکٹ کہاں یہ تو بڑے مزے کی تصویریں ہیں حسن کہنے لگا سلمان یہ تصویریں نہیں، سچ مچ ڈاک کے ٹکٹ ہیں، اس پر سلمان نے جو غور سے دیکھا تو اس پر ڈاک خانے کی مہر لگی ہوئی تھی اور ڈاک کی قیمت بھی لکھی ہوئی تھی۔ لیکن تصویر اس پر ایسی عمدہ بنی ہوئی تھی کہ اسے اعتبار نہیں آیا۔ کچھ سوچ کر بولا، بھائی جان میں تو اسے دیا سلائی کی ڈبیہ والی ڈبیہ سمجھا تھا، یہ تو سچ مچ ٹکٹ ہی نکلا۔ مگر اس پہ یہ پہاڑ اور برف کے تودے سے کیا دکھائے گئے ہیں حسن بولا بھئی یہ کوئی معمولی ٹکٹ نہیں، یہ تو ایک یادگاری ٹکٹ ہے، ہمارے یہاں پچھلے دنوں اٹلی کے لوگوں نے کوہ ہمالیہ کی ایک چوٹی کو فتح کیا تھا، پاکستان کے لوگوں نے ان کی اس فتح کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور اس کی یادگار میں یہ ٹکٹ چھپوا دیا، اب جہاں جہاں یہ ٹکٹ لفافوں پر لگ کر جائے گا وہاں اس چوٹی کی فتح ہونے کی خبر تازہ ہوتی رہے گی۔ اور لوگوں کو پتہ چلے گا کہ پاکستان والے بہادر لوگوں کی کس طرح حوصلہ افزائی کرتے ہیں، اس پر سلمان نے کہا بھائی جان کیا ہمارے ہاں کا یادگاری ٹکٹ ایک یہی ہے حسن بولا نہیں سلمان یہ ٹکٹ تو پچھلے دنوں چھپا ہے اس سے پہلے ہمارے ہاں کئی قسم کے یادگاری ٹکٹ چھپ چکے ہیں، جب پاکستان پہلے پہل بنا تھا تو اس کی یادگار پر ٹکٹ چھاپے گئے۔ قائداعظم کی یادگار کے لیے ٹکٹ تیار کیے گئے۔ اس کے علاوہ ہر ملک

اپنے ملک کی مشہور ہستیوں اچھی عمارتوں اور اچھے مناظر کے ٹکٹ چھپواتا ہے۔ پرانی عمارتوں میں
ہمارے ہاں لاہور کا قلعہ۔ شاہی مسجد اور جہانگیر کا مقبرہ مشہور ہیں۔ ہمارے بعض ٹکٹوں پر ان کی
بڑی خوبصورت تصویریں بنائی گئی ہیں۔ اس پر سلمان بولا۔ بھائی جان ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ ٹکٹ
محض لفافوں پر لگانے کے کام آتے ہیں۔ اب پتہ چلا کہ ان سے تو بڑی بڑی معلومات حاصل ہوتی ہیں
اس پر حسن بولا ابھی تمہیں کیا پتہ چلا ہے ذرا تمہیں اپنے ٹکٹوں کا البم دکھاؤں تو تمہیں معلوم ہو کہ
ان ٹکٹوں کے ذریعے کیسے کیسے شاندار نظارے دیکھنے میں آتے ہیں۔ چھوٹا سلمان بولا۔ بھائی جان
البم کیا کوئی لفافہ ہوتا ہے جس میں ٹکٹوں کو جمع کر کے رکھتے ہیں۔ اس پر حسن نے ایک مجلد قسم کی
بڑی کتاب نکالی۔ سلمان نے کھول کر دیکھا تو اس میں موٹے موٹے مضبوط قسم کے ورق لگے ہوئے تھے
جن پر ٹکٹوں کے سائز سے کچھ بڑے چوکھٹے بنے ہوئے تھے۔ کسی صفحے پر ایران لکھا ہوا تھا کسی پر چین،
اور کسی پر جاپان۔ اس طرح ہر ملک کا اپنا اپنا صفحہ تھا اس میں اس ملک کے ٹکٹ لگے ہوئے تھے
مصر کا صفحہ جو کھولا تو اس میں بعض ٹکٹوں پر دریائے نیل میں کشتیاں چلتی ہوئی دکھائی گئی تھیں کہیں
مصر کے اہرام آسمان کی خبر لا رہے تھے۔ ایران کے ایک ٹکٹ پر شیر اور سورج کی تصویر تھی۔ اتاترک کی
تصویر اس کی شان و شوکت کو دوبالا کر رہی تھی۔

سلمان ان ٹکٹوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا کہنے لگا بھائی جان آپ نے یہ خزانہ تو ہم سے آج تک
چھپائے رکھا۔ بھلا اگر مجھے یہ البم پہلے سے مل جاتا تو میں جغرافیہ کا مضمون اپنی کتاب سے
کیوں پڑھتا، ان تصویروں کو دیکھ کر آدھی دنیا کا جغرافیہ تو مجھے ابھی سے آگیا ہے، اس پر حسن نے
کہا سلمان ان ٹکٹوں سے ہمیں جغرافیہ کا علم ہی حاصل نہیں ہوتا ہے بلکہ ہم تاریخ بھی سیکھتے ہیں
مثلاً ہم ایک لفافہ پر ٹکٹ لگا کر امریکہ بھیجتے ہیں وہاں کا کوئی شوقین بچہ اس ٹکٹ کو اتار کر اپنے
البم میں لگا لیتا ہے اور اس ٹکٹ پر قائداعظم کی تصویر بنی ہوئی ہے تو اسے خود بخود دلچسپی
پیدا ہو گی کہ آخر یہ کون سی ہستی ہے جس کی یادگار میں پاکستان نے یادگاری ٹکٹ تیار کرائے
ہیں اس طرح وہ کہیں نہ کہیں سے قائداعظم کی زندگی کے حالات معلوم کرتا ہے، اسے پتہ چلیگا

کہ ایک عظیم الشان انسان کی بدولت ایک قوم نے کس طرح آزادی حاصل کی۔ اس طرح میرے اس البم میں امریکہ کے کئی ایسے ٹکٹ ہیں جن پر جارج واشنگٹن، ابراہم لنکن اور کئی ایک امریکن لیڈروں کی تصویریں ہیں، اس سے پہلے امریکہ کی تاریخ کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا جب پہلے پہل ان کی تصویریں دیکھیں تو شوق پیدا ہوا اور اس کے بعد اتنی دلچسپی بڑھی کہ میں نے امریکہ کی پوری تاریخ پڑھ ڈالی۔

اس پر سلمان بولا ۔ بھائی جان! "دردِ سر کے واسطے صندل لگانا ہے مفید۔ پر اس کا گھسنا اور لگانا دردِ سر یہ بھی تو ہے" کے مصداق ان ٹکٹوں سے معلومات تو خوب حاصل ہوتی ہیں لیکن ان کو جمع کرنا بھی تو آسان کام نہیں، اس پر حسن نے کہا واہ یہ بھی ایک ہی رہی۔ بھائی ان کا جمع کرنا بڑا آسان ہے۔ ذرا تم ایک البم بنالو تو پھر ہم تمہیں اس کے جمع کرنے کی ایسی ترکیبیں بتائیں گے کہ عش عش کر اٹھو گے ۔

(ریڈیو پاکستان سے نشر کیا گیا)

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

اقوامِ متحدہ کا مقابلہِ مضامین

اقوامِ متحدہ کے محکمہ اطلاعات عامہ نے ایسے غیر سرکاری اداروں کے اراکین کے لیے جو اقوامِ متحدہ کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں مضامین کے مقابلے کا اعلان کیا ہے۔

مقابلے میں ایسے اراکین حصہ لے سکیں گے جن کی عمر ۲۰ سال سے زیادہ ہوگی اور جو اقوامِ متحدہ کے ممبر ملکوں کے باشندے ہوں. گذشتہ سال ۷۰ ممالک نے اس مقابلے میں حصہ لیا تھا. اس سال مضمون کا موضوع ہے "وہ آپ کے ملک یا علاقے میں غیر سرکاری اداروں نے گذشتہ دس سال میں عوام کو اقوامِ متحدہ کے اغراض و مقاصد سمجھانے میں کس قدر حصہ لیا ہے" مضمون کے الفاظ کی تعداد ڈھائی ہزار سال سے زیادہ نہ ہونی چاہیے۔ مضمون مادری زبان میں لکھا جا سکتا ہے۔ البتہ اس کے انگریزی ترجمے کی چھ کاپیاں بھیجنا ضروری ہیں. بطور انعام دنیا بھر کے سات کامیاب مضمون نویسوں کو اقوامِ متحدہ کے صدر مقام نیویارک میں ایک ماہ کے قیام کا موقع دیا جائے گا، ہر ملک کے صرف ایک ہی باشندے کو انعام ملے گا۔ انہیں اقوامِ متحدہ کی جانب سے سفر و قیام کے اخراجات ادا کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ۵ سے ۸ تک ایسے انعام بھی ہوں گے جن کے ذریعے ان کو دو ہفتے کے لیے اقوامِ متحدہ کے کسی ایک علاقائی مرکز مثلاً جنیوا، انتیاگو یا بنکاک میں قیام کا موقع دیا جائے گا۔

غیر سرکاری اداروں کو پہلے مضامین بھیجے جائیں گے اور پھر بہترین مضامین (زیادہ سے زیادہ دو) کا انتخاب کر کے یکم مئی ۱۹۵۸ء تک قومی کمیٹی کو بھیج دیا جائے گا۔

ایک قومی کمیٹی غیر سرکاری اداروں کے منتخب شدہ مضامین کو جانچنے کے بعد اپنے طور پر دو مضامین کا انتخاب کر کے بین الاقوامی ججوں کی جماعت کے پاس اقوامِ متحدہ کے صدر مقام نیویارک کو

۲۵ مئی ۱۹۵۵ء سے قبل روانہ کردے گی۔ بین الاقوامی ججوں کی جماعت انعام پانے والوں کا اعلان ۲۵ جون ۱۹۵۵ء سے قبل کردے گی۔ انعام پانے والوں کے قیام کا سلسلہ نیویارک میں ۱۵ ستمبر ۱۹۵۵ء سے شروع ہوگا۔

شرائط | مندرجہ ذیل اداروں کے ۲۰ سال سے زیادہ عمر کے ممبر اس مقابلے میں حصہ لے سکتے ہیں۔

(۱) تمام قومی ادارے جو سرگرمی سے براہ راست محکمہ تعلقات عامہ یا اقوام متحدہ کے مرکز اطلاعات سے تعاون کرتے ہیں (۲) تمام قومی ادارے جو بین الاقوامی غیر سرکاری اداروں سے ملحق ہیں اور اقوام متحدہ سے تعاون کرتے ہیں۔

مضمون | آپ کے ملک یا علاقے میں غیر سرکاری اداروں نے گذشتہ دس سال میں عوام کو اقوام متحدہ کے اغراض و مقاصد سمجھانے میں کس قدر حصہ لیا ہے۔

مضمون کی طوالت | مضمون کے الفاظ کی تعداد ڈھائی ہزار سے زیادہ نہ ہونی چاہیے۔ امیدوار اپنی مادری زبان میں مضمون لکھ سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ٹائپ شدہ انگریزی ترجمے کی چھ نقلیں بھی بھیجنی چاہئیں۔ اس کے امیدواروں کو ایک "سوالنامہ" کی تکمیل کرنی ہوگی، اس سوال نامہ میں وہ اپنی تعلیم کے متعلق سوالات کا جواب دیں گے اور یہ بتائیں گے کہ وہ اقوام متحدہ کے صدر مقام پر قیام سے کیا فائدہ حاصل کریں گے۔

سوالنامہ کے فارم مرکز اطلاعات اقوام متحدہ۔ کراچی نمبر ۲ سے طلب کیے جا سکتے ہیں۔

انعامات | بین الاقوامی ججوں کی جماعت جن امیدواروں کو منتخب کرے گی ان کو اقوام متحدہ انعام دے گی

پہلا انعام | سات کامیاب امیدواروں کو اقوام متحدہ کے صدر مقام نیویارک میں چار ہفتے کے قیام کا موقع دیا جائے گا۔ رہائش کے اخراجات کے لیے روزانہ پندرہ ڈالر ملیں گے۔ ہر ملک کو صرف ایک ہی انعام ملے گا۔ اور جہاں مضامین کا معیار یکساں ہوگا وہاں ججوں کو جغرافیائی لحاظ سے انعامات کی تقسیم کا اختیار ہوگا۔ نیویارک میں قیام کا آغاز ۱۵ ستمبر ۱۹۵۵ء سے ہوگا تاکہ انعام حاصل کرنے والوں کو جنرل اسمبلی کے دسویں اجلاس کے مباحثوں کو سننے کا موقع مل سکے۔

اقوام متحدہ کامیاب امیدواروں کو ان کی مستقل جائے سکونت سے نیویارک تک کے آمد و رفت
کے ضروری انتظام کرے گی اور اس کا سفر خرچ بھی دے گی۔

دوسرا انعام | ۵ سے ۸ تک دوسرے انعامات ہوں گے۔ ہر ایک کامیاب امیدوار کو دو ہفتے کے لیے
اقوامِ متحدہ کے کسی ایک علاقائی مرکز مثلاً جنیوا یا بنکوک میں قیام کا موقع دیا جائے گا (ان انعامات کی
صحیح تعداد کا دارومدار اول انعامات کو تقسیم کرنے کے بعد ممکن الحصول سرمایہ پر ہوگا) اس درجہ میں بھی اقوام متحدہ
سفر خرچ روزانہ رہائش کا الاؤنس سرکاری شرح کے مطابق جو اس علاقے میں رائج ہے دے گی۔

ریڈیو نشریات میں مداخلت کی ممانعت

جنرل اسمبلی کی معاشرتی کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ ان ملکوں سے جنہوں نے امن کی خاطر نشریات سے
۱۹۳۶ء کے ضابطۂ قانون کو منظور کیا تھا، دریافت کیا جائے کہ کیا وہ اس قانون کی تجدید کے حق میں ہیں
اس کے ساتھ ہی ساتھ کمیٹی نے تجویز پیش کی ہے کہ غیر ملکی ریڈیو نشریات سننے میں جو مداخلت کی جاتی
ہے اسے ممنوع قرار دینے کے لیے ایک نیا مسودۂ قانون تیار کیا جائے۔

کمیٹی نے اس تجویز کے تیار شدہ مسودے پر رائے شماری کی جس کو ابتداءً سوویٹ روس نے مرتب
کیا تھا۔ آخری رائے شماری کے وقت ۲۵ ووٹ اس کی موافقت میں دیے گئے، مخالفت کسی نے
نہیں کی اور روس سمیت ۲۰ ممبر ملکوں نے رائے دینے سے احتراز کیا۔ اس طرح کمیٹی میں آزادی
اطلاعات سے متعلق ایجنڈے کی شق پر کارروائی مکمل ہو گئی۔

اس قرارداد کے مطابق جنرل سیکرٹری سے کہا گیا ہے کہ وہ ایک ضابطۂ قانون کا مسودہ تیار کریں
جس کے مطابق وہ اختیارات جو مذکورہ بالا ضابطے کے تحت لیگ آف نیشنز کو حاصل تھے اقوام متحدہ
کے نام منتقل ہو جائیں۔

شروع میں نیدرلینڈز، ترکی اور برطانیہ نے یہ دفعہ شامل کرنے کی درخواست کی تھی کہ ریڈیو
میں مداخلت کو ممنوع قرار دیا جائے، سوویٹ یونین نے اس رائے کو اپنی تجویز میں لیکن ذرا مختلف
انداز میں شامل کر لینے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔ روسی مسودے کے مطابق صرف ان غیر ملکی نشریات میں

مداخلت کی مانعت ہوئی، جن سے ضابطۂ قانون کی دو خاص دفعات کی خلاف ورزی نہ ہوئی، یہ دفعات صرف ان نشریات کو ممنوع قرار دیتی ہیں جن کے ذریعے کسی ملک کے اندرونی نظام اور تحفظ کو نقصان پہونچایا جاسکتا ہو، ان میں ایسی غلط بیانی ہو جس سے بین الاقوامی مفاہمت کی ساکھ پر اثر پڑتا ہو۔ ان دونوں باتوں کو کمیٹی نے مسترد کر دیا۔

یوگوسلاویہ نے رائے دینے سے احتراز کرنے کی یہ وجہ بتائی کہ ایک قدیم دستاویز کو اقوام متحدہ کے تمام نقل کرنے کے معمولی سوال کو بلا وجہ ایک سیاسی موضوع نزاع بنا دیا گیا۔

والدین کا احتجاج

برسٹل (انگلینڈ) کے ایک ابتدائی مدرسہ میں تربیت جسمانی کے سبقوں کے دوران میں بچوں کو نکروں کے سوا تمام کپڑے اتارنے کو کہا گیا۔ یہ اسباق کھیل کے میدان میں دیے جا رہے تھے اس پر بچوں کے والدین نے تعلیمی افسر کے پاس شکایت کی اور مطالبہ کیا کہ والدین کی اجازت حاصل کیے بغیر کسی بچے کو کپڑے اتارنے پر مجبور نہ کیا جائے۔

اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ماہر تعلیم نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ آیا والدین کا یہ مطالبہ قانون تعلیم ۱۹۴۴ء کی خلاف ورزی نہیں، یہ قانون ہر بچے کے لیے موثر تعلیم لازمی قرار دیتا ہے۔ کیا جسمانی تعلیم موثر تعلیم میں شامل نہیں۔ اگر ہے اور یقیناً ہے تو کیا کپڑے تبدیل کیے بغیر موثر جسمانی تعلیم دی جاسکتی ہے؟ تربیت جسمانی کے ماہر اس آخری سوال کا جواب نفی میں دیتے ہیں، اس دلچسپ صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ماہر تعلیم نے لکھا ہے کہ مناسب یہ ہوگا کہ اس نکتہ کی قانونی تشریح کرائی جائے تاکہ والدین کو اس بات کا احساس ہوسکے کہ ہر قسم کی تعلیم کے لیے موزوں لباس مہیا کرنا ان کی قانونی ذمہ داری ہے۔

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

اقوام متحدہ کا مقابلہ مضامین

اقوام متحدہ کے محکمہ اطلاعات عامہ نے ایسے غیر سرکاری اداروں کے اراکین کے لیے جو اقوام متحدہ کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں مضامین کے مقابلے کا اعلان کیا ہے۔
مقابلے میں ایسے اراکین حصہ لے سکیں گے جن کی عمر ۲۰ سال سے زیادہ ہوگی اور جو اقوام متحدہ کے ممبر ملکوں کے باشندے ہوں۔ گذشتہ سال ۶۰ ممالک نے اس مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ اس سال مضمون کا موضوع ہے "وہ آپ کے ملک یا علاقے میں غیر سرکاری اداروں نے گذشتہ دس سال میں عوام کو اقوام متحدہ کے اغراض و مقاصد سمجھانے میں کس قدر حصہ لیا ہے" مضمون کے الفاظ کی تعداد ڈھائی ہزار سے زیادہ نہ ہونی چاہیے، مضمون مادری زبان میں لکھا جا سکتا ہے۔ البتہ اس کے انگریزی ترجمے کی چھ کاپیاں بھیجنا ضروری ہیں۔ بطور انعام دنیا بھر کے سات کامیاب مضمون نویسوں کو اقوام متحدہ کے صدر مقام نیویارک میں ایک ماہ کے قیام کا موقع دیا جائے گا، ہر ملک کے صرف ایک ہی باشندے کو انعام ملے گا۔ انہیں اقوام متحدہ کی جانب سے سفر و قیام کے اخراجات ادا کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ۵ سے ۸ تک ایسے انعام بھی ہوں گے جن کے ذریعے ان کو دو ہفتے کے لیے اقوام متحدہ کے کسی ایک علاقائی مرکز مثلاً جنیوا، انتیاگو یا بنکوک میں قیام کا موقع دیا جائے گا۔
غیر سرکاری اداروں کو پہلے مضامین بھیجے جائیں گے اور پھر بہترین مضامین (زیادہ سے زیادہ دو) کا انتخاب کر کے یکم مئی ۱۹۵۵ء تک قومی کمیٹی کو بھیج دیا جائے گا۔
ایک قومی کمیٹی غیر سرکاری اداروں کے منتخب شدہ مضامین کو جانچنے کے بعد اپنے طور پر دو مضامین کا انتخاب کر کے بین الاقوامی ججوں کی جماعت کے پاس اقوام متحدہ کے صدر مقام نیویارک

۲۷ مئی ۱۹۵۵ء سے قبل روانہ کردے گی۔ بین الاقوامی ججوں کی جماعت انعام پانے والوں کا اعلان ۲۷ جون ۱۹۵۵ء سے قبل کردے گی۔ انعام پانے والوں کے قیام کا سلسلہ نیویارک میں ۱۵ ستمبر ۱۹۵۵ء سے شروع ہوگا۔

شرائط | مندرجہ ذیل اداروں کے ۲۰ سال سے زیادہ عمر کے ممبر اس مقابلے میں حصہ لے سکتے ہیں۔

(۱) تمام قومی ادارے جو سرگرمی سے براہِ راست محکمہ تعلقاتِ عامہ یا اقوامِ متحدہ کے مرکزِ اطلاعات سے تعاون کرتے ہیں (۲) تمام قومی ادارے جو بین الاقوامی غیر سرکاری اداروں سے ملحق ہیں اور اقوامِ متحدہ سے تعاون کرتے ہیں۔

مضمون | آپ کے ملک یا علاقے میں غیر سرکاری اداروں نے گذشتہ دس سال میں عوام کو اقوامِ متحدہ کے اغراض و مقاصد سمجھانے میں کس قدر حصہ لیا ہے۔

مضمون کی طوالت | مضمون کے الفاظ کی تعداد ڈھائی ہزار سے زیادہ نہ ہونی چاہیے۔ امیدوار اپنی مادری زبان میں مضمون لکھ سکتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی ٹائپ شدہ انگریزی ترجمے کی چھ نقلیں بھی بھیجی جائیں۔ اس کے امیدواروں کو ایک سوالنامہ کی تکمیل کرنی ہوگی، اس سوالنامہ میں وہ اپنی تعلیم کے متعلق سوالات کا جواب دیں گے اور یہ بتائیں گے کہ وہ اقوامِ متحدہ کے صدر مقام پر قیام سے کیا فائدہ حاصل کریں گے۔

سوالنامہ کے فارم مرکزِ اطلاعات اقوامِ متحدہ۔ کراچی نمبر ۲ سے طلب کیے جا سکتے ہیں۔

انعامات | بین الاقوامی ججوں کی جماعت جن امیدواروں کو منتخب کرے گی ان کو اقوامِ متحدہ انعام دے گی۔

پہلا انعام | سات کامیاب امیدواروں کو اقوامِ متحدہ کے صدر مقام نیویارک میں چار ہفتے کے قیام کا موقع دیا جائے گا۔ رہائش کے اخراجات کے لیے روزانہ پندرہ ڈالر ملیں گے۔ ہر ملک کو صرف ایک ہی انعام ملے گا۔ اور جہاں مضامین کا معیار یکساں ہوگا وہاں ججوں کو جغرافیائی لحاظ سے انعامات کی تقسیم کا اختیار ہوگا۔ نیویارک میں قیام کا آغاز ۱۵ ستمبر ۱۹۵۵ء سے ہوگا تاکہ انعام حاصل کرنے والوں کو جنرل اسمبلی کے دسویں اجلاس کے مباحثوں کو سننے کا موقع مل سکے۔

اقوامِ متحدہ کامیاب امیدواروں کو ان کی مستقل جائے سکونت سے نیویارک تک کے آمدورفت کے ضروری انتظام کرے گی اور اس کا سفر خرچ بھی دے گی۔

دوسرا انعام | ۵ سے ۸ تک دوسرے انعامات ہوں گے۔ ہر ایک کامیاب امیدوار کو دو ہفتے کے لیے اقوامِ متحدہ کے کسی ایک علاقائی مرکز مثلاً جنیوا یا بنکوک میں قیام کا موقع دیا جائے گا (ان انعامات کی صحیح تعداد کا دارومدار اول انعامات کو تقسیم کرنے کے بعد ممکن الحصول سرمایہ پر ہوگا) اس درجہ میں بھی اقوامِ متحدہ سفر خرچ روزانہ رہائش کا الاؤنس سرکاری شرح کے مطابق جو اس علاقے میں رائج ہے دے گی۔

ریڈیو نشریات میں مداخلت کی ممانعت

جنرل اسمبلی کی سماشرتی کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ ان ملکوں سے جنہوں نے امن کی خاطر نشریات سے ۱۹۳۶ء کے ضابطہ قانون کو منظور کیا تھا، دریافت کیا جائے کہ کیا وہ اس قانون کی تجدید کے حق میں ہیں اس کے ساتھ ہی ساتھ کمیٹی نے تجویز پیش کی ہے کہ غیر ملکی ریڈیو نشریات سننے میں جو مداخلت کی جاتی ہے اسے ممنوع قرار دینے کے لیے ایک نیا مسودۂ قانون تیار کیا جائے۔

کمیٹی نے اس تجویز کے تیار شدہ مسودے پر رائے شماری کی جس کو ابتداءً سوویٹ روس نے مرتب کیا تھا۔ آخری رائے شماری کے وقت ۲۵ ووٹ اس کی موافقت میں دیے گئے، مخالفت کسی نے نہیں کی اور روس سمیت ۲۰ ممبر ملکوں نے رائے دینے سے احتراز کیا۔ اس طرح کمیٹی میں آزادی اطلاعات سے متعلق ایجنڈے کی شق پر کارروائی مکمل ہوگئی۔

اس قرارداد کے مطابق جنرل سیکرٹری سے کہا گیا ہے کہ وہ ایک ضابطۂ قانون کا مسودہ تیار کریں جس کے مطابق وہ اختیارات جو مذکورہ بالا ضابطے کے تحت لیگ آف نیشنز کو حاصل تھے اقوامِ متحدہ تک منتقل ہو جائیں۔

شروع میں نیدرلینڈز، ترکی اور برطانیہ نے یہ دفعہ شامل کرنے کی درخواست کی تھی کہ ریڈیو میں مداخلت کو ممنوع قرار دیا جائے۔ سوویٹ یونین نے اس دفعہ کو اپنی تجویز میں لیکن ذرا مختلف صورت میں شامل کرلینے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔ روسی مسودے کے مطابق صرف ان غیر ملکی نشریات میں

مداخلت کی ممانعت ہوئی جن سے ضابطۂ قانون کی دو خاص دفعات کی خلاف ورزی نہ ہوئی، یہ دفعات صرف ان نشریات کو ممنوع قرار دیتی ہیں جن کے ذریعے کسی ملک کے اندرونی نظام اور تحفظ کو نقصان پہونچایا جا سکتا ہو، ان میں ایسی غلط بیانی ہو جس سے بین الاقوامی مفاہمت کی ساکھ پر اثر پڑتا ہو۔ ان دونوں باتوں کو کمیٹی نے مسترد کر دیا۔

یوگوسلادیہ نے رائے دینے سے احتراز کرنے کی یہ وجہ بتائی کہ ایک قدیم دستاویز کو اقوام متحدہ کے تمام منتقل کرنے کے معمولی سوال کو بلاوجہ ایک سیاسی موضوع نزاع بنا دیا گیا۔

والدین کا احتجاج

برسٹل (انگلینڈ) کے ایک ابتدائی مدرسہ میں تربیت جسمانی کے سبقوں کے دوران میں بچوں کو نکروں کے سوا تمام کپڑے اتار نے کو کہا گیا۔ یہ اسباق کھیل کے میدان میں دیے جا رہے تھے اس پر بچوں کے والدین نے تعلیمی افسر کے پاس شکایت کی اور مطالبہ کیا کہ والدین کی اجازت حاصل کیے بغیر کسی بچے کو کپڑے اتارنے پر مجبور نہ کیا جائے۔

اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ماہر تعلیم نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ آیا والدین کا یہ مطالبہ قانون تعلیم ۱۹۴۴ء کی خلاف ورزی نہیں، یہ قانون ہر بچے کے لیے موثر تعلیم لازمی قرار دیتا ہے۔ کیا جسمانی تعلیم موثر تعلیم میں شامل نہیں۔ اگر ہے اور یقیناً ہے تو کیا کپڑے تبدیل کیے بغیر موثر جسمانی تعلیم دی جا سکتی ہے؟ تربیت جسمانی کے ماہر اس آخری سوال کا جواب نفی میں دیتے ہیں، اس دلچسپ صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ماہر تعلیم نے لکھا ہے کہ مناسب یہ ہوگا کہ اس نکتہ کی قانونی تشریح کرائی جائے تاکہ والدین کو اس بات کا احساس ہو سکے کہ ہر قسم کی تعلیم کے لیے موزوں لباس مہیا کرنا ان کی قانونی ذمہ داری ہے۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجال ——— شعبہ مدارس

ای/۵۰۲ — ۱۶ جنوری ۵۵ء — م۔ سعید احمد بی۔ اے، بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) ایک امیدوار کو جن کی تقرری کے احکام برائے گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں جاری ہو چکے تھے۔ تاریخ حاضری سے م۔ محمد اسلم خاں کی جگہ قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ محمد اسلم خاں۔ بی۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال کو تاریخ حاضری سے م۔ سعید احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں مقرر کیا گیا۔

ای/۲۶۷ — ۱۸ جنوری ۵۵ء — م۔ سید احمد (۱۵۰ — ۲۵۰) ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد رفیع کی جگہ جو مستعفی ہو چکے ہیں اپنی تنخواہ پر ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ساہی وال مقرر کیا گیا۔

ای/۲۳۶ — ۸ جنوری ۵۵ء — م۔ عبدالواحد چوہدری، پی۔ ٹی (والٹن) (۶۰ — ۱۴۰) ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ساہی وال کو جن کے تبادلہ کے احکام برائے گورنمنٹ ہائی اسکول باغبان پورہ جاری ہو چکے تھے، تاریخ حاضری سے م۔ محمد حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شرق پور مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ محمد حسین میٹرک پی۔ ٹی (والٹن) (۶۰ — ۱۴۰) قائم مقام ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شرق پور کو تاریخ حاضری سے م۔ عبدالواحد چوہدری کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول باغبان پورہ مقرر کیا گیا۔

ای/۱۲۷ — ۱۸ جنوری ۵۵ء — م۔ ظہور احمد مولوی فاضل او۔ ٹی (۶۰ — ۱۴۰) معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول

پنڈدادن خاں کو تاریخ حاضری سے م۔خورشید حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ مقرر کیا گیا۔

ی/ ۱۲۷ م۔خورشید حسین (۶۰ - ۱۴۰) معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ کو تاریخ جنوری ۱۹۵۵ء حاضری سے م۔ظہور احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈدادن خاں مقرر کیا گیا۔ (نوٹ :- ہر دو اساتذہ اپنے خرچ پر سفر کریں گے)

ی/ ۱۲۵ م۔سجاول خاں بی۔ اے، ایس۔ اے، وی (۱۳۰ - ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ جنوری ۱۹۵۵ء ہائی اسکول فتح جنگ کو تاریخ حاضری سے م۔نذر محمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو مقرر کیا گیا۔

ی/ ۱۲۳ م۔محمد صدیق بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ - ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول جنوری ۱۹۵۵ء بھوچال کلاں کو تاریخ حاضری سے م۔محمود الٰہی شاہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال مقرر کیا گیا۔

〃 م۔محمود الٰہی شاہ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ - ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈدادن خان کو تاریخ حاضری سے م۔بشیر محمد خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال مقرر کیا گیا۔

/ ۷ م۔غلام حسین (۶۰ - ۱۴۰) ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پھالیہ کو تاریخ حاضری وری ۱۹۵۵ء سے م۔نذر حسین نذر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر زائد ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ مقرر کیا گیا۔

〃 م۔نذر حسین نذر (۶۰ - ۱۴۰) زائد ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ کو تاریخ حاضری سے م۔احمد علی جبین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول مٹھہ ٹوانہ مقرر کیا گیا۔

〃 م۔احمد علی جبین (۶۰ - ۱۴۰) ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول مٹھہ ٹوانہ کو

تاریخ حاضری سے م۔ غلام حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پھالیہ مقرر کیا گیا۔

ای/۸ ق۔ محمد امین (۱۳۰ ۔ ۔ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم کو تاریخ حاضری سے
۲۴ جنوری ۵۹ء م جیدر رضا کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول بھوچال کلاں مقرر کیا گیا۔

ء میر حیدر رضا بی اے۔ ایس اے۔ وی (۱۳۰ ۔ ۔ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول بھوچال کلاں کو تاریخ حاضری سے ق۔ محمد امین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم مقرر کیا گیا۔

ای/۶ م۔ غلام حسین (۶۰ ۔ ۔ ۱۴۰) ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پھالیہ کو تاریخ حاضری سے
۲۴ جنوری ۵۹ء م۔ شبیر محمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ مقرر کیا گیا۔

ء م۔ شبیر محمد (۶۰ ۔ ۱۴۰) ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ کو تاریخ حاضری سے م۔ فضل علی شاہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول سٹھہ ٹوانہ مقرر کیا گیا۔

ء م۔ فضل علی شاہ (۶۰ ۔ ۱۴۰) ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول سٹھہ ٹوانہ کو تاریخ حاضری سے م۔ غلام حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پھالیہ مقرر کیا گیا۔

ای/۱۹۰۸/۴ م۔ غلام سرور (۶۰ ۔ ۔ ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کہوٹہ کو تاریخ حاضری سے
۲۳ دسمبر ۵۸ء م۔ وزیر خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول مری مقرر کیا گیا۔

ء م۔ وزیر خاں (۶۰ ۔ ۔ ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول مری کو تاریخ حاضری سے

م۔ غلام سرور کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کہوٹہ مقرر کیا گیا۔

ی/۲۲/۱۳۱ محمد نصراللہ خاں (۶۰ — ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ننکانہ کو تاریخ حاضری
۲ دسمبر ۵۳ء سے م۔ محمد انور کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی بھٹیاں مقرر کیا گیا۔

" م۔ محمد انور۔ ایس۔ وی منشی فاضل (۶۰ — ۱۴۰) قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی بھٹیاں کو تاریخ حاضری سے ج۔ محمد نصراللہ خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ننکانہ مقرر کیا گیا۔

ای/۴۰/۱۳۱ ج۔ عبدالحمید خاں۔ بی۔ اے، ایس۔ اے۔ وی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ
۲ دسمبر ۵۳ء ہائی اسکول ننکانہ کو تاریخ حاضری سے م۔ میر الہٰی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال مقرر کیا گیا۔

" م۔ میر الہٰی قریشی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال کو تاریخ حاضری سے ج۔ عبدالحمید خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے، اپنی تنخواہ پر قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ننکانہ مقرر کیا گیا۔

" م۔ حمید مسلم ایم۔ اے، بی، ایس سی، بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ننکانہ کو تاریخ حاضری سے م۔ فیض الرحمان کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول اکال گڑھ مقرر کیا گیا۔

" م۔ فیض الرحمان بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول اکال گڑھ کو تاریخ حاضری سے م۔ حمید مسلم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ننکانہ مقرر کیا گیا۔

ی/۱۱/۱۲۹۶ م۔ محمد حنیف (۶۰ — ۱۴۰) ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول فتح جنگ کو تاریخ حاضری سے
دسمبر ۵۳ء

م۔ فضل حق کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول للہ مقرر کیا گیا۔

ای/۱/۱۲۹۷۲ — ۷ جنوری ۵۷ء
م۔ فضل حق (۷۰ — ۱۴۰) قائم مقام ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول للہ کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد حنیف کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول فتح جنگ مقرر کیا گیا۔

ای/۵۸ ۱۲۹ — ۷ جنوری ۵۷ء
س۔ احمد شاہ (۷۱ — ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول حسن ابدال کو تاریخ حاضری سے م۔ برخوردار کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول میاں والی مقرر کیا گیا۔

〃
م۔ برخوردار خاں (۷۰ — ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول میاں والی کو تاریخ حاضری سے س۔ احمد شاہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول حسن ابدال مقرر کیا گیا۔

ای/۱۲ ۱۲۷۸ — ۱۸ نومبر ۵۷ء
م۔ محمد حنیف (۷۰ — ۱۴۰) ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول فتح جنگ کو تاریخ حاضری سے س۔ مبارک علی شاہ کی جگہ جو اپنی آسامی سے غیر حاضر ہیں، اپنی تنخواہ پر ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول حسن ابدال مقرر کیا گیا۔

ای/۱۲۲۰۳۱ — ۱۴ نومبر ۵۷ء
م۔ محمد شاہ (۷۰ — ۱۴۰) ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا کو تاریخ حاضری سے م۔ نیاز محمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ پور صدر مقرر کیا گیا۔

〃
م۔ نیاز محمد (۷۰ — ۱۴۰) ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ پور صدر کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد شاہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا مقرر کیا گیا۔

ای/۲۵۵۶۳ — ۳ دسمبر ۵۷ء
م۔ محمد اصغر ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد حسین کی جگہ جو سبکدوش ہو گئے ہیں۔

(۶۰ - ۱۴۰) کے عام پیمانۂ تنخواہ میں -/۶۰ روپے ماہوار پر قائم مقام معلم فنون و دست کاری گورنمنٹ ہائی اسکول گھرانوالہ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۴۳۴۳ م۔ عبدالواحد چوہدری ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ساہی وال کو تاریخ حاضری سے بجائے محمد سعید
۲۹ دسمبر ۵۸ء کی جگہ جن کو رخصت دی جا چکی ہے اپنی تنخواہ پر ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول باغبان پورہ مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ محمد رفیق صوفی، میٹرک۔ پی۔ ٹی۔ ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ عبدالواحد چوہدری کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (۶۰ - ۱۴۰) کے عام پیمانۂ تنخواہ میں -/۶۰ روپے ماہوار پر قائم مقام ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ساہی وال مقرر کیا گیا۔

ای/۲۳۱۷۸ م۔ اللہ دسایا خان۔ ایس۔ وی۔ منشی فاضل (۶۰ - ۱۴۰) قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ
۲۵ دسمبر ۵۸ء ہائی اسکول بھیرہ کو تاریخ حاضری سے م۔ علی احمد کی جگہ جو وفات پا گئے ہیں اپنی تنخواہ پر قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ مقرر کیا گیا۔

〃 م محمد رفیق شاہ ایس۔ وی۔ ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ اللہ دسایا کی جگہ (۶۰ - ۱۴۰) کے عام پیمانۂ تنخواہ میں -/۶۰ روپے ماہوار پر قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۲۹۷۹ م۔ محمد حسین ایس۔ وی ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ عبدالجلیل کی جگہ جن کی خدمات
۲۳ دسمبر ۵۸ء ختم کر دی گئی ہیں (۶۰ - ۱۴۰) کے عام پیمانۂ تنخواہ میں -/۶۰ روپے ماہوار پر قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو مقرر کیا گیا۔

زیڈ/۲۲۹۱۲ ڈاکٹر غلام یٰسین خان نیازی افسر انچارج انتظام دفتر ڈائرکٹر تعلیم پنجاب لاہور کو ایک موجودہ
۲۴ دسمبر ۵۸ء آسامی پر ۱۴ دسمبر ۵۸ء قبل دوپہر سے اپنی تنخواہ پر تربیتی اداروں کا انسپکٹر مقرر کیا گیا۔

ای/۲۲۸۷۰ م۔ فضل کریم بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰ - ۳۵۰) صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول راجن پور کو
۲۲ دسمبر ۵۸ء جن کی تبدیلی کے احکام کمالیہ کے لیے جاری ہو چکے تھے، تاریخ حاضری سے م۔ خلیل الحسن

ی جگہ جو سبک دوش ہو چکے ہیں اور م ظفر عالم کی بجائے جن کی تقرری منسوخ کی جاتی ہے اپنی تنخواہ پر صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول کروڑ پکا مقرر کیا گیا۔

ای/۹۸/۱۷۴م — م۔ نذیر احمد خاں بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ انگریزی مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول شاہ پور شہر (آزمائشی)
۱۱ دسمبر …ء کو تاریخ حاضری سے م۔ عبدالرؤف کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول شاہ پور صدر (آزمائشی) مقرر کیا گیا۔

" — م۔ نواب دین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ساہی وال کو تاریخ حاضری سے م نذیر احمد خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول شاہ پور شہر مقرر کیا گیا۔

" — م۔ محمد انور علی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ایک امیدوار کو م۔ ممتاز احمد کی آسامی پر جو بیرونی ملازمت میں ہیں تاریخ حاضری سے (۱۳۰ — ۲۵۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۱۳۰/- روپے ماہوار پر قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول شاہی وال مقرر کیا گیا۔

ای/۴۹۴/۴م — م۔ غلام حسین بی۔ اے، ایس۔ اے۔ وی (۲۵۰ — ۳۵۵) صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول
۹ دسمبر …ء کیمبل پور کو تاریخ حاضری سے ج۔ علی اکبر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس مظفر گڑھ مقرر کیا گیا۔

" — م۔ غفور اللہ لودھی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰ — ۳۵۵) صدر معلم گورنمنٹ نارمل اسکول کمالیہ کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد یوسف علی خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس میانوالی مقرر کیا گیا۔

ای/۵۷/۴م — ق۔ عبدالسلام انصاری ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰ — ۳۵۵) صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول
۹ دسمبر …ء بھوپال کلاں کو تاریخ حاضری سے م۔ غلام حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور مقرر کیا گیا۔

" — ج۔ عزیز حسین بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (۲۵۰ — ۳۵۵) انگریزی مدرس گورنمنٹ

ہائی اسکول بھالیہ کو ن۔عبدالسلام انصاری کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول بھوچال کلاں مقرر کیا گیا۔

ر م۔فضل کریم بی۔ اے۔بی۔ٹی (۲۵۰ - ۳۵۰) صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول راجن پور کو م۔غفور اللہ لودھی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر صدر معلم گورنمنٹ نارمل اسکول کمالیہ مقرر کیا گیا۔

ر م۔غلام حسین۔ ایم اے۔بی۔ٹی (۲۰۰ - ۳۰۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول راجن پور کو م۔فضل کریم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول راجن پور مقرر کیا گیا۔

ر پیرزادہ محمد بخش بی۔ اے۔بی۔ٹی (۲۵۰ - ۳۵۵) اے۔ڈی۔آئی کیمبل پور کو ش محمد سلیم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ مقرر کیا گیا۔

ر م۔ظفر عالم ایم۔ اے۔بی۔ٹی (۲۵۰ - ۳۵۵) اے۔ڈی۔آئی۔گوجرانوالہ کو م۔خالد الحسن کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول کروڑ پکا مقرر کیا گیا۔

ای/۱۱۳۱۴ — ۹ دسمبر ۱۹۵۴ء م۔مسعود بیگ مرزا۔ ایم۔اے۔بی۔ٹی (پی۔ای۔ایس دوم) (آزمائشی) صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں کو م۔بشیر احمد شبلی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ۲۲ نومبر ۱۹۵۴ء قبل دوپہر سے صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور مقرر کیا گیا۔

ای/۲۲۴۶۶ — ۱۸ دسمبر ۱۹۵۴ء م۔عبدالرحمان (۶۰ - ۱۴۰) معلم عربی گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ کو م۔برکت علی کی جگہ جو یکم جنوری ۱۹۵۵ء کو سبکدوش ہونے والے ہیں ۳ جنوری ۱۹۵۵ء یا مابعد کی تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر معلم عربی گورنمنٹ ہائی اسکول سیالکوٹ مقرر کیا گیا۔

ر م۔غلام حسین (۶۰ - ۱۴۰) معلم عربی گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں کو م۔عبدالرحمان کی جگہ

جن کا تبادلہ ہو چکا ہے، تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر معلم عربی گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ عبدالرحمان (۶۰ — ۱۴۰) معلم عربی گورنمنٹ ہائی اسکول کہوٹہ کو م۔ غلام حسن کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر معلم عربی گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ حاجی محمد سندھی ایک امیدوار کو م۔ عبدالخالق کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (۶۰ — ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۶۰/- روپے ماہوار پر قائم مقام معلم عربی گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں مقرر کیا گیا۔

ای/۳/۷۰۷-۴۴ ۱۴ دسمبر ۱۹۴۳ء م۔ عبدالرؤف۔ میٹرک ایس۔ وی۔ ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ عبدالکریم کی جگہ جن کی تقرری ہوئی تھی لیکن حاضر نہیں ہوئے (۶۰ — ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ پور صدر مقرر کیا گیا۔

ای/۵/۷۰۵-۴۴ ۱۴ دسمبر ۱۹۴۳ء ش۔ فقیر محمد پی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) قائم مقام ورزش ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول پسرور کو ج۔ غلام علی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر قائم مقام ورزش ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول نارووال مقرر کیا گیا۔

〃 ج۔ غلام علی میٹرک پی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) قائم مقام ورزش ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول نارووال کو ش۔ فقیر محمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر قائم مقام ورزش ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول پسرور مقرر کیا گیا۔

ای/۱۲۱/۱۱-۴۴ ۷ دسمبر ۱۹۴۳ء م۔ نثار احمد خاں بی اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) اے۔ ڈی۔ آئی لائل پور کو م۔ محمد سعید اختر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اے۔ ڈی۔ آئی مدارس جھنگ مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ محمد سعید اختر۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) اے۔ ڈی۔ آئی مدارس جھنگ کو م۔ نثار احمد خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اے۔ ڈی۔ آئی مدارس لائل پور

مقرر کیا گیا۔

ای/۹۵۰۱۲ م۔ محمد شفیق میٹرک بی۔ ٹی ایک امیدوار کو م۔ علاؤالدین کی جگہ جو سبکدوش ہو گئے ہیں۔ ۲۶ دسمبر ۵۳ء تاریخ حاضری سے (۶۰ ۔ ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں قائم مقام ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری مقرر کیا گیا۔

ای/۳۳۹۰۳ م۔ عبدالغنی جمیل۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ۔ ۲۵۰) اے۔ ڈی۔ آئی مدارس لاہور کو ۴ دسمبر ۵۳ء م۔ عبدالمجید قریشی کی جگہ جو صدر معلم چونیاں مقرر ہو چکے ہیں تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اے۔ ڈی۔ آئی مدارس گوجرانوالہ مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ کرم الٰہی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ۔ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور کو م۔ عبدالغنی جمیل کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اے۔ ڈی۔ آئی۔ مدارس لاہور مقرر کیا گیا۔

〃 سچ۔ ریاض احمد بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ایک امیدوار کو م۔ کرم الٰہی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے (۱۳۰ ۔ ۲۵۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۱۳۰/- روپے ماہوار پر قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور مقرر کیا گیا۔

ای/۲۷۰۷۴ م۔ غلام جیلانی مخدوم۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ۔ ۲۵۰) اے۔ ڈی۔ آئی۔ مدارس جہلم ۲ دسمبر ۵۳ء کو م۔ محمد سعید اختر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ محمد سعید اختر۔ بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (۱۳۰ ۔ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا کو م۔ غلام جیلانی مخدوم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اے۔ ڈی۔ آئی مدارس جہلم مقرر کیا گیا۔

ای/۶۲۲۰۴ م۔ محمد علی۔ میٹرک۔ ایس وی (۶۰ ۔ ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول فتح جنگ یکم دسمبر ۵۳ء (آزمائشی) کو م۔ سعید محمد کی جگہ جو ۵ دسمبر ۵۳ء کو سبکدوش ہونے والے ہیں تاریخ حاضری سے

اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم (آزمائشی) مقرر کیا گیا۔

" م۔ بسعید رسول ایس۔ وی ایک امیدوار کو م۔ محمد علی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے (۶۰ ــ ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول فتح جنگ مقرر کیا گیا۔

ای/۴۰۴/۷۰ ش۔ محمد طاہر بی۔ اے بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کروڑ پکا ۳ نومبر ۵۳ء کو م۔ ممتاز احمد خان گورمانی کی جگہ جن کا تبادلہ شعبہ کالج میں ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اے۔ ڈی۔ آئی۔ مدارس مظفر گڑھ مقرر کیا گیا۔

" م۔ اصغر علی۔ بی۔ ایس۔ سی۔ بی۔ ٹی ایک امیدوار کو ش۔ محمد طاہر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (۱۳۰ ــ ۲۵۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۱۳۰/ روپے ماہوار پر قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کروڑ پکا مقرر کیا گیا۔

شعبہ مدارس ــــــــــ صیغہ نساء

ڈبلیو/۱۵۰۴/۱۲ مس رفیعہ سلطانہ ایم اے۔ بی ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول ڈسکہ کو بمع اپنی آسامی عارضی طور پر تاریخ حاضری سے نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول ۳ دسمبر ۵۳ء چونے منڈی لاہور (آزمائشی) مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۱۴۴۰۲/۱۲ مس بس حسن بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ایک امیدوار کو مسز زہرہ عصمت اللہ کی جگہ جو مستعفی ہو چکی ۲۴ دسمبر ۵۳ء ہیں ۱۱ نومبر ۵۳ء قبل دوپہر سے (۱۳۰ ــ ۲۵۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۱۳۰/ روپے ماہوار پر قائم مقام نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول راوی روڈ لاہور مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۱۴۹۷۴/۱۲ مس دل شاد عبید اللہ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) اے۔ ڈی آئی مدارس ملتان کو مسز ۳ دسمبر ۵۳ء ک۔ بسعید اختر کی جگہ جن کو رخصت دی جا چکی ہے ۷ دسمبر ۵۳ء قبل دوپہر سے ۷۵ ــ ۲۰۰ کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۷۵/ روپے ماہوار پر ڈسٹرکٹ انسپکٹرس مدارس ملتان مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۸۰۳۰۲۰۴ مس یس۔ ڈومرا ججے۔ اے۔ وی (۶۰ ـ ۱۴۰) اردو معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول
۱۶ دسمبر ۵۴ء ٹوبہ ٹیک سنگھ کو مس صغرا عزیز کی جگہ جن کو ۹ اکتوبر ۵۴ء سے ۳۰ اپریل ۵۵ء تک
رخصت دی جاچکی ہے تاریخ حاضری سے ۷۵ ـ ۱۵۰ کے پیمانہ تنخواہ میں نائب معلمہ زنانہ
گورنمنٹ ہائی اسکول خانے وال مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۲۰۱۲۰۴ مس یس علاء الدین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ـ ۲۵۰) نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول
مری کو مسز ق۔ ملک کی جگہ جن کو رخصت دی جاچکی ہے ۲۲ ستمبر ۵۴ء سے اپنی تنخواہ پر
قائم مقام صدر معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول مری مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۸۷۰۲۰۴ استانی سردار بیگم ایس۔ وی (۶۰ ـ ۱۴۰) اردو معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول سرگودھا
۱۴ دسمبر ۵۴ء استانی اکبری بیگم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اردو معلمہ
گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول چیچا وطنی مقرر کیا گیا۔

〃 استانی مرتضےٰ بیگم ایس۔ وی اردو معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول سرگودھا کو استانی ش
بشیر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اردو معلمہ گورنمنٹ
زنانہ ہائی اسکول شاہ پور صدر مقرر کیا گیا۔

〃 مسز ع۔ ف۔ بشیر۔ ایس۔ وی۔ اردو معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول شاہ پور صدر کو استانی
مرتضےٰ بیگم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اردو معلمہ
گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول سرگودھا مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۱۰۱۰۲۰۴ مس غلام فاطمہ الٰہی بخش بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ـ ۲۵۰) نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ
۱۴ دسمبر ۵۴ء ہائی اسکول خانیوال کو مسز خ ملک کی جگہ جن کو رخصت دی جاچکی ہے یکم دسمبر ۵۴ء
سے ۱۹ دسمبر ۵۴ء اپنی تنخواہ پر صدر معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول خانیوال مقرر

ڈبلیو/۴۸/۱۸۰۴ مس نسیم خانم ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی ایک امیدوار کو مس رضیہ سلطانہ احمد علی کی جگہ جن کا
۱۳ دسمبر ۵۴ء ہو چکا ہے۔ ۳ نومبر ۵۴ء قبل دوپہر سے ۱۳۰ ـ ۲۵۰ کے عام پیمانہ تنخواہ۔

ڈبلیو/۲۲۸۱م ماہوار پر قائم مقام نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اور نارمل اسکول ڈیرہ غازی خان مقرر کیا گیا۔

" مس خالدہ خانم ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اور نارمل اسکول ڈیرہ غازی خان کو مس شمیم اختر کی جگہ جو مستعفی ہو چکی ہیں۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر قائم مقام نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول گجرات مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۸۸۸۱م مس سعیدہ قریشی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۷۵) نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اور نارمل ۱۳ دسمبر ۱۹۵۳ء اسکول میاں والی کو بمع اپنی آسامی تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول اکال گڑھ (آزمائشی) مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۱۷۲۹م مس حمیدہ بانو جے۔ اے۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) اردو معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول لالہ موسیٰ کو ۱۱ دسمبر ۱۹۵۳ء مس ڈی۔ ایم حسن کی جگہ جو مستعفی ہو چکی ہیں۔ تاریخ حاضری سے ۷۵ — ۱۲۰ کے عام پیمانہ تنخواہ میں نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول چکوال مقرر کیا گیا۔

" مس شمشاد سلطانہ اورک زئی جے۔ اے۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) اردو معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول گوجرانوالہ کو مسز ح۔ م ربانی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (۷۵ — ۱۲۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اور نارمل اسکول کیمبل پور مقرر کیا گیا

ڈبلیو/۱۷۶۱م مس صفیہ علاء الدین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول ۱۱ دسمبر ۱۹۵۳ء مری کو مسز ح۔ اکرم کی جگہ جو چھٹی پر ہیں اور پاکستان سے باہر گئی ہوئی ہیں۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر صدر معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول نوشہرہ مقرر کیا گیا۔

" مس بلقیس پروین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۷۵) نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول گجرات (آزمائشی) کو مس صفیہ علاء الدین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول مری (آزمائشی) مقرر کیا گیا۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

اموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دوھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئیے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - اشتہاری معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اموزش

۷ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

شمارہ ۱۱] لاهور [فروری ۱۹۵۵

اس شمارہ میں

مدیر تحریر { پروفیسر سراج الدین
ایم ۔ اے ۔ مخدومی

معاونین { عبدالغفور چودھری
فضل احمد

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

فروری سنہ ۱۹۵۵ء

جلد ———— ۷

شمارہ ———— ۱۱

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

ایچ۔ ڈی۔ خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

اداریہ

ایم۔ اے۔ مخدومی

پچھلے دسمبر میں لارڈ منٹگمری نے کولمبیا یونیورسٹی میں چند لیکچر دیے تھے، جن کا موضوع تھا "رہنماؤں کی تربیت" ان تقریروں میں خاص زور اس نکتے پر دیا گیا تھا کہ جنگ میں جس طرح فوج کی کامیابی کا بیشتر مدار فوجی رہنماؤں کی قابلیت پر ہوتا ہے، بالکل اسی طرح موجودہ ٹیکنیکل دور میں کوئی معاشرہ اچھے رہنماؤں کے بغیر آبرومند زندگی نہیں گزار سکتا۔ آج ہر معاشرے کو سب سے پہلی فکر یہ ہونی چاہیے کہ مستقبل کے رہنماؤں کی موزوں تربیت کرے۔ رہنماؤں سے مراد مستقبل کے وہ شہری ہیں جو سائنس، علوم و فنون، تجارت، صنعت وغیرہ میں کلیدی حیثیت اختیار کرنے والے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی بچوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ہر شہری کو پوری تعلیمی ترقی کا حق ہونا چاہیے لیکن تمام بچوں کی تعلیم و تربیت کی خاطر مستقبل کے کلیدی لوگوں کی تربیت سے غفلت نہ برتنی چاہیے۔

ان خیالات میں ہمارے لیے کئی مفید اشارے موجود ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں تعلیم کی ہر سطح پر طالب علموں کی تعداد میں جو بھاری اضافہ ہوا ہے، اس کی رفتار غالباً کئی سالوں تک کم نہ ہوگی۔ ایک آزاد جمہوری ملک میں بنیادی تعلیم ہر شہری کا پیدائشی حق ہونا چاہیے، اس لیے مدرسے کے دروازے کسی پر بند نہیں کیے جا سکتے، مدرسے کی تعلیم کو کسی طرح محدود یا مخصوص نہیں کیا جا سکتا لیکن اس جائز عوامی حق کی دھن میں ہمیں اس اہم قومی ضرورت کو بھول نہ جانا چاہیے جس کی طرف لارڈ منٹگمری نے اشارہ کیا ہے۔ ہمارے مدرسوں میں بھیڑ اس قدر بڑھ چکی ہے، کہ غیر معمولی ذہانت کے طلبہ کے نظر انداز کیے جانے کا حقیقی خطرہ پیدا ہو گیا ہے، پہلے استاد ہوتا تھا،

شاگردوں کو جو خاص الخاص توجہ دیتے تھے وہ تیزی سے کم ہوتی جارہی ہے۔ تعلیمی معیاروں کے انحطاط کی جو شکایات عام سننے میں آتی ہیں، ہمارے خیال میں اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ایسے مدرسوں کی تعداد گھٹتی جارہی ہے جو ہونہار طالب علموں کو الگ توجہ دینے کا بندوبست کرتے ہوں۔

ایک بیدار اور فہمیدہ رائے عامہ مؤثر جمہوری زندگی کی پہلی شرط ہے، یہ بیداری اور فہم، تعلیم کو عام کیے بغیر ممکن نہیں، عام تعلیم ہی بنیادی شہری آزادیوں کا سچا تصور اور اس کے ساتھ دل بستگی پیدا کر سکتی ہے، اس اعتبار سے زیادہ بچوں کا مدرسوں میں آنا ہمارے قومی مستقبل کے لیے ایک نیک فال ہے۔ ہجوم طلبہ کے باوجود ہم ابھی عام تعلیم کے نصب العین سے بہت پیچھے ہیں دیہاتی رقبوں میں بچوں کی بھاری تعداد اب تک مدرسوں سے باہر ہے۔ ہمیں ان تمام بچوں کو مدرسوں میں لانا ہوگا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مدرسوں میں تعداد طلبہ آئندہ کئی سالوں تک لگاتار بڑھتی جائے گی عام تعلیم ایک ناگزیر قومی ضرورت ہے۔ جسے بہر صورت پورا کرنا چاہیے، مگر اسی قدر اہم بلکہ اس سے بھی اہم تر قومی ضرورت کے اچھی طرح پورا نہ ہونے کا جو خطرہ اس وقت موجود ہے ہم یہاں اس کی طرف صرف اشارہ کر سکتے ہیں۔ سائنسی اور ٹکنیکل دور میں اس ضرورت سے تغافل برتنے کے نتائج بڑے افسوس ناک ہو سکتے ہیں، اس خطرے کے سد باب کی ایک صورت یہ ہے کہ نئے مدرسے اتنی بھاری تعداد میں کھل جائیں کہ طلبہ کی بھیڑ کا خاتمہ ہو جائے، ہمارے مالی ذرائع غالباً کئی سالوں تک اس امر کی اجازت نہیں دیں گے۔ موجودہ حالات میں زیادہ قابل عمل صورت یہ ہے کہ مدرسے اپنی پرانی روایات کو پھر سے زندہ کریں اور ہونہار طالب علموں کے لیے خاص توجہ کا اہتمام کریں، موجودہ استاد اپنے پیش روؤں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے غیر معمولی ذہانت کے طلبہ کا کھوج لگانے اور انہیں بلند سے بلند ذہنی کمال تک پہونچانے کو زندگی کی سب سے بڑی کامیابی خیال کریں، موجودہ حالات میں یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔

باشعور بات چیت کا فن

فضل احمد

راقم کو حال ہی میں جغرافیہ اور تاریخ کے کچھ سبق دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان سبقوں کے موضوع بے حد دل کش تھے کیوں کہ ان کا تعلق انسانی زندگی کی ہوش ربا کہانی اور نگار خانۂ قدرت کے سحر نما کرشموں سے تھا۔ لیکن اکثر صورتوں میں متعلم استادوں نے ان سبقوں کو ایسے پھیکے رنگ میں پیش کیا کہ طالب علموں میں کوئی خاص سرگرمی پیدا نہ کی جا سکی، ان سبقوں کی تیاری عموماً اچھی احتیاط سے کی گئی تھی۔ متعلم استادوں کو نفسِ مضمون پر خاصا عبور حاصل تھا، ضروری نقشے اور تصویریں موجود تھیں لیکن یہ چیزیں خاطر خواہ کام نہ دے سکیں۔ وجہ صرف یہ تھی کہ متعلم اساتذہ بات چیت کے فن سے بے خبر تھے، وہ لگاتار تقریر کر سکتے تھے لیکن باشعور بات چیت کا ڈھنگ نہیں جانتے تھے۔

ایک بنیادی نکتہ | علم کی تحصیل میں بات چیت کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ایک عام انسان اپنی زندگی کے بیش تر تجربات ورمشاہدات اسی کے ذریعے بیان کرتا ہے اور اکثر حالتوں میں اسی کی مدد سے معلومات اخذ کرتا ہے بچے ا سب سے پہلی درس گاہ اس کا گھر ہے۔ یہاں وہ تمام اسباق بات چیت ہی کی مدد سے سیکھتا ہے ب وہ سیانا ہوتا ہے اور اس کی وفاداریوں کا دائرہ گھر کی حدوں کو پھاند کر زیادہ وسعت اختیار رنے لگتا ہے تو مدرسہ کو چھوڑ کر باقی تمام صورتوں میں زیادہ تر بات چیت ہی اخذ معلومات اور نگی فہم کا ذریعہ بنتی ہے۔

بات چیت اور دوسری قسم کے تقریری بیانوں میں سب سے نمایاں فرق کیا ہے، یہ فرق ں کے سوا اور کچھ نہیں کہ بات چیت پورے طور پر غیر رسمی ماحول میں ہوا کرتی ہے، جب کہ تقریر کی سری قسموں کے ساتھ کچھ نہ کچھ تکلف وابستہ رہتا ہے۔ بات چیت میں شریک ہونے والوں کو

کسی جذباتی تناؤ یا ذہنی بوجھ کا ہرگز احساس نہیں ہوتا، وہ کمال اطمینان اور بے تکلفی سے اپنے خیالات کو ظاہر کیے جاتے ہیں، ان کے دل گویا ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو جاتے ہیں کہ کوئی باہمی بُعد محسوس نہیں ہوتا۔ ان دلوں کو ایک دوسرے کی اجنبیت کا احساس تک نہیں ہونے پاتا دلوں کا یہ باہمی قرب گفتگو میں بے ساختہ پن اور قدرتی بہاؤ پیدا کرتا ہے، ذہنی اور جذباتی کھچاوٹ سے پیدا ہونے والی ساری رکاوٹیں ختم ہو جاتی ہیں اور دلوں کی اثر پذیری کے لیے نہایت عمدہ سامان پیدا ہو جاتا ہے۔

اگر بات چیت کو آمد کا درجہ دیا جائے تو تقریر کی دوسری شکلیں آورد کی حیثیت رکھیں گی۔ فنِ خطابت کے اکثر ماہروں میں بلا کی روانی ہوتی ہے۔ ایک بڑے مجمع کی جذباتی اکساہٹ ان کے ذہن و دماغ کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے اور ان کے خیالات کی گرمی الفاظ کا جامہ پہن کر ایک موسلا دھار لفظی بارش کی شکل اختیار کر لیتی ہے، لیکن اس ضمن میں یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ یہ صورت حال شبانہ روز کے معمول سے ہٹی ہوئی صورت ہے۔ معمول سے یہ انحراف ہی مقرر کے جذبات پر مشعلہ کا کام کرتا ہے اور انہیں آتشیں لاوا کی شکل میں بہ نکلنے پر مجبور کرتا ہے، لیکن اس ساری روانی اور تیزی کے باوجود مقرر کو اس غیر معمولی جذباتی کھچاوٹ کا احساس ضرور ہوتا ہے جو اسے مشعلہ نوائی پر ابھارتی ہے۔ اسی طرح مباحثہ، مناظرہ، لکچر اور تقریر کی دوسری شکلوں میں بھی یہ لینے والے کو مصنوعی صورت حال کا کچھ نہ کچھ احساس ضرور رہتا ہے، لیکن بات چیت میں کسی قسم کی بناوٹ کا شائبہ تک پاس سے نہیں گزرتا، خیالات کا تبادلہ ایسے بے ساختہ انداز میں ہوتا ہے جیسے کوئی خاص بات ہے ہی نہیں۔

بات چیت کا یہ بے ساختہ پن بے اندازہ تعلیمی افادیت رکھتا ہے، بچہ گھر کی دنیا سے نکل کر جب مدرسے کی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اس کے سامنے سب سے بڑی دقت مدرسہ کے ماحول کا تصنع ہوتا ہے، یہاں اسے اکثر ایسی چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے جو اس کے نقطۂ نگاہ سے بناوٹی اور غیر حقیقی ہوتی ہیں، مدرسہ اپنے ماحول کی اس کمی کو کلی طور پر دور نہیں کر سکتا وہ

ب اتنا کر سکتا ہے کہ اپنے بناوٹی ماحول کو زندگی سے زیادہ سے زیادہ قریب لانے کی کوشش
ے، دورِ حاضر کے طریقہ ہائے تدریس اسی ایک بات پر سارا زور صرف کرتے ہیں۔

تدریس میں بات چیت کا طریق جو زندگی پیدا کر سکتا ہے اس کے متعلق اب غالباً کچھ زیادہ
نے کی ضرورت نہیں لیکن بات چیت کے لیے پہلی ضروری شرط طرفین کے تکلم میں بے ساختہ پن کا
نا ہے۔ بات چیت ہمیشہ ایک سے زیادہ آدمیوں کے درمیان ہو سکتی ہے، جماعت میں بات چیت
طریق اختیار کیا جائے گا تو گفتگو استاد اور طالب علموں کے درمیان ہوگی۔ لیکن ہمارے بنیادی
وضع کے مطابق یہ چیز اسی وقت ممکن ہے جب استاد ہر طالب علم کے ساتھ فرداً فرداً ذہنی یگانگت
ا کر سکے تاکہ کوئی طالب علم اپنے دل پر کسی قسم کا بوجھ محسوس کیے بغیر جب چاہے بے جھجک بات
سکے۔ جماعت میں ایسا اجازت دہ اور محرک ماحول پیدا کرنا استاد کا پہلا کام ہونا چاہیے۔ مگر کامیابی
ساتھ ایسا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ استاد کے اپنے دل پر کسی قسم کا کوئی بوجھ نہ ہو۔ وہ ہر طرح
جذباتی تناؤ سے آزاد ہو، وہ جماعت میں کچھ یوں محسوس کرے جیسے گھر میں یا دوستوں کی مجلس
بیٹھا ہو۔ باقی کاموں کی طرح بات چیت کے معاملے میں بھی استاد کی اپنی مثال ہی کارگر ثابت ہوگی
کی نگاہ افرادِ جماعت کی طرف گھومتی رہنی چاہیے اور اسے مختلف افراد کے ذہنی اور جذباتی ردِ عمل
بھی ہمدردانہ نظر رکھنی چاہیے کہ ہر ایک کو یہی گمان ہو کہ استاد کے الفاظ اسے مخاطب کر کے کہے جا رہے
ہاں ایسے اسباق جہاں تقریری بیان ناگزیر نظر آئے (مثلاً تاریخ، جغرافیہ، علم و ادب وغیرہ) وہاں
چیت کا طریقہ ہی اختیار کرنا چاہیے۔ لیکچر یا بحث و تمحیص کا طریقہ بیانیہ طالب علموں کے ساتھ
بہ ہو سکتا ہے۔ مدرسوں کے بچوں کے لیے یہ بہت کم صورتوں میں حسبِ حال ہوگا۔

مہارتیں

جو لوگ استاد بننے کے لیے تربیتی درس گاہوں کا رخ کرتے ہیں وہ پہلے متواتر
کئی سالوں تک عام نوعیت کی وسیع المشرب تعلیم حاصل کر چکے ہوتے ہیں، اس
المشرب تعلیم کو دوسرے مقاصد کے ہمراہ یہ کوشش بھی کرنی چاہیے کہ نوجوانوں میں مندرجہ ذیل
مہارتیں ضرور پیدا کرے، یہ مہارتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور ان کی نوعیت اس قدر

کسی جذباتی تناؤ یا ذہنی بوجھ کا ہرگز احساس نہیں ہوتا، وہ کمال اطمینان اور بے تکلفی سے اپنے خیالات کو ظاہر کیے جاتے ہیں۔ ان کے دل گویا ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو جاتے ہیں کہ کوئی باہمی بُعد محسوس نہیں ہوتا۔ ان دلوں کو ایک دوسرے کی اجنبیت کا احساس تک نہیں ہونے پاتا۔ دلوں کا یہ باہمی قرب گفتگو میں بے ساختہ پن اور قدرتی بہاؤ پیدا کرتا ہے۔ ذہنی اور جذباتی کھچاوٹ سے پیدا ہونے والی ساری رکاوٹیں ختم ہو جاتی ہیں اور دلوں کی اثر پذیری کے لیے نہایت عمدہ سامان پیدا ہو جاتا ہے۔

اگر بات چیت کو آمد کا درجہ دیا جائے تو تقریر کی دوسری شکلیں آورد کی حیثیت رکھیں گی۔ فنِ خطابت کے اکثر ماہروں میں بلا کی روانی ہوتی ہے۔ ایک بڑے مجمع کی جذباتی اکساہٹ ان کے ذہن و دماغ کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے اور ان کے خیالات کی گرمی الفاظ کا جامہ پہن کر ایک موسلا دھار لفظی بارش کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن اس ضمن میں یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ یہ صورت حال شبانہ روز کے معمول سے ہٹی ہوئی صورت ہے۔ معمول سے یہ انحراف ہی مقرر کے جذبات پر مشعل کا کام کرتا ہے اور انہیں آتشیں لاوا کی شکل میں باہر نکلنے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن اس ساری روانی اور تیزی کے باوجود مقرر کو اس غیر معمولی جذباتی کھچاوٹ کا احساس ضرور ہوتا ہے جو اسے مشتعل تو انائی پر ابھارتی ہے۔ اسی طرح مباحثہ، مناظرہ، لیکچر اور تقریر کی دوسری شکلوں میں بھی یہ لینے والے کو مصنوعی صورت حال کا کچھ نہ کچھ احساس ضرور رہتا ہے۔ لیکن بات چیت میں کسی قسم کی بناوٹ کا شائبہ تک پاس سے نہیں گذرتا۔ خیالات کا تبادلہ ایسے بے ساختہ انداز میں ہوتا ہے جیسے کوئی خاص بات ہے ہی نہیں۔

بات چیت کا یہ بے ساختہ پن بے اندازہ تعلیمی افادیت رکھتا ہے۔ بچہ گھر کی دنیا سے نکل کر جب مدرسے کی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اس کے سامنے سب سے بڑی دقت مدرسہ کے ماحول کا تصنع ہوتا ہے۔ یہاں اسے اکثر ایسی چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے جو اس کے نقطہ نگاہ سے بناوٹی اور غیر حقیقی ہوتی ہیں۔ مدرسہ اپنے ماحول کی اس کمی کو کلی طور پر دور نہیں کر سکتا وہ

صرف اتنا کر سکتا ہے کہ اپنے بناوٹی ماحول کو زندگی سے زیادہ سے زیادہ قریب لانے کی کوشش
کرے، دورِ حاضر کے طریقہ ہائے تدریس اسی ایک بات پر سارا زور صرف کرتے ہیں۔

تدریس میں بات چیت کا طریق جو زندگی پیدا کر سکتا ہے اس کے متعلق اب غالباً کچھ زیادہ
کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن بات چیت کے لیے پہلی ضروری شرط طرفین کے تکلم میں بے ساختہ پن کا
ہونا ہے۔ بات چیت ہمیشہ ایک سے زیادہ آدمیوں کے درمیان ہو سکتی ہے۔ جماعت میں بات چیت
کا طریق اختیار کیا جائے گا تو گفتگو استاد اور طالب علموں کے درمیان ہوگی۔ لیکن ہمارے بنیادی
مفروضہ کے مطابق یہ چیز اسی وقت ممکن ہے جب استاد ہر طالب علم کے ساتھ فرداً فرداً ذہنی یگانگت
پیدا کر سکے۔ تاکہ کوئی طالب علم اپنے دل پر کسی قسم کا بوجھ محسوس کیے بغیر جب چاہے بے جھجک بات
کر سکے۔ جماعت میں ایسا اجازت دہ اور محرک ماحول پیدا کرنا استاد کا پہلا کام ہونا چاہیے۔ مگر کامیابی
کے ساتھ ایسا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ استاد کے اپنے دل پر کسی قسم کا کوئی بوجھ نہ ہو۔ وہ ہر طرح
کے جذباتی تناؤ سے آزاد ہو۔ وہ جماعت میں کچھ یوں محسوس کرے جیسے گھر میں یا دوستوں کی مجلس
میں بیٹھا ہو۔ باقی کاموں کی طرح بات چیت کے معاملے میں بھی استاد کی اپنی مثال ہی کارگر ثابت ہوگی
اس کی نگاہ افرادِ جماعت کی طرف گھومتی رہنی چاہیے اور اسے مختلف افراد کے ذہنی اور جذباتی ردِعمل
پر ایسی ہمدردانہ نظر رکھنی چاہیے کہ ہر ایک کو یہی گمان ہو کہ استاد کے الفاظ اسے مخاطب کر کے کہے جا رہے
ہیں۔ ایسے اسباق جہاں تقریری بیان ناگزیر نظر آئے (مثلاً تاریخ، جغرافیہ، علم و ادب وغیرہ) وہاں
بات چیت کا طریقہ ہی اختیار کرنا چاہیے۔ لیکچر یا بحث و تمحیص کا طریقہ سیانے طالب علموں کے ساتھ
مفید ہو سکتا ہے۔ مدرسوں کے بچوں کے لیے یہ بہت کم صورتوں میں حسبِ حال ہوگا۔

چار مہارتیں

جو لوگ استاد بننے کے لیے تربیتی درس گاہوں کا رخ کرتے ہیں وہ پہلے متواتر
کئی سالوں تک عام نوعیت کی وسیع المشرب تعلیم حاصل کر چکے ہوتے ہیں، اس
وسیع المشرب تعلیم کو دوسرے مقاصد کے ہمراہ یہ کوشش بھی کرنی چاہیے کہ نوجوانوں میں مندرجہ ذیل
چار مہارتیں ضرور پیدا کرے۔ یہ مہارتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور ان کی نوعیت اس قدر

بنیادی ہے کہ انہیں مضامین امتحان سے زیادہ ضروری سمجھنا چاہیے جو وسیع المشرب تسلیم ان مہارتوں کے بارے میں ناکام رہتی ہے وہ فی الحقیقت اپنی نہائی اغراض کے پورا کرنے میں کام یاب نہیں ہوتی، ذیل میں ان چہارگانہ مہارتوں کا مختصر سا بیان دیا جاتا ہے۔

(۱) لسانی منطقی مہارت: اس سے مطلب یہ ہے کہ انسان ہر موضوع پر صاف ذہن کے ساتھ سوچ بچار کر سکے۔ اسے ان لسانی ذرائع، تفکر و بیان اور اظہار پر اچھی طرح قدرت حاصل ہو، جو انسان نے اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے کے لیے وضع کر رکھے ہیں، اس میں مادری زبان بھی شامل ہوگی اور غیر ملکی زبانیں بھی، اس میں ریاضی کی علامتیں اور اصطلاحات بھی شامل ہوں گی، اور سائنس اور ٹکنالوجی کی زبان اور اصطلاحات بھی۔ لسانی منطقی مہارت کو ایک ساتھ اس لیے لیا گیا ہے کہ یہ دراصل ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں، ایک کا وجود دوسرے کے بغیر ممکن نہیں، جب تک الفاظ و علامات پر پوری قدرت نہ ہو، اس وقت تک تفکر اور تدبّر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اسی طرح جو شخص صاف ذہن کے ساتھ سوچ نہ سکتا ہو اس کا بیان کبھی موثر نہ ہوگا، لسانی مہارت اور منطقی قابلیت پہلو بہ پہلو متوازی چلتی ہیں۔

(۲) حق پسندی: اس سے مراد واقعات کو گہری اور بے لاگ نگاہ سے دیکھنے، جمع کرنے، پرکھنے اور منظم کرنے کی صلاحیت ہے، اس مہارت کے لیے ایک ضروری شرط یہ ہے کہ حقیقت اور سچائی کے ساتھ بے پناہ لگاؤ موجود ہو، حق پسندی کا یہ جذبہ ہر قسم کے مشاہدات۔ تجربات نظریات اور معتقدات پر غالب رہنا چاہیے۔

(۳) معیار پسندی: اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی تمام اقدار کے متعلق ایک لطیف احساس پذیری موجود ہو تاکہ اخلاقی۔ جمالیاتی۔ ذاتی۔ معاشرتی و دینی اور دنیاوی معاملوں میں پوری پختہ کاری اور بلند نگاہی کے ساتھ موزوں رویہ اختیار کیا جائے، اس صلاحیت کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ تمام حقیقی اقدار کا صحیح تصوّر کیا جا سکے۔ اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکے۔

(۴) وسیع ظرفی: اس سے مراد یہ ہے کہ انسان ہر قسم کی تنگ نظری سے اونچا ہوتا جاتا ہو، وہ اپنی ذات اور اپنی ہر چیز کو ایک وسیع تر پس منظر میں سوچنا جانتا ہو وہ ساری زندگی کو ایک ہمہ گیر وحدت کی شکل میں دیکھ سکتا ہو۔

ایک صحت مند وسیع المشرب تعلیم ان چہارگانہ اوصاف کو پیدا کرے گی، وہ واقعات وحقائق سے باخبر بھی کرے گی، حق پسندی کا جذبہ بھی پیدا کرے گی، واقعات کی بے لاگ چھان بین اور سائنسی تعمیم کا ڈھنگ بھی سکھائے گی، قلب میں وسعت اور نگاہ میں گہرائی بھی پیدا کرے گی اور خیالات و افعال کے لیے ایک کائناتی پس منظر بھی پیدا کرے گی، اگرچہ نصاب کے ہر مضمون کو یہ اوصاف پیدا کرنے چاہییں۔ لیکن ہر مضمون ان میں سے بعض اوصاف کے ساتھ خاص طور پر مخصوص ہوگا۔

یہ اوصاف اور مہارتیں جمہوری طرز زندگی کے لیے اتنی اہم ہیں کہ ان کی ضرورت کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن یہاں اہم سوال یہ ہے کہ رسمی علمی تعلیم ان اوصاف کو کسی حد تک پیدا کر سکتی ہے۔ زیادہ واضح تر الفاظ میں یہ سوال یوں پوچھا جا سکتا ہے کہ کوئی استاد ان پسندیدہ اوصاف کو کس حد تک سکھا سکتا ہے؛ مثلاً ہم طالب علموں کو تاریخی واقعات پڑھا سکتے ہیں لیکن کیا انہیں ایک تنقیدی نگاہ اور حق پسندی بھی سکھا سکتے ہیں؛ ہم انہیں غالب اور اقبال کا کلام پڑھا سکتے ہیں۔ مگر کیا ان کے دلوں میں وہ سوز و گداز بھی پیدا کر سکتے ہیں جس سے ان شاعروں کا کلام بھرپور ہے۔ ہم انہیں سائنس کے تجربے کرنے سکھا سکتے ہیں مگر کیا ہم انہیں سائنسی انداز فکر بھی سکھا سکتے ہیں؟

اس سوال کا تفصیلی جواب تو آگے چل کر دیا جائے گا۔ یہاں صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ تدریس صرف علوم اور مہارتیں سکھا سکتی ہے، وہ قلب و نگاہ کی خوبیاں براہ راست عطا نہیں کر سکتی۔ یہ لطیف اوصاف و جذبات ایک دل سے دوسرے دل میں پراسرار طریق سے سرایت کیا کرتے ہیں وہ براہ راست دیے نہیں جا سکتے۔

بات چیت کا طریق بچہ زندگی کے ابتدائی سالوں میں بہت سی بنیادی مہارتیں اور معلومات

اخذ کرتا ہے، وہ یہ چیزیں غیر رسمی طور پر سیکھتا ہے۔ اسے یہ باتیں سکھانے کے لیے کوئی تقریریں نہیں کی جاتیں، بلکہ وہ یہ سب کچھ بات چیت کے ذریعہ سیکھتا ہے، دنیا کے بڑے بڑے اخلاقی معلّموں نے اگرچہ خطابت سے بھی کام لیا ہے، لیکن ان کی بہت سی تعلیمات۔ بات چیت ہی کے پیرائے میں پیش کی گئی تھیں۔ تدریس میں یہ طریقہ بڑی افادیت کا حامل ہے۔ تاکہ اس طریق کے مفہوم کے متعلق کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے۔ ہمیں پہلے اس کے مفہوم کی تعیین کر لینی چاہیے۔ بات چیت یا بحث وتمحیص کا طریق ایک آدمی کی تقریر اور تمام حاضرین کے شور وشغب کے بین بین کا راستہ ہے یہاں گروہ کے اکثر افراد (ضروری نہیں کہ سبھی افراد) بات چیت میں حصہ لیتے ہیں، اس بات چیت کی نمایاں خصوصیت وہ اجازت وہ ماحول ہے جس میں ہر فرد پورے سکون اور مکمل بے ساختگی کے ساتھ اپنے دل کی بات دوسروں کے سامنے رکھ دیتا ہے، یہ بات چیت اس ڈھنگ پر چلتی ہے کہ (۱) زیر بحث موضوع کے سارے گوشوں پر روشنی پڑتی جاتی ہے۔

(ب) ہر شخص موضوع زیر بحث کے متعلق زیادہ واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔

بات چیت کو موثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ گروہ بہت بڑا نہ ہو۔ عام طور پر دس سے بارہ افراد کا گروہ زیادہ حسب حال رہے گا، بعض اوقات اس سے چھوٹا یا بہت بڑا گروہ بھی بات چیت کا طریق استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے چابکدست رہنمائی کی ضرورت ہوگی۔

بات چیت میں حصّہ لینے والے تمام افراد بہت سے پسندیدہ ذہنی اطوار حاصل کر لیں گے۔ ان اوصاف پر تفصیلی بحث آگے آئے گی۔ بات چیت سے تعلیمی فوائد حاصل کرنے کے لیے بعض شرائط کا پورا ہونا لازمی ہے۔ ایسی بات چیت عام طور پر آدھ گھنٹہ سے ایک گھنٹہ تک جاری رہ سکتی ہے بعض اوقات یہ زیادہ وقت بھی لے سکتی ہے، اس تمام عرصہ میں بات چیت کا مرکزی موضوع صرف ایک ہی رہنا چاہیے، اگر موضوع ایک سے زیادہ ہوں تو بھی یہ مختلف موضوع باہم مربوط ہونے چاہئیں۔ اگر ایسا نہیں تو یہ بات چیت ایک عام قسم کی گفتگو سے بلند درجہ حاصل نہیں کر سکے گی اور اس سے کوئی تعلیمی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔

بات چیت کے طریقہ کی کامیابی کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ اس میں حصہ لینے والے پہلے سے موضوع کے متعلق کچھ نہ کچھ واقفیت رکھتے ہوں، وہ اس کے بنیادی مسائل کو سمجھتے ہوں اگر ایسا نہیں تو وہ چپ سادھے بیٹھے رہیں گے۔ بات چیت صرف استادہی کا حصہ بن کر رہ جائے گی، اگر وہ دوسروں کو اس میں شریک کرنے کے لیے سوال پوچھے گا تو بے خبری کے اعتراف کے سوا شاید اور کوئی جواب نہیں ملے گا، اس ضمن میں ایک اور خطرے سے آگاہ رہنا بھی ضروری ہے۔ بعض اوقات نوجوان طالب علم سطحی باتوں سے اپنی لاعلمی کو چھپانے میں کافی مہارت پیدا کر لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں بظاہر بات چیت بڑے جوش خروش کے ساتھ جاری دکھائی دیتی ہے۔ حالاں کہ حصہ لینے والوں کو معاملہ کے مختلف پہلوؤں کا کوئی صحیح ذہنی شعور نہیں ہوتا۔ ایسے بنیادی بحث و مباحثہ کو سر اٹھاتے ہی کچل دینا چاہیے اس کے بعض فوائد ناقابل انکار ہیں۔ لیکن جس بات چیت کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے، اس کی امتیازی خصوصیت اس کا غیر متحرک مرکزی نقطہ ہے جس کے متعلق پہلے سے سوجھ بوجھ پیدا کر لی گئی ہو۔ بات چیت کی ان دو شرطوں کو پورا کرنے کے لیے لازمی ہے کہ طالب علموں نے بتائی ہوئی کتابوں کے مطلوبہ حصوں کو اچھی طرح پڑھ لیا ہو، اور استاد میں یہ صلاحیت اور ہوشمندی موجود ہو کہ طلبا کی توجہ کو مناسب رہنمائی سے صرف مقررہ موضوع ہی پر جمائے رکھے، وہ یہ کام ڈرانے دھمکانے سے نہیں بلکہ تخلیقی رہنمائی کی مدد سے انجام دے۔

بات چیت کی رہنمائی کرنے والے ہر شخص کو جلدی ہی یہ نکتہ معلوم ہو جاتا ہے کہ طلبہ کے لیے صرف اسی قدر کافی نہیں کہ مقررہ موضوع کے متعلق سرسری مطالعہ کر آئیں۔ کچھ نہ پڑھنے سے یہ سرسری مطالعہ بھی بہتر ہوگا، لیکن بات چیت میں موثر حصہ لینے کے لیے جس قسم کے مطالعہ کی ضرورت ہے وہ اس سے الگ نوعیت کا ہے، بات چیت میں سوجھ بوجھ کے ساتھ حصہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ مقررہ صفحات کا مطالعہ گہری تنقیدی نگاہ سے کیا جائے۔ عبارت کے تمام الفاظ اور محاورات کا مطلب اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ مصنف کے دلائل اور اس کے اخذ کردہ نتائج کو

ایک ایک کر کے گنا جائے پھر اس استدلال کے متعلق ذہن میں جو سوالات اور شکوک پیدا ہوں انہیں نوٹ کر لیا جائے، جو نکات سمجھ میں نہ آئیں انہیں الگ لکھ لیا جائے۔ اس قسم کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے کہ ہر طالب علم کے پاس خود اپنی کتاب موجود ہو جس میں ضروری مقامات پر نشانات لگائے جا سکیں۔

جب طلبا یا کم از کم ان کی اکثریت ایسا مطالعہ کر کے آئے تو اب بات چیت کو صحیح راستے پر چلانا استاد کا کام ہے۔ اسے چاہیے کہ طالب علموں ہی میں سے کسی کو بات چھیڑنے دے جماعت کا کوئی طالب علم مسئلہ کے جس پہلو پر چاہے خیالات ظاہر کرے، دوسرے طالب علم اس کی رائے پر تبصرہ کریں اور مسئلہ کے اس پہلو پر اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالیں استاد کو چاہیے کہ اس بات چیت میں جہاں تک ہو سکے کم سے کم دخل دے، وہ دخل صرف اس وقت دے جب بات چیت کا رُخ اصل موضوع سے ہٹتا نظر آئے یا جب یہ رُخ مسئلہ کے ایک پہلو سے دوسرے پہلو کی طرف بدلنا مقصود ہو۔ اس طور پر معاملہ کے سارے پہلو ایک ایک کر کے گروہ کے سامنے آ جائیں گے، اور زیادہ تر گروہ کے افراد کی زبانی ان سب پر روشنی پڑتی جائے گی۔ تاآں کہ ان تمام پہلوؤں کے متعلق حقائق بیان ہو جائیں گے اور ان کا تجزیہ بھی ہو جائے گا۔ ایسی بات چیت جن گوناگوں تعلیمی فوائد کی حامل ہو گی ان کے متعلق کسی لمبی تشریح کی ضرورت نہیں۔

اوپر کی سطروں میں جس بات چیت کا خاکہ کھینچا گیا ہے وہ ایک مثالی بات چیت ہے۔ عام حالات میں شاید اس معیار پر پورا اترنا مشکل ہو۔ سچ یہ ہے کہ بہترین حالات میں بھی بہت کم استاد اس نمونہ کی پیروی کر سکتے ہیں۔ تقریر کر دینا بڑا آسان کام ہے۔ اس کی سہولت استاد کو بڑی آسانی سے پھسلا دیتی ہے اور وہ غیر محسوس طور پر تقریری بیان کو اختیار کرنے لگتا ہے طلبا سے پڑھا کر سننا اور بھی زیادہ سہل ہے۔ بلکہ یہ سراسر بچوں کا کھیل ہے۔ ہر گیا گذرا استاد بھی بچوں کی پڑھائی سن سکتا ہے۔ لیکن بات چیت کے طریقے کی دشواری کے باوجود

حقیقت یہ ہے کہ ایک معمولی درجے کی بات چیت بھی اچھی سے اچھی تقریر سے زیادہ تعلیمی فائدے رکھتی ہے۔ بشرطیکہ طالب علم اچھی طرح تیار ہو کر آئے ہوں۔

پُرمعنی پس منظر

بعض اوقات بات چیت کی کامیابی کے لیے صرف اسی قدر کافی نہیں ہوتا کہ طالب علم گھر سے مطالعہ کر کے آئیں، بڑی جماعتوں بالخصوص ڈگری کے طالب علموں نے اپنے مخصوص مضامین کے متعلق اس قدر نظریاتی پس منظر حاصل کر لیا ہوتا ہے کہ استاد اور شاگرد ایک ہی ذہنی پس منظر کے دائرے میں آسانی سے تبادلہ خیالات کر سکتے ہیں، ایسے سیانے طلبا کے ساتھ کام کرتے وقت اتنا ہی کافی ہے کہ مطالعہ کے لیے کتابوں کے حصے بتا دیے جائیں اور بعد ازاں بات چیت اور بحث و تمحیص سے اس مطالعہ کے تمام پہلو صاف ہو جائیں۔ لیکن نیم پختہ طالب علموں کے ساتھ یہ طریقہ اسی وقت موثر ہو گا جب بات چیت سے پہلے ایک پُرمعنی ذہنی پس منظر بھی تیار کر لیا جائے، تاکہ بحث میں حصہ لینے والے مسئلہ کے بنیادی اصولوں اس کی نظریاتی بحثوں اور اس سے متعلق مختلف زاویہ ہائے نگاہ کی بابت ایک مختصر لیکن جامع ذہنی خاکہ حاصل کر لیں، اس کی آسان صورت یہ ہے کہ بات چیت سے پہلے موضوع پر ایک آدھ تقریر ہو جائے۔ استاد پہلے تقریری بیان کے ذریعہ سے ذہنی پس منظر تیار کرے بعد ازاں بات چیت کا گھنٹہ آ جائے۔ اس ضمن میں کوئی بندھا ٹکا قاعدہ بتانا ناممکن ہے۔ ہر موضوع کے تقاضے مختلف ہوں گے۔ شاید کسی موضوع کے لیے استاد کو دو تقریری سبق دینے پڑیں، کسی کے لیے صرف ایک ہی کافی ہو اور کسی کے لیے ایک کی بھی ضرورت نہ ہو۔ یہ تقریری سبق ایسے انداز میں ہونے چاہییں کہ آئندہ بات چیت کا راستہ صاف ہو جائے نہ کہ اس میں رکاوٹ پیدا ہو۔ مثلاً اگر تقریری سبق میں بعض نظریات اور حقائق تحکمانہ انداز میں پیش کیے گئے ہیں تو اغلب یہ ہے کہ بات چیت کے دوران میں ان نظریات کے متعلق زبان نہیں کھولی جائے گی یا اگر استاد نے تقریری سبق ہی میں مسئلہ کے ہر پہلو پر مکمل روشنی ڈال دی ہے تو بات چیت کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ تقریری سبق کی غایت صرف یہ ہونی چاہیے کہ مسئلہ کی نظریاتی بنیادوں پر

روشنی پڑ جائے اور طلبہ کے دلوں میں چند در چند سوال پیدا ہو جائیں، جن کے متعلق وہ اپنے مطالعہ میں مواد جمع کریں۔

ذہنی پس منظر میں دوسرا بڑا عنصر اجتماعی روح ہے مسئلہ پر بات چیت کا سلسلہ دنوں تک جاری رہتا ہے، جماعت بات چیت کے طریقہ کو مہینوں لگاتار استعمال کرتی ہے، اس کام کو زندگی کی تازگی بخشنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ سارا کام ایک مسلسل کڑی کی شکل اختیار کر جائے، جوں جوں گروہ اس راستے پر بڑھے اس کے افراد ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے جائیں، وہ مسائل پر آزادی اور بے تکلفی سے بات چیت کریں۔ افہام و تفہیم کی اس فضا میں بعض افراد لامحالہ اپنے نظریے تبدیل کر لیں گے اور بعض اپنے عقیدہ پر پہلے سے کہیں زیادہ پختہ ہو جائیں گے، اس اجتماعی روح کے طفیل افراد کے سابقہ مشاہدات اور محسوسات ایک نیا رنگ اختیار کرنے لگیں گے اور موجودہ تجربات میں ایک نئی لطافت محسوس ہونے لگے گی، علم و مطالعہ میں ایک یگانگت نظر آنے لگے گی، غرض اجتماعی روح بات چیت کو ایک نرالا رنگ و روپ بخشے گی۔

پُر معنی منظر کا تیسرا اہم عنصر مدرسے کی عام فضا ہے، ہر تعلیمی ادارہ اپنا مخصوص ذہنی مزاج یا ماحول رکھتا ہے، یہ مخصوص ذہنی آب و ہوا اس کی ہر شے کو متاثر کرتی ہے۔ ایک باشعور آدمی کسی تعلیمی ادارے میں قدم دھرتے ہی اس کی فضا کو بھانپ جاتا ہے، بعض مدرسوں کا ذہنی ماحول اس قدر تحکم زدہ اور گھٹا گھٹا ہوتا ہے کہ یہاں بے تکلف بات چیت کا طریقہ چل ہی نہیں سکتا۔ طلبہ اتنے بھاری ذہنی بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں کہ انہیں بے جھجک گفتگو پر ابھارا ہی نہیں جا سکتا، اس کے برعکس بعض تعلیمی اداروں میں بدلگامی کی فضا اتنی ہمہ گیر ہوتی ہے کہ یہاں ذراسی ڈھیل بھی پُر ہنگامہ شور کے سوا اور کوئی نتیجہ پیدا ہی نہیں کر سکتی، لیکن ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک معتدل ذہنی فضا بھی ہے۔ ہمارے یہاں بہت تھوڑے مدرسے ہوں گے جن کو یہ فضا نصیب ہو۔ یہ فضا اجازت دہ مگر منظم ذہنی فضا ہے، یہ فضا ان مدرسوں میں پیدا ہو سکتی ہے جہاں طالب علموں کو ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے کا خوگر بنایا گیا ہو، یہ طالب علم خود اپنے اوپر ضبط

کرنا سیکھ جاتے ہیں، ایسے مدرسے میں آزاد ضبط کا ذہنی ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے مدرسے میں بات چیت کا طریقہ بڑی آسانی سے اختیار کیا سکتا ہے۔ استاد کے لیے صرف یہ سوال کرنا ہی کافی ہوگا: "اچھا آج ہم کس موضوع پر بات چیت کریں گے"، اس کے جواب میں کسی طرف سے سوال یا اظہار رائے ہوگا جس پر مختلف نقطہ ہائے نگاہ کی تشریح چل نکلے گی اور استاد صرف بات چیت کی مناسب رہ نمائی کرتا جائے گا۔

بات چیت کے خاتمہ پر اس کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی ہونا چاہیے۔ بعض استاد اس کے لیے یہ سوال پوچھا کرتے ہیں: "کیا ہم نے موضوع کے تمام پہلوؤں پر نگاہ ڈال لی ہے؟" لیکن یہ نکتہ سمجھ لینا چاہیے کہ استاد کی یہ ذمہ داری نہیں کہ جس شرح و بسط کے ساتھ تقریری میں ہر نکتہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے اسی طرح بات چیت میں بھی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل پر پوری روشنی پڑ جائے۔ بعض اوقات بات چیت کی کامیابی کا اندازہ یہ سوال پوچھ کر کیا جاتا ہے "کیا ہر شخص نے بات چیت میں حصہ لیا ہے یا نہیں؟" اس سوال کا جواب بھی کوئی معنی خیز شے نہیں۔ عموماً گروہ کے تمام افراد کو بات چیت میں شریک ہونا چاہیے لیکن بعض طالب علم طبعاً اتنے شرمیلے یا خاموشی پسند ہوتے ہیں کہ استاد اپنی بہترین کوششوں کے باوجود انہیں بات چیت میں شریک نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں استاد کو چاہیے کہ خود ان کی ترجمانی کی کوشش کرے۔ جو سوالات ان کے دلوں میں پیدا ہو سکتے ہیں وہ پوچھے اور جو تنقید ان کی طرف سے ہو سکتی تھی وہ کرے۔ بات چیت میں عام سرگرمی بھی اس کی کامیابی کی کوئی حتمی دلیل نہیں، سرگرمی ایک جذباتی کیفیت کا نام ہے اور فہم و شعور ذہنی کیفیتوں کا نام ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ کسی معاملہ میں بڑی گرم جوشی کا اظہار ہو لیکن اس کا پورا ذہنی شعور پیدا نہ ہوا ہو۔

فیصلہ کن عناصر

یہاں تک موثر بات چیت کی ضروری شرائط کا ذکر تھا۔ اب اس کے تین فیصلہ کن عناصر یعنی (۱) نفس مضمون (۲) استاد کی انفرادیت (۳) گروہ طلبا پر نگاہ ڈالی جائے گی۔

روشنی پڑ جائے اور طلبہ کے دلوں میں چند در چند سوال پیدا ہو جائیں جن کے متعلق وہ اپنے مطالعہ میں مواد جمع کریں۔

ذہنی پس منظر میں دوسرا بڑا عنصر اجتماعی روح ہے جس کا بات چیت کا سلسلہ دنوں تک جاری رہتا ہے، جماعت بات چیت کے طریقہ کو مہینوں لگاتار استعمال کرتی ہے، اس کام کو زندگی کی تازگی بخشنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ سارا کام ایک مسلسل کڑی کی شکل اختیار کر جائے۔ جوں جوں گروہ اس راستے پر بڑھے اس کے افراد ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے جائیں، وہ مسائل پر آزادی اور بے تکلفی سے بات چیت کریں۔ افہام و تفہیم کی اس فضا میں بعض افراد لامحالہ اپنے نظریے تبدیل کر لیں گے اور بعض اپنے عقیدہ پر پہلے سے بھی زیادہ پختہ ہو جائیں گے، اس اجتماعی روح کے طفیل افراد کے سابقہ مشاہدات اور محسوسات ایک نیا رنگ اختیار کرنے لگیں گے اور موجودہ تجربات میں ایک نئی لذت محسوس ہونے لگے گی، علم و مطالعہ میں ایک یگانگت نظر آنے لگے گی، غرض اجتماعی روح بات چیت کو ایک نرالا رنگ و روپ بخشے گی۔

پس منظر کا تیسرا اہم عنصر مدرسے کی عام فضا ہے، ہر تعلیمی ادارہ اپنا مخصوص ذہنی مزاج یا ماحول رکھتا ہے، یہ مخصوص ذہنی آب و ہوا اس کی ہر شے کو متاثر کرتی ہے۔ ایک باشعور آدمی کسی تعلیمی ادارے میں قدم دھرتے ہی اس کی فضا کو بھانپ جاتا ہے۔ بعض مدرسوں کا ذہنی ماحول اس قدر تحکم زدہ اور گھٹا گھٹا ہوتا ہے کہ یہاں بے تکلف بات چیت کا طریقہ چل ہی نہیں سکتا۔ طلبہ اتنے بھاری ذہنی بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں کہ انہیں بے جھجک گفتگو پر ابھارا ہی نہیں جا سکتا اس کے برعکس بعض تعلیمی اداروں میں بدلگامی کی فضا اتنی ہمہ گیر ہوتی ہے کہ یہاں ذرا سی دلیل بھی پُر ہنگامہ شور کے سوا اور کوئی نتیجہ پیدا ہی نہیں کر سکتی، لیکن ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک معتدل ذہنی فضا بھی ہے۔ ہمارے یہاں بہت تھوڑے مدرسے ہوں گے جن کو یہ فضا نصیب ہو۔ یہ فضا اجازت دہ مگر منظم ذہنی فضا ہے، یہ فضا ان مدرسوں میں پیدا ہو سکتی ہے جہاں طالب علموں کو ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے کا خوگر بنایا گیا ہو، یہ طالب علم خود اپنے اوپر ضبط

عائد کرنا سیکھ جاتے ہیں، ایسے مدرسے میں آزاد ضبط کا ذہنی ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے مدرسے میں بات چیت کا طریقہ بڑی آسانی سے اختیار کیا سکتا ہے۔ استاد کے لیے صرف یہ سوال پوچھنا ہی کافی ہوگا: ''اچھا آج ہم کس موضوع پر بات چیت کریں گے''۔ اس کے جواب میں کسی طرف سے کوئی سوال یا اظہار رائے ہوگا جس پر مختلف نقطہ ہائے نگاہ کی تشریح چل نکلے گی اور استاد صرف اس بات چیت کی مناسب رہنمائی کرتا جائے گا۔

بات چیت کے خاتمہ پر اس کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی ہونا چاہیے۔ بعض استاد اس کے لیے عموماً یہ سوال پوچھا کرتے ہیں: ''کیا ہم نے موضوع کے تمام پہلوؤں پر نگاہ ڈال لی ہے؟'' لیکن یہاں یہ نکتہ سمجھ لینا چاہیے کہ استاد کی یہ ذمہ داری نہیں کہ جس شرح و بسط کے ساتھ تقریری سبق میں ہر نکتہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے اسی طرح بات چیت میں بھی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل پر پوری روشنی پڑ جائے۔ بعض اوقات بات چیت کی کامیابی کا اندازہ یہ سوال پوچھ کر کیا جاتا ہے ''کیا ہر شخص نے بات چیت میں حصہ لیا ہے یا نہیں؟'' اس سوال کا جواب بھی کوئی معنی خیز شے نہیں۔ عموماً گروہ کے تمام افراد کو بات چیت میں شریک ہونا چاہیے۔ لیکن بعض طالب علم طبعاً اتنے شرمیلے یا خاموشی پسند ہوتے ہیں کہ استاد اپنی بہترین کوششوں کے باوجود انہیں بات چیت میں شریک نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں استاد کو چاہیے کہ خود ان کی ترجمانی کی کوشش کرے۔ جو سوالات ن کے دلوں میں پیدا ہو سکتے ہیں وہ پوچھے اور جو تنقید ان کی طرف سے ہو سکتی تھی وہ کرے۔ بات چیت ا عام سرگرمی بھی اس کی کامیابی کی کوئی حتمی دلیل نہیں، سرگرمی ایک جذباتی کیفیت کا نام ہے ب کہ فہم و شعور ذہنی کیفیتوں کا نام ہے، یہ عین ممکن ہے کہ کسی معاملہ میں بڑی گرم جوشی کا اظہار د، لیکن اس کا پورا ذہنی شعور پیدا نہ ہوا ہو۔

ن فیصلہ کن عناصر

یہاں تک موثر بات چیت کی ضروری شرائط کا ذکر تھا۔ اب اس کے تین فیصلہ کن عناصر یعنی (۱) نفس مضمون (۲) استاد کی انفرادیت ر (۳) گروہ طلبا پر نگاہ ڈالی جائے گی۔

(۱) ہر قسم کے موضوع پر ایک سی آسانی کے ساتھ بحث و تمحیص نہیں ہو سکتی۔ اگر نفس مضمون سراسر یا بیشتر مسلمہ حقائق و روایات پر مشتمل ہے تو وہاں بات چیت کا طریقہ زیادہ کام نہ دے گا۔ مثلاً زبان ریاضی اور ابتدائی سائنس کے مضامین میں اس طریقہ سے کام لینا بڑا مشکل ہے۔ گو بعض غیر معمولی صلاحیت کے استاد ان مضامین کو ابتدائی جماعتوں میں بھی بات چیت کے طریقہ پر پڑھا لیتے ہیں، ان کے برعکس جن مضامین میں نظریاتی یا فلسفیانہ بحث کی گنجائش ہو، مثلاً معاشرتی علوم۔ ان میں بات چیت کا طریقہ خوب کام دیتا ہے، ابتدائی جماعتوں میں اس سے کام لینے کی یہ صورت ہے کہ استاد تھوڑی دیر کے لیے خود ہاتھ کھینچ لے تاکہ موضوع کے متعلق اختلافی خیالات معلوم ہو سکیں۔ معاشرتی علوم میں مسلمہ واقعات و حقائق، جمے رہ کر بھی بحث و مباحثہ کا موقع بڑی آسانی سے نکل سکتا ہے۔

(۲) بات چیت کو مؤثر بنانے میں استاد کا جو ہاتھ ہے اس کی طرف پیچھے کئی بار اشارہ ہو چکا ہے یہ صلاحیت موسیقی اور تخلیقی فنون کی طرح کوئی خداداد قابلیت نہیں، بلکہ ہر استاد مناسب توجہ اور کوشش سے یہ صلاحیت اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے، اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ استاد ایک تجرباتی تنقیدی نگاہ پیدا کرے، وہ کسی چیز کو یوں ہی قطعی اور حتمی خیال نہ کرے، اس میں دوسری خوبی یہ ہو کہ پختہ اعتقادی کے باوجود تنگ نظر نہ ہو۔ وہ اس حقیقت کو سمجھتا ہو کہ بہت سے قابل لوگ پوری دیانت داری کے ساتھ اس سے مختلف یقین بھی رکھتے ہیں، یہ رواداری اور وسیع الخیالی جماعت میں وہ اجازت وہ ماحول پیدا کرے گی جس کے بغیر آزادانہ اظہار خیال کا امکان ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ بعض استاد کسی مخالف خیال یا مخالف آواز کو برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ وہ بعض اوقات اختلاف رکھنے والے طلبہ کو ہر قسم کی سزا دینے پر اتر آتے ہیں، ایسے استاد بات چیت کا طریقہ کبھی استعمال نہیں کر سکتے، استاد میں تیسرا وصف یہ ہونا چاہیے کہ وہ طلبہ کی خام طبعی اور نیم پختگی کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرے، استاد قدرتی طور پر پختہ نگاہ اور تجربہ کار ہو گا۔ اپنے مضمون کے مختلف پہلوؤں پر اس کو گہری نگاہ حاصل ہو گی، اس کے

مقابلہ میں بچوں اور نوخیز جوانوں کے خیالات اور نظریات بالکل بھدے، ادھورے اور مضحکہ خیز ہوں گے لیکن استاد کو انہیں حقارت آمیز ہنسی یا خشم آلود چڑچڑے پن سے رد نہیں کر دینا چاہیے۔ بلکہ پوری ہمدردی اور خندہ روی کے ساتھ سننا چاہیے۔ اسے ان ذہنی کوششوں کو طالب علموں کے نقطہ نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ حقارت آمیز علمی بلندی کا مظاہرہ کر کے وہ اپنے جذبہ کبر کی تشفی کر سکتا ہے۔ لیکن اس سے طالب علموں پر ذہنی بالیدگی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ جس طرح والدین بچے کی لڑکھڑاتی بدنی حرکات کو دیکھ کر لطف اٹھاتے ہیں بالکل اسی طرح استاد کو طلبہ کی نوآموز ذہنی کوششوں میں لطف محسوس کرنا چاہیے۔ اسے ہر طالب علم کو اس کی ہی ذہنی سطح پر ملنا چاہیے۔ استاد میں چوتھی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ وہ انسانی علم و تحقیق کی نا گزیر کمی کو لمحہ بھر کے لیے نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دے۔ اسے یہ پورا احساس ہو کہ گو انسان نے فطرت کے چہرے سے ان گنت نقاب الٹ دیے ہیں اور آنے والے زمانوں میں تحقیق و انکشاف کی یہ رفتار غالباً آج سے بھی کئی گنا تیز ہو جائے گی۔ پھر بھی انسان اس قابل کبھی نہیں ہوگا کہ حقیقت کو اس کے پورے حسن کے ساتھ تمام و کمال طور پر مشاہدہ کر سکے ....

حقیقت کی اصلی ماہیت ایک ایسا سربستہ راز ہے جسے انسانی کاوش کبھی حل نہیں کر سکے گی اس امر کا احساس پختہ کاری اور خام کاری کی تفریق بڑی حد تک مٹا دے گا۔ علم و انکشاف کے راستہ پر چلنے والے تمام لوگ ایک ہی منزل کے مسافر ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تجربہ کار اور سیانے لوگ نوآموز اور خام کاروں کی نسبت چند قدم آگے ہیں اور بس۔ یہ احساس استاد اور طلبا کو ایک ہی مشترکہ مقصود کا متلاشی بنا دے گا۔ دونوں باہمی تعاون اور اشتراک سے اس مقصود کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ جو استاد یہ احساس پیدا کر لے گا وہ اپنے مخصوص علمی میدان میں بھی ہر چھوٹی بڑی لاعلمی اور کمی کو کمال خندہ پیشانی کے ساتھ تسلیم کرنے کو تیار رہے گا۔ اسے عملی تجربہ سے اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ تلاش حق کی راہ میں وہ چھوٹے بچوں سے بھی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ جن استادوں نے بات چیت کے طریقے پر پڑھایا ہے

ان کا بیان ہے کہ بہت کم ایسا اتفاق ہوا ہے کہ انہوں نے اپنے طلبہ سے کچھ نہ سیکھا ہو۔

(۳) بات چیت کے طریقہ میں تیسرا نسبتاً کم عنصر طلبہ کا گروہ ہے جس طرح کوئی دو افراد بالکل ایک سے نہیں ہوتے بالکل اسی طرح ہر گروہ بھی اپنی انفرادی ہستی رکھتا ہے، جو دوسرے ہر گروہ کی ہستی سے جداگانہ ہوتی ہے، جو استاد سالہا سال سے بحث و تمحیص کے طریقہ پر کام کر رہے ہیں ان کا تجربہ ہے کہ گروہ ایک ہی مضمون پڑھاتے ہیں، اور عمر کے لحاظ سے طلبہ کا ایک سا گروہ ان کے حوالے کیا جاتا ہے۔ تاہم ہر گروہ بعض باتوں میں اپنے تمام پیش روؤں سے مختلف ہوتا ہے۔

بعض مفید اشارے بات چیت کی ہوش مندرہنمائی ایک فن ہے۔ ہر استاد اس طریقہ کے استعمال کے دوران میں بہت سے مفید مطلب گر سیکھ جاتا ہے جو اس طریقہ کی افادیت اور سہولت کو بڑھاتے ہیں، ذیل میں ایک تجربہ کار استاد کے بیان کردہ گر درج کیے جاتے ہیں۔

(ا) بعض طالب علم ضرورت سے زیادہ نمائش پسند ہوتے ہیں، وہ بات چیت پر اس طرح چھا جانا چاہتے ہیں کہ ان کے سوا کوئی دوسرا صف اول میں نہ آسکے، استاد کو ایسی نمائش پسندی کا چابکدستی کے ساتھ سدباب کرنا چاہیے ورنہ دوسرے طالب علم بے بصیرت سے خالی سمجھنے لگیں گے۔

(ب) بات چیت سے کنارہ کش رہنے والے طلبا کو زبردستی اس میں کھینچ لانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، بے شک ان کی ہر ممکن حوصلہ افزائی ہو۔ لیکن اگر نتائج حسب منشا نہ نکلیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ بعض زبردست نفسیاتی موانع ان کے راستے میں حائل ہیں، ان موانع کو دور کیے بغیر انہیں یوں ہی گھسیٹ کر آگے کھینچنا بعض صورتوں میں حقیقی ظلم ہو سکتا ہے، استاد کو ایسی صورت میں پورے سکون سے کام لینا چاہیے۔ اکثر حالتوں میں وہ دیکھے گا کہ خاموش طالب علموں کی تحریر جماعت میں ہونے والی بات چیت کے تمام تعلیمی فوائد کی آئینہ دار ہے۔ یہ ذہنی استفادہ کئی صورتوں میں زیادہ بولنے والے طلبا کے مقابلہ میں بھی زیادہ ہوگا۔

(ج) بعض طلبا بات چیت کو اصل راستے سے ہٹانے کے معاملہ میں بڑے ماہر واقع ہوئے ہوتے ہیں۔

بعض اوقات ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اصل موضوع کے متعلق کچھ کہنے کی ذمہ داری سے بچ جائیں اور وقت یوں ہی دل لگی میں کٹ جائے، استاد کو ایسے طالب علموں پر خاص نگاہ رکھنی چاہیے، اور ان کی کوشش کو کارگر نہ ہونے دینا چاہیے۔

د) استاد کو ہمہ دانی کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے۔ بات چیت میں بعض اوقات چھوٹی چھوٹی جزئیات پر بھی سوال پوچھے جائیں گے جن میں سے بعض کے متعلق شاید استاد کے پاس جواب تیار نہ ہو۔ ایسے تکلیف دہ سوالوں سے دامن چھڑانے کے لیے گپ بازی سے کام لینا استاد کی شان کے شایاں نہیں۔ اسے کمال دیانت داری کے ساتھ یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ وہ کوئی چلتا پھرتا جامع العلوم نہیں۔ یہ دیانت دارانہ اعتراف نہ صرف اس کی اخلاقی عظمت کو بڑھائے گا، بلکہ طالب علموں کے لیے بھی ایک قابل تقلید مثال کا کام دے گا۔

ہ) استاد کو اپنی رائے اور یقین کو چھپانے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ بعض لوگ اس بات کے حامی ہیں کہ بحث و تمحیص میں استاد کو پوری غیر جانب داری برتنی چاہیے اور کسی متنازعہ فیہ مسئلہ میں ایک دھڑے کا ساتھ نہیں دینا چاہیے، جہاں تک اندھا دھند تعصب کا تعلق ہے استاد کو بے شک اس سے بہت اونچا ہونا چاہیے۔ لیکن باشعور اور فہمیدہ معتقدات اور یقینوں کا معاملہ اس سے الگ ہے، اسے یہ معتقدات پوری دیانت داری کے ساتھ طلبہ کے سامنے رکھ دینے چاہییں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو بھی یہ معتقدات اس کی تدریس اور اس کے عام طور طریقوں میں ہمیشہ جھلکتے رہیں گے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ان کے بارے میں طلبہ کو کسی غلط فہمی میں نہ رہنے دے۔ ہاں بحث میں ایک دھڑے کا ساتھ دیتے وقت اسے کمال فراخ دلی اور رواداری سے مخالف نقطہ نگاہ کا بھی احترام کرنا چاہیے۔

و) بحث کے دوران میں استاد کو کسی طالب علم پر بھولے سے بھی کوئی پھبتی نہ کسنی چاہیے یہ چیز بعض اوقات اس قدر تلخی پیدا کر سکتی ہے جس کا ازالہ کوئی دوسری چیز نہیں کر سکتی

(۱۳) بعض طلبا ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں امتحان کے خوف کے سوا اور کوئی چیز سنجیدگی سے کام کرنے پر آمادہ نہیں کرتی۔ اگر کسی گروہ میں ایسے طلبہ ہوں۔ وہ بڑا خوش بخت گروہ ہوگا لیکن ایسے تھوڑے بہت افراد عموماً ہر گروہ میں ہوتے ہیں، انہیں لگا تار مستعد رکھنے کے لیے چاہیے کہ اعلان کر دیا جائے کہ استاد جب بھی چاہے گا مقررہ مطالعہ میں سے ایک مختصر سا امتحان لے لے گا اس طرح اچانک وقتاً فوقتاً ایک آدھ سوال کا تحریری جواب مانگ کر استاد نہ صرف اس بات کا تعین کر سکتا ہے کہ طالب علم بتائے ہوئے صفحات کو پڑھ کر آئیں گے بلکہ وہ اس امتحان کی مدد سے آنے والی بات چیت کے لیے میدان بھی ہموار کر سکتا ہے۔ اس کی ایک متبادل صورت یہ ہے کہ طالب علموں کو ہر چند ہفتوں کے وقفہ میں اپنے مطالعہ کے نتائج ایک جواب مضمون کی شکل میں پیش کرنے کو کہا جائے، جواب مضمون کی لمبائی کا فیصلہ جماعت کے باہمی مشورہ سے کر لیا جائے، اس تحریری مشق کو بنیاد قرار دے کر طالب علموں کے کام اور ان کے فہم و ادراک کی ترقی کا اندازہ لگایا جائے، یہ طریق بہت تسلی بخش نتائج پیدا کرے گا۔

(۱۴) بات چیت کی کامیابی میں مادی ماحول کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ عام کمرہ ہائے جماعت میں طالب علموں کے ڈیسک قطاروں میں دھرے ہوتے ہیں اور استاد سامنے میز کے پیچھے کرسی جمائے بیٹھا ہوتا ہے، ایسی صورت میں بالمشافہ بات چیت کرنا ناممکن تو نہیں البتہ مشکل ضرور ہے، طالب علم گردنوں پر زور ڈال کر ادھر ادھر مڑے بغیر اپنے عام ساتھیوں کو نہیں دیکھ سکتے، مہذب گفتگو کے لیے ضروری ہے کہ بولنے والے ایک دوسرے کو دیکھیں۔ پھر استاد بدنی اور نفسیاتی ہر دو طور پر باقی گروہ سے کٹا رہتا ہے، وہ اس سے الگ ایک بلند تر مقام پر براجمان رہتا ہے، یہ چیز اس کی حیثیت کو غلط بنا دیتی ہے، سب سے اچھی صورت یہ ہوگی کہ استاد اور طالب علم سب کے سب ایک گول میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے ہوں، اگر گول میز میسر نہ آ سکے تو کسی میز کا نہ ہونا بہتر ہے۔ یوں ہی کرسیاں ایک بیضوی دائرے کی

شکل میں رکھ دی جائیں۔ ساز و سامان کا امیرانہ ٹھاٹھ غیر ضروری ہے۔ لیکن نشستوں کی ترتیب باسلیقہ ضرور ہونی چاہیے، اس کے بغیر باسلیقہ بات چیت ممکن نہیں ہوگی۔

اتالیق کے کام سے موازنہ

آکسفورڈ کیمبرج اور بعض دوسری مشہور یونی ورسٹیوں میں یہ دستور ہے کہ ہر طالب علم کو ایک اتالیق کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جو اس کے خاص مسائل اور مخصوص دشواریوں میں اس کی رہنمائی کرتا ہے وہ تعلیمی اور ذاتی مسائل کے بارے میں اس کی دست گیری کرتا ہے، یہ طریق کار غیر معمولی قابلیت کے طالب علموں کے لیے بڑا سود مند ثابت ہوا ہے۔ اسی طرح یہ ان طلبا کے لیے بھی اکسیر ہے جو نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوں۔ لیکن اس طریق کار کی سب سے بڑی کمی اس کی گرانی ہے، ہر طالب علم کے لیے مکمل طور پر انفرادی توجہ کا بندوبست کرنا وسیع مالی وسائل چاہتا ہے، اس میں دوسری کمی یہ ہے کہ جب صرف ایک طالب علم اتالیق کے سامنے جاتا ہے تو اس کی اکیلی شخصیت اتالیق کی بالغ تر اور پختہ تر شخصیت سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برا نہیں ہو سکتی، اس کی شخصیت گہنا سی جاتی ہے۔ ایک عظیم تر شخصیت کا یہ دباؤ اکثر حالتوں میں ایک ناپسندیدہ بوجھ بن جاتا ہے، بات چیت کے طریقہ میں کسی ایسے دباؤ کا خطرہ نہیں رہتا۔ استاد کی شخصیت کیسی ہی پُر عظمت کیوں نہ ہو، وہ طالب علموں کی ایک جا شدہ شخصیتوں پر مفلوج کن دباؤ نہیں ڈال سکتی۔

بات چیت کے طریق کی دوسری برتری وقت اور توانائی کی بچت ہے، جب استاد کسی ایک طالب علم کے سوال یا اس کے کسی اعتراض کا جواب دیتا ہے تو گروہ کے دوسرے افراد بھی اس جواب کو سنتے ہیں۔ انہیں دوبارہ اس نکتہ کی وضاحت کرانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ لیکن اگر یہ طالب علم علیحدہ علیحدہ استاد کے ساتھ تبادلہ خیالات کرتے تو استاد کو ایک ہی بات کئی بار دہرانی پڑتی۔

اس سے یہ کہنا مقصود نہیں کہ اتالیق کا کام بے کار ہے جیسا پہلے کہا جا چکا ہے عام ذہانت کے طلبہ کے لیے بات چیت کا طریق زیادہ موزوں اور کامیاب رہے گا۔

خاص فوائد | اس لمبی بحث کے بعد ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ بات چیت کے طریقہ کے فوائد کو یک جا کر سکیں اور یہ بتا سکیں کہ وسیع المشرب تعلیم کے مقاصد حاصل کرنے میں یہ طریقہ کتنا کارگر ہے۔

(۱) بات چیت کے طریقہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ طریقہ طالب علم کو محض علم کا متلاشی ہی خیال نہیں کرتا، بلکہ اسے ایک ایسا انسان خیال کرتا ہے جو دوسرے انسانوں کی طرح خیالات، احساسات جذبات، تعصبات، معتقدات اور دوسرے رنگا رنگ نفسیاتی عناصر کا مجموعہ ہے۔ تقریری سبق یا کتاب خوانی میں طالب علم کی پوری شخصیت کا اس حد تک خیال نہیں رکھا جا سکتا جتنا بات چیت میں۔ تقریری سبق میں استاد اپنے مضمون کے ایک خاص حصہ کو تیار کر لاتا ہے۔ اور اس کی بناء پر اپنے علم و فضیلت کی نمائش کر دیتا ہے، اسے طلبہ کے غیر متوقع ردّ عمل اور طرح طرح کے متجسسانہ سوالوں سے دو چار نہیں ہونا پڑتا۔ کتاب خوانی میں استاد کو بالکل ایک کوچوان کا درجہ مل جاتا ہے۔ یہ کوڑا ہاتھ میں پکڑے جماعت کو ہانکے جا رہا ہو۔ بات چیت میں ان دونوں باتوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہاں استاد طلبا کی سطح پر اتر کر ان کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ اسے ہم مرتبہ ساتھیوں میں ایک سخن کار اور سیانے رفیق کار کا درجہ ملتا ہے اور بس۔ اس کا بڑا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم استاد کی پوری شخصیت کو دیکھنے لگتے ہیں اور اس سے متاثر ہوتے ہیں، وہ اپنے ساتھیوں کو بھی ایک مکمل پس منظر میں دیکھنے لگتے ہیں گروہ کے ہر فرد کی پوری شخصیت دوسروں کے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہے، وہ ایک دوسرے میں ایسے اوصاف دیکھنے لگتے ہیں جن کا پہلے وہم و گمان بھی نہ ہوا تھا تعلیمی طور پر یہ بات بے حد اہم ہے کیونکہ تعلیم کا اصل مقصد پوری شخصیت کی نشو و نما ہے نہ کہ اس کے کسی خاص پہلو کی ترقی۔

(۲) مضمون کے آغاز میں کہا گیا تھا کہ وسیع المشرب تعلیم کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ لسانی منطقی مہارت پیدا کرے۔ بات چیت کا طریق یہ مہارت بڑی کامیابی کے ساتھ پیدا کرتا ہے، اس میں شک نہیں کہ تدریس کے دوسرے طریقے بھی اس چیز کی مشق کراتے ہیں، مثلاً تقریری سبق کے

نوٹ لکھنے، جواب مضمون لکھنے اور امتحانی سوالوں کے جواب دینے کے لیے بھی خیالات کو
ترتیب دینے اور انہیں موزوں الفاظ میں ادا کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن پرسکون
علیحدگی میں بے دھڑک یہ کام کرنا اور بات ہے اور بات چیت کے سرگرم ہنگامے میں
فوری طور پر اسے انجام دینا بالکل الگ بات ہے۔

امتحانوں کے پرچے دیکھتے وقت یا جواب مضمون درست کرتے وقت ہر استاد کو خوفناک
طور پر احساس ہونے لگتا ہے کہ اکثر طلبا کے خیالات کتنے الجھے ہوئے ہیں، اور ان کے
الفاظ کس قدر بھدّے اور غیر موزوں ہیں۔ اکثر استاد بعد ازاں طلبا کو ان کی غلطیوں سے خبردار بھی کرتے
ہیں لیکن بات چیت میں یہ اصلاح ساتھ ساتھ ہوتی جاتی ہے، جوں ہی کسی طالب علم نے
غیر منظم خیالات یا الٹے سیدھے الفاظ سے کام لیا جھٹ دوسرے طالب علموں نے کہا: -
"اس سے آپ کا مطلب؟ .... اس سے یہ لازم تو نہیں آتا ...... یہ آپ نے کیا کہا"
وغیرہ۔ غرض بات چیت ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی مدد سے سلجھے ہوئے خیالات اور
جچے تلے الفاظ کی مشق نہایت قدرتی ماحول میں ... ہوتی ہے۔ ایسی جن مضامین میں بات چیت
کی گنجائش نکل سکے ان میں اس سے بہتر اور با کفایت طریق کار اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

) تعلیم کا ایک قیمتی مقصد تفکر اور تدبر کی عادت پیدا کرنا ہے۔ تاکہ طالب علم کسی بات کو واقعات و
شواہد کی چھان بین کے بغیر تسلیم نہ کر لیا کریں۔ مثلاً محمود غزنوی کا حملہ سومنات ایک مشہور
تاریخی واقعہ ہے لیکن اس واقعہ کی صحت اس لیے مسلم الثبوت ہے کہ یہ بہت سے باہم مربوط
تاریخی واقعات پر مبنی ہے جن سب کی صداقت جرح و تنقید کے معیار پر پوری اتر چکی ہے۔ بات چیت
کا طریق تفکر کی عادت پیدا کرنے میں بڑا کامیاب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لکچر میں بھی تجزیہ
و تنقید سے کام لیا جاتا ہے، لیکن اس میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ گو مقرر نے خود بڑی گہری
تنقیدی نگاہ سے کام لیا ہو۔ یہ بہت اغلب ہے کہ طالب علم اس کے علم و فضل سے اس قدر
متاثر ہو جائے کہ وہ اس کی ہر بات کو بلا چون وچرا درست تسلیم کرے۔ گویا تقریر کرنے والا بڑی

اجتہادی نگاہ رکھتا ہے، لیکن اس کے سامعین محض تقلیدی نگاہ ہی پر قانع ہو جاتے ہیں، بحث تمحیص اور بات چیت میں اس بات کا خطرہ بہت گھٹ جاتا ہے۔

(۴) ہماری ثقافت کے سامنے آج بڑا سوال اخلاق و آداب کے پسندیدہ معیاروں کا قائم رکھنا ہے، تاکہ مستقبل کے شہری، اخلاقی، روحانی، معاشرتی، جمالیاتی اور دوسری انسانی اقداروں کی قدر و قیمت سے آگاہ رہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں کی بھاری اکثریت ایسی ہے جو بد دلی کا شکار ہو کر اقدار کے معاملہ میں بے تعلقی کا رویہ اختیار کر لیتی ہے، کچھ لوگ تند و تیز تعصب کو شعار بنا لیتے ہیں۔ تعلیم کے سامنے ایک کٹھن سوال یہ ہے کہ صحت مند انسانی اقدار کا سچا احساس کس طرح پیدا کیا جائے۔ اگر محض وعظ و تلقین کو ذریعہ بنایا جائے تو نفسیاتی شواہد کا فتویٰ یہ ہے کہ اس سے بغاوت اور روگردانی کا ردّ عمل پیدا ہوگا گویا یہ کوشش بڑی حد تک ناکام رہے گی۔ اگر محض غیر نصابی سرگرمیوں ہی کے ذریعہ سے پسندیدہ اقدار کا سبق دیا جائے تو یہ سبق بڑا غیر منظم اور اتفاقیہ قسم کا ہوگا، ان دونوں مشکلوں پر قابو پانے کی اچھی صورت بات چیت کے طریقہ کو ذریعہ تدریس بنانا ہے، بات چیت کی پرخلوص فضا میں خود نمائی، تنگ نظری، حیلہ سازی اور بے تعلقی کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ بات چیت کا موضوع علمی ہوتا ہے لیکن یہ بات چیت ایک خالص غیر رسمی اور پرخلوص فضا میں انجام پاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اقدار کے معاملہ میں ایک تیز اور حساس نگاہ پیدا ہو جاتی ہے۔

(۵) صوبائی تنگ نظری اور مقامی تعصب آج ہمارے لیے بہت بڑی مصیبت بن رہے ہیں، بین الاقوامی سیاسیات کو بھی سب سے بڑی مشکل یہی درپیش ہے۔ ہر معاشرے بلکہ ساری انسانیت کی بڑی ضرورت ایک آفاقی نقطۂ نگاہ اور ایک کائناتی پس منظر ہے، اس ہمہ گیر پس منظر کے پیدا کرنے میں لکچر بہت کام دے سکتا ہے، لیکن جیسا پیچھے کہا جا چکا ہے لکچر کی کمی یہ ہے کہ ایک شخص نے کہا اور دوسرے نے سن لیا، یہ سنی ہوئی بات ضروری نہیں کہ ذہنی تانے بانے میں مستقل طور پر پیوست ہو جائے، اس کے برعکس بات چیت میں حصہ لینے والے اوّل تو

بہت سی تنگ نظریوں کا شکار ہوں گے۔ رفتہ رفتہ یہ تنگ نظریاں اجتماعی روح کی گرمی اور روزافزوں واداری کے طفیل ایک ایک کر کے ختم ہونے لگیں گی، محدود نگاہی اور تنگ نظری کا اپنی آنکھوں سے یہ حشر ہوتے دیکھ کر کون سا طالب علم ہو گا جو متاثر نہیں ہو گا۔ اور جو اپنے پس منظر کو زیادہ کشادہ کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

خاتمہ کلام بحث و تمحیص کے طریق تدریس پر یہ لمبی بحث صرف اس لیے کی گئی ہے کہ ابھی تک ہمارے مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بات چیت کے طریقہ کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اس طریقہ میں کمیاں بھی ہیں۔ مثلاً اس کے لیے زیادہ مالی وسائل کی ضرورت ہے، اس سے کام لینے کے لیے استاد کو اپنے اندر غیر معمولی صلاحیتیں پیدا کرنا پڑتی ہیں، بعض مضامین ایسے ہیں کہ وہاں اس طریق سے کام نہیں چل سکتا لیکن بات چیت کے تعلیمی فوائد گنوانے سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ باقی تمام طریقوں کو چھوڑ چھاڑ صرف اسی ایک طریقے کو رواج دیا جائے۔ مقصود صرف یہ بتلانا ہے کہ بات چیت کا طریق بعض ایسے مخصوص فوائد رکھتا ہے جو دوسرے طریقہ ہائے تدریس سے خاطر خواہ حاصل نہیں ہو سکتے۔ ایک اچھے استاد کو اس قابل ہونا چاہیے کہ باشعور بات چیت کی رہ نمائی کر سکے اور جب بھی موقع ہاتھ لگے اس سے تعلیمی خدمت لے سکے۔

دنیائے عرب میں
تعلیمی اور ثقافتی تبدیلیاں

محمد عبد العزیز

مغربی اقوام کی باہمی استعماری رقابتوں نے مشرق وسطیٰ میں ایک سیاسی بے چینی۔ ایک تجارتی تنزل۔ ایک مالی بحران پیدا کر دیا ہے، اس تباہ کاری میں برطانیہ فرانس اور امریکہ پیش پیش ہیں برطانیہ کے سامراجی عزائم نے عربوں کے اتحاد کو توڑنے کے لیے فلسطین میں جو سیاسی ڈرامہ کھیلا اس نے عربوں، بالخصوص مسلمانوں کی سیاسی بساط کو اس طرح الٹا کہ اس کا اثر محض ان کی معاشرتی زندگی ہی پر نہیں پڑا، اس سے ان کی اقتصادی اور مالی حالت بھی سنگین ہو گئی، لیکن اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ عربوں کے ذہنی اور فکری رجحانات میں ایک انقلاب آیا، ایک ایسا انقلاب جس نے ان کی پرانی اقدار حیات ہی کو بدل ڈالا، چنانچہ آج اب ان میں اتحاد و اتفاق اور دشمن کے مقابلے کا ایسا شدید جذبہ پیدا ہو گیا ہے جس میں زندگی کی حرارت بھی ہے اور فکر و عمل کی گرمی بھی، مصر و شام، عراق و حجاز طرابلس و سوڈان میں اس کے اثرات نمایاں ہو چکے ہیں، بلکہ آج ساری دنیائے عرب میں اپنی ملی روایات، اپنی ثقافت۔ اپنی زبان اور اپنے تہذیب و تمدن کے بچانے کی کوششیں ہو رہی ہیں اس سے ان کے بدلے ہوئے تیور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عرب تین بڑے بڑے اعظموں کا مقام اتصال ہے، یورپ، افریقہ اور ایشیا کی حدود یہیں آ کر ختم ہوتی ہیں، اس لیے ازمنہ قدیم میں بھی یہ بر اعظمی مواصلات کی بہت بڑی گذرگاہ تھی جس میں ہزاروں قافلے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی طرف سفر کرتے تھے، اس کی یہ خصوصیت اس زمانے میں بھی اسی طرح قائم ہے، اور آج بھی بحری، بری اور ہوائی راستوں کے بڑے بڑے عالمی مراکز مثلاً بصرہ، عدن۔ سویز، اسکندریہ، بغداد۔ بیروت اور قاہرہ انہیں علاقوں میں واقع ہیں جو

صرف بین الاقوامی گذرگاہوں کا ہی کام نہیں دیتے، بلکہ اس آمد و رفت اور اس اختلاط کا اثر یہاں کی تمدنی اور ثقافتی زندگی پر بھی پڑتا ہے۔ پرانے زمانے میں اس کی آب وہوا اور زرعی پیداوار نے پڑوسیوں کی نگاہوں کو خیرہ کیا تو ان سے تجارتی اور ثقافتی روابط قائم ہو گئے۔ مگر ان تجارتی تعلقات کے ساتھ ساتھ انہیں عالمی شاہراہوں سے حملہ آور فوجیں بھی گذرتی رہیں، اور قوموں کے بڑے بڑے گروہ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل ہوتے رہے۔ بابل و نینوا کی تہذیب اور مصر کا تمدن اسی آب و گل کی پیداوار ہے۔ یہودی اور نصرانی اسی خمیر سے اٹھے، اور آج سے کوئی چودہ سو برس پہلے اسی علاقے میں ہمارے رسول کریمؐ نے آوازۂ حق بلند کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے جزیرہ نمائے عرب نے اسلام قبول کر لیا۔ پھر تو یہاں سے مسلمان صرف دنیائے عرب ہی میں نہیں بلکہ ایشیا، یورپ، اور افریقہ کے دور دراز علاقوں میں پھیل گئے اور اس نئی تہذیب نے بحر الکاہل سے لے کر بحر اوقیانوس تک کا احاطہ کر لیا۔

آج بھی عربوں کی بیشتر آبادی مسلمان ہے، اگرچہ کہیں کہیں نصرانی اور یہودی بھی آباد ہیں اور اب برطانیہ کی مہربانی سے فلسطین میں ایک یہودی سلطنت بھی قائم ہو گئی ہے، لیکن اس کے باوجود عربوں کا ملی اور ثقافتی سرمایہ اسلام ہی کا عطیہ ہے، اسلام نے عربوں کے عقائد ہی کو نہیں بدلا، ان کی زبان۔ ان کے طریق فکر، ان کے تمدنی رجحانات بلکہ ان کی عمومی زندگی ہی کو بدل ڈالا۔ اور ان میں اخلاق و آداب، جہد و عمل اور اخلاص و مروت کے دبے ہوئے جذبات کو مرتعش کیا حتیٰ کہ عرب ایک مختصر سی مدت میں دنیا کی ایک بہت بڑی، اخلاقی، سماجی، فوجی اور سیاسی طاقت بن گئے وہ اپنے عقائد میں اتنے سخت اور اپنے عزائم میں اتنے عالی حوصلہ تھے کہ آج ان کی عظیم الشان سلطنتوں کے زوال کے بعد بھی یہ عمارت انہیں بنیادوں پر کھڑی ہے مسلمان خواہ متدین ہو یا اسے دین سے اتنا گہرا لگاؤ نہ ہو لیکن پھر بھی وہ اس اسلامی تمدنی سرمایے پر فخر کرتا ہے اور مسلمان ہونا اس کے لیے بہت بڑی سعادت بھی ہے اور موجب افتخار بھی۔ اس صدی کے نصف اول میں مغرب کے تہذیبی سیلاب نے عربوں کی ہیئت اجتماعی کو نقصان پہونچایا ہے، اس سے ان کے نسلی اور خاندانی جھگڑے

پھر پیدا ہو گئے، اور انہیں علاقوں، قبیلوں اور جغرافیائی وحدتوں میں تقسیم ہونے کا ایک اور موقع مل گیا، لیکن اسلام کی وہ آفاق گیری جو ایک کو دوسرے سے متعلق اور وابستہ کرتی ہے آج بھی انہیں رشتۂ اخوت میں پروئے ہوئے ہے، اتحاد کے اسی احساس نے صدیوں کی خانہ جنگی اور ذہنی افلاس کے بعد انہیں ایک مقام پر جمع ہونے کا ایک جذبۂ نو عطا کیا ہے، اور یہی ایک ایسا ہتھیار ہے جو مغرب کی ہر یورش کا شدید ہی سے مقابلہ کرتا ہے۔ اگر اسلام کی یہ تمدنی ہمہ گیری نہ ہوتی تو شاید عرب اس دنیا سے دوسری اقوام کی طرح اپنے سیاسی زوال کے ساتھ نابود ہو گئے ہوتے۔

قومی تصور

دنیا کے دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام سب سے زیادہ روادار ہے، اور یہ محض ایک نظری عقیدہ نہیں ہے، بلکہ اس قسم کی ایک نہیں بیسیوں مثالیں ہیں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے مل سکتی ہیں۔ ہسپانیہ میں مسلمانوں کی حکومت کم و بیش آٹھ سو برس تک قائم رہی اور یورپ کی موجودہ تہذیب اور ان کا علمی و ادبی سرمایہ ہسپانیہ ہی کی ترقیوں سے عبارت ہے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے مقامی آبادی پر جبر و تشدد نہیں کیا اور نہ ان سے ان کی مذہبی آزادی ہی چھینی، وہ اپنے افکار و خیالات کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ مشرقی اور جنوبی یورپ میں ترکوں نے بھی سی رواداری کا نمونہ پیش کیا، لیکن اس کے برعکس جب عیسائیوں کو سیاسی اقتدار حاصل ہوا تو مذہبی اور سیاسی حیثوں میں انہوں نے مسلمانوں کی ایک ایک چیز کو مٹانے کی کوشش کی۔ قرطبہ اور غرناطہ سے مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ہی نہیں اٹھا بلکہ اس ملک سے اللہ کا نام لینے والوں کو اس طرح خارج کیا گیا کہ آج اس سرزمین میں ایک مسلمان باقی نہیں۔ پہلی اور دوسری عالم گیر لڑائی کے بعد پولینڈ، یونان، ہنگری اور یوسینا کا بھی یہی حال ہوا۔

ایک ایسی قومیت جو نسل و رنگ اور ایک جغرافیائی وحدت پر قائم ہو کسی وقت بھی مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کے لیے تباہ کن اور مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ اسلام ان انسانی حد بندیوں کو توڑ کر ایک ہیئت اجتماعیہ کے قیام کی تبلیغ کرتا ہے، اس وقت مشرق وسطیٰ میں قومیت کے اسی

موں نے یاس جہتی اور اتحاد کی بعض گم شدہ کڑیوں کو ایک ساتھ ملا دیا ہے، اور عربوں میں
بسانی کار اور اشتراک عمل کا جوہر پیدا کر دیا ہے، جو یقیناً دیر پا نہیں ہوگا۔ لیکن وقت کے
ھارے کو موڑ نے میں وقتی طور پر کامیاب ضرور ہو گیا۔ یہ ابھرتا ہوا جذبۂ قومی ان کی معاشری
ور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں ہے۔ ان ممالک کی ہیئت اجتماعی پر اس کا ایک گہرا اثر
پڑ رہا ہے۔ شعرا نے اپنی عظمت رفتہ کے گیت گائے۔ نثر نگاروں نے اپنی سیاسی اور تمدنی
زندگی کے مرقعے پیش کیے۔

۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں نے سلطنت عثمانیہ کو خالص ترکی رنگ دینے کی کوشش کی
اور سلطنت کے دوسرے عناصر کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ اس سے عربوں کے جذبۂ خودداری کو
ٹھیس لگی۔ استنبول کی مجلس ملی میں عرب نمائندوں نے اس امتیاز کو اپنی آنکھوں سے دیکھا
اور استنبول کی درس گاہوں کے عرب طلبہ نے اس کا خود تجربہ کیا۔ یہ کسک ان کے دل میں کانٹے
کی طرح کھٹکتی رہی اور بالآخر حصول اقتدار کا تو نہیں، لیکن اپنی "حیثیت" کے منوانے کا خیال ان کے
دل میں بھی پیدا ہوا جس نے رفتہ رفتہ ایک بغاوت کی صورت اختیار کر لی۔ عثمانی حکومت
اس قانون شکنی اور بغاوت کو برداشت نہ کر سکی، اس لیے حکومت کی تیوری پر جو بل پڑے وہ
عرب قومی رہنماؤں کی گردنوں پر تلوار بن کر مسلط ہوئے۔

فرنگی اقتدار

اس اندرونی انتشار سے بہر صورت دانایان فرنگ نے فائدہ اٹھایا۔ اور
شریف حسین حجازی اور اس کے لڑکوں کی وساطت سے انگریزوں نے
ترک و عرب کے تنازعات کو ایسی ہوا دی کہ سلطنت عثمانیہ کے دو عظیم الشان گروہ ایک دوسرے
کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ بظاہر انگریزوں نے عربوں کی پاسداری کی بلکہ انہیں کے الفاظ میں
"مظلوموں کا ساتھ دیا اور انہیں ترکوں کے پنجۂ خونین سے بچایا"، لیکن جب بساط سیاست
کے اس شاطر نے دیکھا کہ عربوں نے سلطنت عثمانیہ سے علیحدگی اختیار کر کے یورپ میں ترکوں کی
سیاست کو ایک ایسی ضرب کاری لگائی ہے کہ اس کے بعد ترک اپنے یورپی مقبوضات پر قبضہ

نہیں رہ سکتے تو اب اس نے عربوں کو آنکھیں دکھائیں اور پہلی عالم گیر لڑائی کے بعد عرب کے تمام علاقوں کو براہ راست اپنے انتداب میں لے لیا۔ مصر و عراق، شام و لبنان، اور فلسطین وغیرہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے زیر اثر آ گئے، اور وہ انتدابی علاقوں میں اپنے نظریات، افکار، عقائد اور اپنے رجحانات کو پھیلا کر عربوں کو مفلوج و معطل، ناکارہ اور مفلس بنانے میں مصروف۔ فرانسیسیوں کی نسبت انگریزوں کی یہ سیاسی گرفت زیادہ مضبوط تھی، اس لیے وہ فلسطین میں دوسری عالم گیر لڑائی سے پہلے ہی بالفور اعلان کے مطابق ایک اسرائیلی حکومت کے قیام کے منصوبے باندھنے لگے، اس بندش بندی کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی فلسطین تقسیم کر دیا گیا، اور یہاں ایک یہودی حکومت قائم ہو گئی جس نے عربوں کو ان کے گھر بار سے نکال دیا ہے، اور اب وہ انتہائی افلاس و نکبت کے عالم میں زندگی کا سانس لے رہے ہیں۔ مجلس اقوام متحدہ ان کی نگہداشت اور کھانے پینے اور ان کے آرام و آسائش کا سامان مہیا کرنے کی کوشش کر رہی ہے، مگر اس امداد کی یہ اعانت بھی ان کے لیے مفید ثابت نہ ہو سکی، اس تباہ کاری سے ان کی صفوں میں انتشار ضرور پیدا ہوا۔ مگر قومیت کے اس شدید جذبے نے انہیں اب تک اپنے مشترکہ مفاد کے پیش نظر دوسروں کے مقابلے میں متحد رکھا، غرض نہر سویز اور برطانوی فوجوں کے انخلا کا مسئلہ، فلسطین کی تقسیم، المغرب کی جہد آزادی، یہ وہ مسائل ہیں جن سے عربوں کو روزمرہ دوچار ہونا پڑتا ہے، اس سے ان کے پائے استقامت کو لغزش نہیں ہوئی، بلکہ ہر نئی مصیبت آج ان میں مزید یک جہتی پیدا کر دیتی ہے۔

تعلیم گاہیں

اس جذبۂ قومی نے صرف عربوں کی اجتماعی زندگی ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ اس ملک کے نظام تعلیم اور طریق تعلیم پر بھی ایک نمایاں اثر چھوڑا ہے جو ان کی سماجی زندگی پر تادیر قائم رہے گا، کیوں کہ معلم اور سیاسی رہنما تعلیم گاہوں کو اپنی قومی روایات اور ملی تقاضوں کو بطریق احسن پورا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے ہیں اور حق یہ ہے کہ اگر آنے والی نسلوں کو ایک مخصوص انداز میں تعلیم دے کر ان میں صحیح جذبہ کار پیدا کیا جائے۔ تو وہ

انات کی پہنائیوں کو چیرتے ہوئے اپنے لیے ایک وقیع مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

اس وقت مکتبوں اور مدرسوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اور مستقبل کے شہریوں کو جس عنوان سے تیار کیا جاتا ہے اس سے یہ ضرور اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یاس و نا امیدی اور قنوطیت کے بادل چھٹ چکے ہیں اور اب اعتماد و ایقان کے ساتھ عربی نوجوان زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کرتا ہوا آگے بڑھتا رہے گا، اس لیے مغرب کے سامراجی عزائم کا احساس ہے اور وہ اس کے خلاف صرف آواز ہی نہیں اٹھا رہا، بلکہ قومی اور ملی مفاد کی خاطر وہ اس سیلاب کا سدباب کرنے کی کوشش بھی کر رہا ہے، مغرب کے ہتھیاروں ہی سے مغرب کی استعمار پسندی کو ختم کرنے کا آرزومند ہے اور جس عزم و جوش اور عالی حوصلگی کے ساتھ وہ اس کا مقابلہ کر رہا ہے، وہی عربوں کی آزادی کی بہت بڑی ضمانت ہے، اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ اقوام مغرب کی سامراجی چالیں، عربوں میں پراگندگی اور انتشار نہیں، باہمی اتحاد و اتفاق اور محبت و یگانگت پیدا کرنے میں ممد ثابت ہوئیں اور کوئی طاقت انہیں ان کے اس نصب العین سے ہٹانے میں کامیاب ہو سکتی، یہی وجہ ہے کہ آزادی کے حصول کے لیے المغرب میں آئے دن یورشیں، بغاوتیں اور ہنگامے ہوتے رہتے ہیں، فرانس اس کے باوجود ان علاقوں کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے، اقتدار کی اس ہوس کا انجام کیا ہوگا اس کی تعیین تو آنے والے واقعات سے ہی ہو سکتی ہے۔

دو عالم گیر لڑائیاں

پہلی دو عالم گیر لڑائیوں کے درمیان ان ملکوں میں ایک ذہنی اور سماجی انقلاب آیا جس میں انہوں نے اپنے ملی اور قومی استحکام کے لیے ایک دوسرے سے قریب آنے کی کوشش کی، بیس سال کی اس مختصر مدت میں عربوں نے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی۔ زراعت، صنعت و حرفت اور تعلیم میں جو نمایاں ترقی ہوئی اسے اس صدی کا عجوبہ کہا جا سکتا ہے۔ ترقی کی اس شاہراہ پر ان کی اس تیز رفتاری کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ تعلیم کو ترقی کا سب سے بڑا وسیلہ سمجھتے ہیں، اس لیے ان کی بنیادی قومی ضرورت کو پورا کرنے کے واسطے ہر جگہ حکومت نے اس کی توسیع و ترویج کے سلسلے میں بڑی کوششیں کی ہیں، اور غالباً ان کی یہ کوششیں [illegible] ہیں گی۔

مدرسوں میں طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، تعلیم گاہوں کی مانگ شہروں ہی میں نہیں دیہاتوں میں بھی بڑھ رہی ہے اور موجودہ ادارے اس بڑھتی ہوئی ضرورت کے پیش نظر ناکافی معلوم ہوتے ہیں، لبنان، شام اور دوسرے ممالک اس سلسلے میں بعض اہم تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں مگر اس کے باوجود عوام کے تعلیمی مطالبات کو پورا کرنا اور ایک ایک بچے کے لیے تعلیمی سہولتیں مہیا کرنا آسان نہیں اس کے لیے مسلسل تگ و دو اور بہت کی ضرورت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کیا عرب اپنی اس قومی ضرورت کے خود کفیل ہو سکتے ہیں، کیا وہ اپنے محدود وسائل کے بل بوتے پر اپنی ان معینتوں پر دسترس حاصل کر سکیں گے، کیا ان کی قدیم صحرائی سادگی ان میں اخلاص و جرأت مردی پیدا کر سکے گی کیا ان میں پھر اچھے عالم، فقیہ اور مدبر پیدا ہو سکیں گے، قرائن سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں ایک بار پھر زندہ رہنے کی آرزو پیدا ہو چکی ہے اور اب وہ محض اپنی عظمت رفتہ کے ماتم دار ہی نہیں بلکہ اسے دوبارہ واپس لانے کے خواہش مند بھی ہیں، اس لیے وہ اپنی اس قومی ضرورت کو پورا کرنے میں کسی سے پیچھے نہ رہیں گے، بلکہ اپنے مختلف وسائل و ذرائع کے مطابق اپنے معاشرے میں زندگی کی نئی طرح ڈالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

پرانے مدرسے تعلیم گاہوں کی تاسیس و تعمیر میں عربوں نے مغرب کے جدید ترقی پسند اداروں سے بہت کچھ مستعار لیا ہے۔ اس کے علاوہ قدیم مکتبوں میں زندگی کی نئی قدروں کو بروئے کار لانے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے۔ یہ قدیم ابتدائی مدرسے "کُتّاب" کہلاتے ہیں سیاسی اور فکری زوال کی وجہ سے ان مدرسوں میں جو نصاب اور تعلیم کا طریقہ رائج تھا وہ یقیناً جدید ضروریات کے پورا کرنے سے عاری تھا۔ اس لیے یا تو ان مدرسوں کو جدید قالب میں ڈھال کر اس میں تجدد کی رنگ آمیزی کی گئی ہے۔ یا انہیں یکسر بند کر کے ایک نیا مدرسہ قائم کر دیا گیا ہے، ان جدید ابتدائی مدرسوں میں حساب، جغرافیہ، تاریخ اور دوسرے مضامین کی تدریس کا وافر انتظام ہے۔ لیکن عربی زبان اور دینی تعلیم پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے، کیوں کہ عرب ماہرین تعلیم کے خیال میں عربوں کی ہیئت اجتماعیہ کی تعمیر میں اسلام اور عربی زبان چونے گارے کا کام دیں گے۔

مصر میں تو مغربی طرز تعلیم کا رواج انیسویں صدی کے ربع ثانی میں ہو چکا تھا، اور اس زمانے میں بھی مصری طلبا فرانس میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے جاتے رہتے تھے، اور مصری مدرسوں میں بے شمار فرنگی اساتذہ کام کر رہے تھے، لیکن مصری معاشرے میں مغربی تعلیم اور مغربی طرز فکر کی موجودہ رنگ آمیزی بیسویں صدی کے ربع اول میں ہوئی۔ شام، فلسطین اور لبنان تو خیر براہ راست مغربی اقوام کے انتداب میں تھے، لیکن عراق اور مصر بھی ان کے سیاسی اور تمدنی اثرات سے نہ بچ سکے، اس کے لیے ان علاقوں میں بہت تیزی کے ساتھ مغربی نمونے کے مدرسے قائم ہونے لگے، ان مقامی تعلیم گاہوں کے علاوہ فرنگی مبلغین نے بھی جابجا اپنے مخصوص نظریات کی ترویج کے لیے بے شمار ادارے کھولے، قاہرہ بغداد بصرہ، دمشق اور بیروت میں اس قسم کے بہت سے ادارے قائم ہوئے، شام میں تو یہ غیر ملکی ادارے ایک ایک کر کے ٹوٹ چکے ہیں۔ لیکن دوسرے ملکوں میں ابھی اسی طرح باقی ہیں، مثلاً قاہرہ اور بیروت میں "جامعۂ امریکی" اسی قسم کا ایک ادارہ ہے جو اپنے نصاب اور نظام کار میں بالکل آزاد ہے، ان اداروں نے مغربی علوم و فنون اور مغربی فلسفۂ حیات کو رواج دینے میں ایک اہم پارٹ ادا کیا ہے، اس لیے اگر مختلف ممالک میں انگریزی یا فرانسیسی نظام تعلیم کی پیروی کی جا رہی ہے تو کوئی مقام تعجب نہیں، جو لوگ مغربی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں انہیں مغربی افکار و خیالات سے متاثر ہونا ضروری ہے جب یہ لوگ اپنے ملکوں میں آ کر تعلیمی اصلاح کا کام شروع کرتے ہیں تو شعوری یا غیر شعوری طور پر اس نظام تعلیم کی جلوہ نمائی ہوتی ہے لیکن مغربی نظام تعلیم کی یہ درآمد مشرقی نظام تعلیم کے قالب پر پوری نہیں اترتی کیوں کہ مغربی نظام ایک خاص ماحول اور ملک کے باشندوں کی خاص ضروریات کو پورا کرنے کے لیے صدیوں کی کد و کاوش کے بعد موجودہ شکل اختیار کر سکا، اس لیے یہ نظام تعلیم خواہ مغربی ممالک کے لیے کتنا ہی وقیع اور ان کی قومی ضروریات کا مکتفی کیوں نہ ہو، دوسرے ممالک کے لیے اس کی اہمیت ہمیشہ کم ہو جاتی ہے۔

پاکستان اور ہندوستان میں مغربی طرز تعلیم کی پیروی کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے بلکہ اسی تعلیم کے زیر اثر قوم میں ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہو گیا ہے جو تجدد کی رو میں ہر چیز کو مغربی

نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کا اور مغربی معیار پر پرکھنے کا عادی ہو چکا ہے، اگرچہ اس تقلید سے آج تک
کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہو سکی جس سے پوری قوم متمتع ہو سکتی، اس لیے اپنے قومی تقاضوں کو پورا
کرنے کے لیے اپنی ضروریات کے مطابق مغربی خطوط پر چل کر ایک نئے نظام کار کی بنیاد ڈالنے کی اہمیت سے
انکار نہیں کیا جا سکتا۔ صرف مغرب کا خول اوڑھ لینا ہی ترقی و تعمیر کی ضمانت نہیں بلکہ تعمیر و تجدد کے لیے
تو اس مغربی آدرش کو اپنانے کی اور اسے اپنی زندگی کا ایک جزو بنانے کی ضرورت ہے جو انسان کو
آمادۂ کار بنا کر پہاڑوں سے ٹکرانے کا حوصلہ پیدا کر سکے، بہر صورت عرب ممالک میں جو نظام تعلیم
رائج ہے اس میں بڑی قطع و برید کی ضرورت ہے لیکن یہ مختلف نظام تعلیم اتنے پرانے نہیں ہیں کہ
وقت کی رفتار ان میں مناسب ترمیم و اضافے کر کے اسے اپنی ضروریات کے مطابق ڈھال سکتی، ان میں
بعض تو نہایت جدید ہیں اور ان کی عمر بیس پچیس برس سے زیادہ نہیں، اس لیے آگے چل کر ان میں
بتدریج ترقی اور تبدیلیوں کے امکانات کافی روشن ہیں۔

تربیت یافتہ مدرسین

ہر ملک کی وزارت معارف تربیت یافتہ مدرسین کی فراہمی کے سلسلے میں بظاہر
اپنا پورا زور صرف کر رہی ہے، لیکن ابھی تک یہ ضرورت پوری نہیں ہو سکی، اس کی
ایک وجہ یہ ہے کہ وزارت تعلیم کے کارکن اور تعلیمی نظام کار کو مرتب کرنے والے تعلیم یافتہ تو ہوتے ہیں
اور ان کے پاس اونچی اونچی ڈگریاں اور سندیں بھی ہوتی ہیں لیکن حق یہ ہے کہ ان میں فلسفۂ تعلیم
اصول تعلیم اور تعلیمی نفسیات کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اس کا صحیح شعور اسی کے ذہن
میں پیدا ہو سکتا ہے جو موجودہ تعلیم کی تکنیک سے واقف ہو، جو طریق تعلیم، ترتیب نصاب اور نظم و نسق
کے مختلف مسائل سے کماحقہٗ آشنا ہو، اگر ایسے ماہر محکمۂ تعلیم میں موجود نہ ہوں تو تعلیمی ترقی کے وسائل

محدود سے

محدود تر ہو جاتے ہیں بعض عرب ممالک میں تربیت اساتذہ کی طرف بالکل ہی توجہ نہیں دی جاتی
اور بعض ممالک ایسے ہیں جہاں اس طرف تھوڑی بہت توجہ تو دی جاتی ہے۔ مگر اتنی نہیں کہ وہ
ملک کی تعلیمی ضروریات کو پورا کر سکیں، اس لیے مقامی ماہرین تعلیم کو اپنے مسائل، اپنے ماحول اور

یجی ضروریات کے سمجھنے کی بہت ہی زیادہ ضرورت ہے۔ اس تجربے کے بعد وہ بڑی آسانی سے اپنے ماحول میں ایک اہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ اگر عربی زبان کی تدریس کو اور سادہ اور آسان اور مزید سہل بنا دیا جائے تو ہر ملک تعلیمی اعتبار سے بہت زیادہ ترقی کر سکتا ہے۔

عربی زبان

ان ممالک کے نظامِ تعلیم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے عربی زبان کو اپنانے کی پوری پوری کوشش کی ہے، عربی زبان کی ترقی و توسیع کو وہ اپنی قومی ترقی کی خشتِ اول سمجھتے ہیں، اور اسی احساس پر وہ اپنی ہمہ گیر ترقی کی بنیاد رکھتے ہیں، دوسری دل خوش کن اور مفید مطلب بات یہ ہے کہ کم و بیش ہر ملک میں ابتدائی اور ثانوی مدارس سے قطع نظر اعلیٰ تعلیم کا ذریعۂ تعلیم بھی عربی ہے عربی ایک مکمل اور قدیم زبان ہے لیکن چونکہ مسلمانوں کے سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ ایک مدتِ مدید سے اس میں ادب سائنس اور فلسفہ کے موضوعات پر کوئی قابلِ قدر کتاب نہیں لکھی گئی اس لیے اسالیبِ بیان، اور اصطلاحات میں بعض اوقات اس کا دامن تہی نظر آتا ہے، مگر اس زبان میں آج بھی آگے بڑھنے کی بڑی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اس لیے جو الفاظ اور اصطلاح قدیم عربی زبان میں دستیاب نہیں ہوتیں ان کے لیے نئے الفاظ اور نئی اصطلاحیں وضع کرنے کا کام تیزی سے جاری ہے، کیونکہ عربی زبان ہی دجلہ سے اوقیانوس اور کوہ قاف سے بحرِ ہند تک بسنے والی قوم میں اتحاد و تنظیم و ضبط رکھنے کا واحد ذریعہ ہے۔

پچھلے دنوں لاہور کے ایک مدرسے کے جلسۂ تقسیمِ اسناد میں تقریر کرتے ہوئے پنجاب کے وزیرِ تعلیم نے اردو کی تدریس پر زور دینے کی طرف محکمۂ تعلیم کے ذمہ دار افسروں اور اساتذہ کے تربیتی کالج کے اربابِ حل و عقد کی توجہ دلائی ہے اور کہا ہے کہ انگریزی زبان سیکھنے میں بچے جو اپنی قوتیں ضائع کر دیتے ہیں وہ کسی دوسرے مضمون کی تحصیل میں صرف کر کے اس میں کمال پیدا کر سکتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہماری مغرب زدگی، ہماری قومی ضروریات کی تکمیل کی راہ میں مانع تو نہیں آئی؟ اگر آج بھی ہمیں انگریزی ہی کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر اصرار رہا تو ہماری ترقی کے تمام تر راستے مسدود ہو جائیں گے، اور ہم ترقی یافتہ قوموں سے کبھی آنکھیں نہ ملا سکیں گے، کیونکہ ان کا معیارِ تعلیم ا

اور ان کا منتشر عمر بھر انگریزی زبان سیکھنے ہی میں صرف کر دیتا ہے۔ مضمون کی ماہیت اور اس کی کنہ تک پہونچنا بڑے دور از کار اور بعید از قیاس بات ہے۔ ترقی یافتہ قوموں کے لیے اپنے حالات کا جائزہ لے کر اپنی بولی میں تعلیم دینا قومی مفاد کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں عربوں کی اس مثال سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

جہالت کیسے دور کی جائے

غیر ترقی یافتہ ملکوں میں عدم واقفیت اور جہالت ایک ایسی بے پری ہے جو ترقی کے تمام تر راستے مسدود کر دیتی ہے۔ عربوں کو بھی اس قسم کے مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، ایک طرف تو اس اہم قومی ضرورت کی طرف توجہ دینا کہ عوام کی ایک بہت بڑی تعداد کو جہالت کی تاریکیوں سے نکالا جائے اور دوسری طرف ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد ایک مسئلہ ہے جس سے عہدہ برآ ہونا بظاہر تو مشکل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر توجہ اور ہمت سے کام لیا جائے تو ان پڑھ عوام کو پڑھا دینا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو حل نہ ہو سکے، دوسری قوموں نے بھی آخر اپنی ہمت و مساعی سے سب کچھ حاصل کیا ہے، ان قوموں کے نقوش قدم پر چل کر اپنے ماحول اور اپنی ضروریات کے مطابق عوام کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ، مہذب اور متمدن بنایا جا سکتا ہے۔ بہر طور عرب ممالک میں بھی اب جہالت کو دور کرنے کی پوری پوری کوشش کی جا رہی ہے۔

ابتدائی مدارس میں بچوں کا تناسب

ملک	آبادی	ابتدائی مدرسوں میں پڑھنے والے بچے	وہ بچے جو مدرسوں میں پڑھتے ہیں	تناسب
مصر	۱۸,۰۰۰,۰۰۰	۲,۸۷۰,۰۰۰	۱,۳۶۰,۰۰۰	۴۷٫۴
عراق	۴,۵۰۰,۰۰۰	۶۷۵,۰۰۰	۱۳۵,۰۰۰	۲۰٫۰
شام	۳,۰۰۰,۰۰۰	۳۷۵,۰۰۰	۱۴۸,۰۰۰	۳۹٫۴
لبنان	۱,۱۰۰,۰۰۰	۱۶۵,۰۰۰	۱۲۰,۰۰۰	۷۲٫۷
شرق اردن	۴۰۰,۰۰۰	۵۰,۰۰۰	۱۴,۰۰۰	۲۸٫۰
فلسطین (عربیہ)	۱,۲۵۰,۰۰۰	۲۰۷,۰۰۰	۱۰۷,۰۰۰	۵۱٫۶

لبنان کی مختصر سی آبادی عرب ممالک میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے، یہاں لوگوں تعلیم و تمدن اور علم و فن سے روشناس کرانے کی جو مہم جاری ہے وہ اسے بہت جلد ترقی یافتہ اور متمدن بنا دے گی۔ اس طرح اسے آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا وافر بندوبست کرنے میں بھی کامیابی حاصل ہو جائے گی، فلسطین (عرب) میں بھی تعلیمی ترقی ممکن تھی مگر اس علاقے سے عربوں کے انخلا کے بعد ان کے یہاں تعلیمی سہولتیں بھی باقی نہیں رہ گئیں، عربوں کی ایک بہت بڑی تعداد اپنے گھروں، گاؤں اور شہروں سے نکل کر خیموں میں آباد ہے، جہاں ان کی ضروریات زندگی بھی مشکل سے پوری ہوتی ہیں، ان حالات میں تعلیمی ترقی و توسیع کی جانب توجہ دینا بہت ہی مشکل ہے۔ اقوام متحدہ کے عالمی ادارہ مہاجرین انہیں از سر نو آباد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر یہ کوششیں یہودیوں کے مسلسل مظالم کے آگے اب تک ناکام ثابت ہو رہی ہیں، ان دونوں ملکوں کے علاوہ دوسرے ممالک میں تعلیمی ترقی آسان نہیں، اس کے لیے ایک طویل اور دشوار گذار راستہ طے کرنا ہوگا۔ مثلاً اگر مصر میں تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کی جائے اور مدرسوں میں بچوں کی حاضری لازمی قرار دی جائے، اس مقصد کے حصول کے لیے مصر کو اپنی آمدنی کا ایک چوتھائی صرف کر دینا ہوگا، اور ملک کو دفاعی ضروریات کے پیش نظر اتنی بڑی رقم کا خرچ کرنا یقینا ہر ممکن معلوم نہیں ہوتا، عراق میں ابتدائی تعلیم لازمی ہے، لیکن اب تک اس قانون کی قانونی حیثیت مسلم نہیں ہو سکی، اس کی وجہ کچھ تو عوام کی بدویانہ زندگی اور کچھ وسائل کی کمی ہے، اس لیے اس عوامی ضرورت کی طرف حکومت اب تک قابل قدر توجہ نہیں دے سکی۔

دراصل کسی ملک کی تعلیمی ترقی کا انحصار اس کے مالی استحکام پر ہوتا ہے، اگر ملک کی اقتصادی اور معاشی حالت درست ہو، انسان کی روزمرہ ضروریات پوری ہوتی رہتی ہوں تو حکومت اپنی تمام تر قوت تعلیمی سدھار پر صرف کر سکتی ہے۔ یعنی اگر ملک زرعی اور صنعتی اعتبار سے پس ماندہ ہے اور اپنی روزمرہ ضروریات کے لیے دوسروں کا دست نگر ہے تو اس کی تعلیمی ترقی

ایک دیوانے کے خواب سے زیادہ وقیع نہیں ہو سکتی، اس لیے ان ملکوں کا بھی صنعتی اور زرعی لحاظ سے ترقی کرنا ازبس ضروری ہے۔ اگر زرعی پیداوار میں اضافہ نہ ہوا تو اشیائے خوردونوش کے لیے بھی دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑے گا۔ اندریں حالات تعلیمی لحاظ سے ملک کی ترقی کیوں کر ممکن ہے۔ یورپ اور امریکہ میں بھی ابتدائی لازمی تعلیم اس وقت کامیاب ہوئی جب ملک زرعی اور صنعتی لحاظ سے ترقی کر گیا۔

تعلیم بالغاں

عرب ممالک میں اس وقت ایک بہت بڑی تعداد جاہل اور غیر تعلیم یافتہ بالغ عوام کی ہے۔ بچوں کو زندگی کے ابتدائی ایام ہی سے حصول تعلیم کا خوگر بنا کر انہیں علم حاصل کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے، لیکن جو لوگ اپنی عمر کی آدھی سے زیادہ منزلیں طے کر چکے ہیں، کیوں کر تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور ان کی تعلیم کے بغیر ملک میں تعلیم پھیلانا ممکن نہیں۔ عراق میں تعلیم بالغاں کے مراکز قائم ہوئے اور اس سلسلے میں اچھا خاصہ کام بھی ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس میں جوش اور عزم باقی نہ رہا۔ چنانچہ اب تعلیم بالغاں کا تسلسل بھی وزارت معارف کے روزمرہ کے کاموں میں ہونے لگا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں مصر کی وزارت معارف نے تعلیم بالغاں کی ایک وسیع اسکیم مرتب کی، لیکن ملک کے سیاسی اور اقتصادی حالات نے انہیں اسے بروئے کار لانے کا موقع نہ دیا۔ اس سلسلے میں اب تک جو کچھ حاصل ہوا، یا جس کے حصول کی توقع ہے اس سے منزل کی نشان دہی تو ہو جاتی ہے، لیکن منزل تک پہونچنے کا مسئلہ ہنوز ایک مسئلہ ہے، یہی حال بلکہ اس سے بدتر حال دوسرے ملکوں کا ہے۔

ابتدائی مدارس

عرب ممالک کے ابتدائی مدارس میں جو نصاب رائج ہے اور جو طریق تعلیم مروج ہے اسے ہر کلی طور پر صحت مند نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ اس عہد میں کبھی ان مدرسوں کا معیار تعلیم اتنا بلند نہیں جو ان کی معاشرتی ضروریات کو پورا کر سکے۔ آج ہر ملک اور ہر قوم کو ایسے بالغ نظر شہریوں کی ضرورت ہے جو ملک کی معاشرتی، مدنی، اخلاقی اور اقتصادی ترقی کے ضامن ہوں، لیکن مصر و شام اور دوسرے عرب ممالک میں یہ

بذریۂ خود کاری مفقود ہے جو نصاب مدرسوں میں رائج ہے، اس کا مقصد طلبہ کو ایک مخصوص امتحان لے لیے تیار کرنا ہے، ان کی ہمہ گیر نشو و نما اور ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل ان کا منتہائے نظر نہیں، یہ نصاب بالعموم مغربی ممالک کے نصاب سے مستعار لیا گیا ہے اور محض کہیں کہیں مقامی ضروریات کے مطابق اس میں تھوڑی بہت تبدیلی کر دی گئی ہے ورنہ اس کی روح وہی ہے یہ معمولی سی تبدیلی عربی زبان اور ممالک عربیہ کے جغرافیہ کی تدریس ہے، فلسطین کے ابتدائی مدارس نے البتہ اس سلسلے میں ایک نمایاں ترقی کی ہے، یہاں ۸۰۰ مدرسوں میں ایک ایک چھوٹا سا باغ ہے، جہاں بچے باغبانی کرتے ہیں اور کیاریاں بنانے زمین تیار کرنے اور بیج بونے کی عملی تربیت حاصل کرتے ہیں، ابتدائی تعلیم، نصاب مخصوص ماحول اور زرعی ضروریات کے مطابق مرتب ہونا چاہیے، ورنہ زبان و تاریخ یا ریاضی اور جغرافیہ کی تدریس سے بچوں میں وہ سماجی شعور اور شہریت کا تصور پیدا نہیں ہوگا جس کی قوم کو سب سے زیادہ ضرورت ہے، اگر بچوں کے اخلاق اور کردار میں بالیدگی اور عالی حوصلگی پیدا نہ ہوئی تو معاشری ترقی کی رفتار کے سست ہی نہیں یکسر منقطع ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

ابتدائی مدرسوں میں دوسرا مسئلہ ہر درجہ میں بچوں کی ایک کثیر تعداد کا ناکام یاب ہوجانا ہے، یعنی بچے ایک مخصوص نصاب پڑھنے کے بعد اپنی شخصیت میں اتنا تنوع پیدا نہیں کر سکتے کہ وہ مقررہ معیار پر پورے اتریں، اس لیے انھیں اس درجے میں روک دیا جاتا ہے، اس کے علاوہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ابتدائی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد طلبہ کی ایک بہت بڑی تعداد ثانوی مدارس میں داخل ہونے سے محروم رہ جاتی ہے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں طلبہ ابتدائی مدارس کے پہلے درجے میں داخل ہوتے ہیں لیکن پانچویں درجے میں یہ تعداد آدھی بھی نہیں رہ جاتی، اس کے کئی اسباب ہیں، پہلا سبب تو یہ ہے کہ عام طور پر والدین کی اقتصادی حالت اتنی اچھی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے بچوں کو صحیح اور وافر تعلیم دلا سکیں، اس لیے دس گیارہ سال کی عمر میں ان کے والدین ان سے ایسے کام لینے لگتے ہیں جس میں وہ ان کی امداد کر سکیں،

اور خاندان کی معاشی کفالت کے لیے کچھ کما کر لا سکیں۔ دوسرا سبب نصاب کا غیر دلچسپ اور دور از
ہونا ہے۔ اس سے بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد امتحان میں کامیاب نہیں ہوتی۔ بعض کچھ اتنے
دل برداشتہ ہو جاتے ہیں کہ وہ تعلیم و تعلم میں دلچسپی لینا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح ابتدائی
مدارس ہی میں بچوں کی عمریں بڑھتی رہتی ہیں۔ کم و بیش ہر ملک میں ابتدائی تعلیم کا زمانۂ تدریس
سات سے آٹھ سال کی مدت ہوتی ہے۔ یعنی اگر ایک بچہ مسلسل ترقی کرتا جائے تو بارہ یا تیرہ سال
کی عمر میں ثانوی مدرسہ میں پہونچتا ہے اور اگر وہ رک رک کر آگے پڑھا، اور عام چلن یہی ہے
تو ایک ہی درجے کے بچوں کی عمروں میں اتنا اختلاف ہو جاتا ہے کہ یہ بھی ان کی سماجی ذہنی
اور اخلاقی ترقی کے منافی ہے۔

ان مدارس کے نصاب اور معیار تعلیم پر تنقیدیں تو اکثر ہوتی رہتی ہیں اور یہ بھی کہا جاتا
ہے کہ یہ تعلیم بچوں کی تفہیم سے بالاتر ہے، لیکن اس کے باوجود اسے بچوں کی ذہنی سطح اور مقامی
ضروریات کے مطابق لانے کی اب تک کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اس لیے تعلیم کا مقصد محض
ملازمت حاصل کرنا ہی رہ گیا ہے۔ کیونکہ چھنتے چھنتے جو بچے ثانوی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے
میں کامیاب ہو جاتے ہیں ان کی نگاہیں محض ایک موہوم حکومت کے تصور سے خیرہ ہو جاتی
ہیں اور وہ اس کو اپنی زندگی کا مقصد اور اپنی آخری منزل تصور کر لیتے ہیں۔ ان کے علاوہ
جو بچے مختلف درجوں میں ناکامیاب ہوتے رہتے ہیں انہیں تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) ایسے طلبہ جو مختلف درجوں میں ناکام ہوتے رہتے ہیں لیکن اپنی دھن میں لگے رہتے ہیں تا آنکہ
وہ ثانوی اور بعض حالات میں اعلیٰ تعلیم گاہوں میں پہونچ جاتے ہیں۔

(۲) ایسے طلبہ جو ابتدائی درجوں یا ثانوی مدارس میں رہ جاتے ہیں لیکن اپنے ہاتھ سے کام
کرنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔

(۳) ایسے طلبہ جو ابتدائی درجوں ہی سے تعلیم چھوڑ دیتے ہیں اور بالکل جاہل رہ جاتے ہیں، اور
پھر کسان، مزدور یا دستکار بن جاتے ہیں۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اب تک کسی حکومت نے بچوں کی صلاحیتوں، دلچسپیوں اور ضروریات کے مطابق، یا ملک کی اقتصادی، مالی، سماجی اور معاشی ضروریات کے پیش نظر کوئی نصاب تعلیم مرتب نہیں کیا۔ یہ ایک المناک حقیقت ہے جس کا تجزیہ یہ ضروری ہے، ورنہ کچھ دنوں بعد تعلیم و تربیت کی اس عالی شان عمارت کا گر جانا یقینی ہے۔

عرب ممالک میں ابتدائی تعلیم بھی ایک نظام اور ایک مرکز کے تابع ہے، ملک کے ایک ایک مدرسے کا نصاب ایک ہی ہوتا ہے۔ مغربی ماہرین تعلیم عربوں کے اس مرکزی نظام پر سب سے زیادہ نکتہ چینی کرتے ہیں اور اس کی توجیہہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہر علاقے کی ضروریات ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ کسی زرعی ماحول میں صنعتی مدارس کا نصاب متعین نہیں ہو سکتا، اسی طرح کسی زرعی علاقے میں صنعتی نصاب بے وقیع ہوگا، یہ اعتراض ایک حد تک درست ہے لیکن اس وقت عربوں کو جس اتحاد اور جس تعاون کی ضرورت ہے، اس کے لیے ایک ایسی مشترکہ شہریت کی ضرورت ہے جو باہمی اتحاد و اتفاق کی سب سے بڑی علمبردار ہو، اور اس کے حصول کے لیے اگر بعض مقامی ضروریات کو قربان کرنا پڑے تو یہ کوئی ایسی اہم قربانی نہیں، اس کے باوجود ابتدائی مدارس میں بچوں کے ماحول ان کے فطری تقاضوں اور ان کی ضروریات کو ملحوظ رکھنا بھی کم اہم نہیں، اس لیے حسب ضرورت اگر نصاب کے بنیادی مقاصد کی حدود میں کسی معمولی اور فروعی تبدیلی سے اچھے نتائج کی توقع ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (مسلسل)

بچوں کی نفسیات اور تعمیر ملی

ڈاکٹر عبدالرؤف

بچہ کیا ہے؟ اس کی ذہنی دنیا میں کیا کیا خیال بستے ہیں؟ اسے کام کی تحریک کیسے ہوتی ہے؟ کن باتوں سے اسے خوشی حاصل ہوتی ہے اور کون کون سی باتیں اس پر ناگوار اثر ڈالتی ہیں؟ ایک بھلے مانس شہری بننے کے لیے بچے کی تعلیم و تربیت کو کن خاکوں پر ڈھالا جائے، اسے بری عادات سے کیسے محفوظ رکھا جائے اور نیک عادات کی تربیت کیسے دی جائے؟ بچے کے لیے مناسب کھیل اور تفریح کے سامان کیسے مہیا کیے جائیں؟ بچوں کی فلاح و بہبود کے بارے میں والدین اور معلم کی رہنمائی کیسے ہو؟ بچوں کی نفسیات کا ماہر ان سب باتوں کی سائنسی تحقیق کرتا ہے اور نشوونما اور ذہنی صحت کے مختلف مدارج میں بچوں کی مدد کرتا ہے۔

بچے کی زندگی مندرجہ ذیل تین قسم کے ماحول میں بسر ہوتی ہے۔

اول - گھر

دوئم - محلہ - گلی - کھیل کا میدان وغیرہ

سوئم - مدرسہ

بچہ اپنی معاشرتی زندگی گھر سے شروع کرتا ہے، عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی سمجھ بوجھ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ گھر میں اپنے اردگرد کی اشیاء میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے، تجربہ اور قوت گویائی میں ترقی کے ساتھ ساتھ بچے کو چیزوں کے ناموں سے بھی واقفیت ہوتی جاتی ہے، ابتدا میں اسے ہر بات اور ہر شے نئی معلوم ہوتی ہے، وہ امّی پر سوالوں کی یلغار کرتا رہتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ وہ کون ہے؟ اسے کیا کہتے ہیں۔ وہ ماں جو ان سوالوں کی اہمیت سمجھنے کی کوشش نہ کرے اور معقول جواب دینے کی بجائے بچے کو ٹالتی رہے، بچوں کی پرورش کے بارے میں بہت سنگین غلطی کی

مرتکب ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ بچے کے ہر سوال اور ہر تجسس کی تشفی کرنا بھی ایک مستقل دردِ سر سے
کم نہیں۔ مگر ٹال مٹول اور غلط بیانی سے بچے کی ذہنیت کا ان سمتوں میں بڑھ جانے کا احتمال ہے، جو
آئندہ چل کر کسی نہ کسی صورت خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً بچہ کھیلتے کھیلتے باورچی خانے میں
گھسنے ہی لگا تھا کہ آپ نے اسے "ہوں" کہہ کر روک دیا۔ وہ رکتا ہے۔ پھر آپ کی طرف دیکھتا ہے۔
اور اندر کی طرف بڑھنے پر مصر دکھائی پڑتا ہے تو آپ اسے ڈرا دھمکا کر روک لیتے ہیں۔ باورچی خانے
میں جا کر ننھے نے جو ادھم مچانا تھا، اس سے آپ کو وقتی نجات تو مل گئی۔ مگر آپ نے کبھی یہ نہ سوچا
کہ آپ کی آئے دن کی دھمکیوں سے بچے کے اندر بیجا وہم اور مبہم خوفوں کو پلنے کا موقع مل جاتا ہے۔
اسی طرح شرارتی۔ بھگوڑے اور کھانے میں ضد کرنے والے بچوں کو ہمارے ہاں جن غیر معقول طریقوں
سے "سیدھا" کیا جاتا ہے، وہ کسی طرح بھی قرینِ مصلحت نہیں ہیں۔

مجھے یاد آ گیا لندن میں ہمارے کلینک میں ایک سیم صاحبہ اپنے دو بھگوڑے بچوں کو لائیں
بچے دن میں کئی بار گھر سے چپکے چپکے کھسک جایا کرتے تھے، اور ماں کی آنکھ بچا کر ڈبل روٹی اور کھانے
کی ایک آدھ چیز اڑا کر ساتھ رکھ لیتے تھے، ماں ان کی غیر حاضری میں پریشان رہتی۔ لیکن جب وہ
گھر میں موجود ہوتے تو اپنی ننھی بہن کو خواہ مخواہ ستاتے رہتے اور طرح طرح کی شرارتوں اور دھینگا مشتیوں
سے سارے گھر کا انتظام درہم برہم رکھتے تھے، بیچاری ماں عجب مخمصے میں گرفتار تھی، اس کے لیے
بچوں کا گھر کے اندر یا باہر رہنا دونوں صورتیں تکلیف دہ بنی ہوئی تھیں۔ میں نے اس خاندان اور
ان کے مکان کا مختصر سا جائزہ لیا۔ والدین سے ملاقات کی پھر بچوں سے بے تکلف ہوا، اور ان کی
تکلیف پر تحقیق شروع کی، جب بچے گھر سے کھسکتے تو میں بھی چپکے چپکے ان کے پیچھے ہو لیتا۔ میں نے
دیکھا کہ وہ دور جا کر ایک بم زدہ عمارت میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں ایک میلا کچیلا کتا دُم
ہلا ہلا کر ان کا استقبال کرتا۔ بچے اسے چرائی ہوئی چیزیں کھانے کو پیش کرتے اور پھر اس سے
پہروں کھیلتے رہتے، میں کئی دن یہ تماشا دیکھتا رہا، معاملہ بھانپ لیا ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ
بچوں کے لیے گھر میں دلچسپی کا کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ چھوٹی بہن کی پیدائش کے بعد انہیں یہ

وہم ہوگیا تھا کہ والدین نو وارد ہ سے ترجیحی سلوک روا رکھتے ہیں۔ یم زدہ مکان میں غلیظ کتے سے کھیل کر انہیں کچھ فرحت حاصل ہوتی تھی۔ مگر جب وہ گھر لوٹتے اور چوری اور بھاگنے پر امّی ان کے کان کھینچتی تو وہ اس ناانصافی کا انتقام ننھی کو تنگ کرنے اور گھر میں اودھم مچانے کی صورت میں لیتے تھے۔ معاملہ جب حد سے بڑھنے لگا تو والدہ نے ہمارے کلینک سے مشورہ طلب کیا۔ میں نے بچوں کی ماں کو پالتو کتا رکھنے کا مشورہ دیا۔ مگر معلوم ہوا کہ بچوں کے والد گھر میں پالتو جانور رکھنے کے مخالف تھے۔ اتفاق سے ان ہی دنوں لندن کے ایک سینما میں ایک نفسیاتی فلم (KIDNE PPESS) کی نمائش ہو رہی تھی جس میں گھریلو فضا کو بچوں کی دلچسپیوں سے خالی رکھنے کے مہلک نتائج کو نہایت عام فہم انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ میرے اصرار پر والدین نے اس فلم کو دیکھا۔ میری تجویز کے افادی پہلو انہیں سمجھ میں آنے لگے تو انہوں نے بچوں کے متعلق اپنا رویہ بدل لیا اور ایک چھوٹا سا کتا بھی خرید لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہفتوں کے اندر اندر وہی کھبی اور جھگوڑے بچے سدھرنے لگے۔ بچوں کی نفسیاتی رہبری کے لیے ان کے والدین کی رہنمائی بھی بے حد ضروری ہے۔ بسا اوقات بچوں کی مشکلات کا اصل سبب والدین کی بے شعوری ہوتی ہے اور بے شعور والدین کو سمجھانے کے لیے باتوں، کتابوں اور فلم وغیرہ سے بھی بخوبی کام لیا جا سکتا ہے۔

کام کے سلسلے میں لاہور کے گلی کوچوں میں گھومنے کا بہت موقع ملتا رہتا ہے، ہمارے اکثر بچے گندی گلیوں میں، نالی کے کناروں اور کوڑے کرکٹ کے متعفن ڈھیروں کے قریب بے تکلفی سے کھیلتے نظر آتے ہیں، بچے کھیل کود کی انہی غلیظ جگہوں سے گالی گلوچ، ہاتھا پائی اور بدنظمی کی تربیت لیتے ہیں۔ یہی بچے آئندہ چل کر غلیظ عادات کے چنگل میں پھنسے رہتے ہیں، ہماری اوسط گلی میں بچوں کے کھیل کود کا عام پروگرام کچھ یوں شروع ہوتا ہے، صبح ہوتے ہی درجنوں چھوٹے چھوٹے بچے کسی بڑے مکان کے دروازے، گلی کی نکڑ یا کنوئیں کی منڈیر پر جمع ہونے شروع ہو جاتے ہیں اتنے میں کوئی سودا فروش مرمرہ، گنا، ریوڑی اور مکھیوں سے بھری پڑی چھابڑی نالی کے کنارے لگا کر بیٹھ جاتا ہے، بچے اس گندی منڈی ٹک شاپ کے اردگرد منڈلاتے رہتے ہیں، کبھی کبھی

ریب ہی سے کوئی اعلان گونجنے لگتا ہے "دیا لو کر ڈیو الکیر و نڈ ی دی لے جاؤ" تو یہ جم غفیر کچھ دیر کے لیے اس مکان کا رخ کر لیتا ہے اور وہاں جس بے شعوری اور بدتہذیبی سے انہیں یہ چیز یا سٹی باتی ہے اس کا خاکہ کھینچا جائے تو عقل سشر کے مختل ہو جائے۔ گلی میں کوئی موٹر یا تانگہ آ نکلے تو لئ بچے اس کے پیچھے لٹکنا شروع کر دیتے ہیں۔ گلی کی دیواروں پر ایچو چیچ کھیلا جاتا ہے اور تحریر کی مشق کے لیے عام فہم زبان میں ابتدائی گالیاں لکھی جاتی ہیں بجلی کی تاروں پر کانٹیاں پھینکی جاتی ہیں ریڑی کا اڈا، اور گلی ڈنڈا کھیلتے وقت بچے نہایت بے تکلفی سے نالی میں ہاتھ ڈالتے رہے ہیں کھیل کے دوران میں جھگڑے والی باتیں عموماً باہمی گالی گلوچ اور ہلکی پھلکی ہاتھا پائی سے طے ہو جاتی ہیں قصہ مختصر بچے اس تفریح کے ساتھ ساتھ خودبخود بری عادات اور بدنظمی میں بھی تربیت حاصل کرتے چلے جاتے ہیں، لیبا اوقات بچوں کے باہمی جھگڑے زیادہ تشویشناک صورت اختیار کر جاتے ہیں تو بچوں کی حمایت میں والدین بھی طرح طرح کی بداخلاقیوں اور لڑائی جھگڑوں پر اتر آتے ہیں، ایسے ہی گلی ہماری معاشرت کے اس افسوس ناک پہلو کی عکاسی کرنے لگتی ہے جو ہماری فوری توجہ کی مستحق ہے اور جس کا سائنسی مطالعہ اور مناسب علاج ہم آج تک نظر انداز کرتے چلے آئے ہیں۔

بچوں کی نفسیات کا ماہر ایسی کھیلوں کے خطرناک نتائج سے بخوبی واقف ہوتا ہے جس میں تفریح کے ساتھ ساتھ بچوں کی عادات و خصائل نامناسب سمتوں میں ڈھلنے لگیں۔ ہر محلے اور ہر گلی کے قرب و جوار میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی بنا بنایا پارک یا قطعۂ زمین ڈھونڈا جا سکتا ہے جسے بچوں کے کھیل کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ غلیظ ماحول کی غیر منظم فضا کے گندے مندے کھیلوں میں پڑ کر بچے کی شخصیت اور اخلاق پر بہت ناگوار اور دیرپا اثر پڑتا ہے، ایسا بچہ بڑا ہو کر زندگی کو کسی اصول اور تنظیم کے تحت بسر کرنے کے قطعی نااہل ثابت ہوتا ہے، صاف ستھرا کھیل کا میدان ہی مناسب درس گاہ ہے، جہاں ایک دوسرے سے مل جل کر خوشی خوشی کام کرنے کے جمہوری اصولوں کی عملی تربیت ہوتی ہے۔ گندی نالیوں سے گھری ہوئی تنگ گلی اس اہم تربیت کے لیے یقیناً نامناسب مقام ہے بلکہ اب مجرمانہ رجحانوں کا اڈہ بن گئی ہے، پاکستان

اور برطانیہ کے بورسٹل جیلوں اور عام مدرسوں کے بگڑے ہوئے بچوں کے نفسیاتی جائزوں کے بعد مجھے اس بات میں کوئی شک نظر نہیں آتا کہ ہمارے بچے مجرمانہ کردار اور بداخلاق مشاغل کی ابتدائی تربیت گلی کے ہمسائیوں ہی سے لیتے ہیں، اگر سب بچوں کو کھیل کے میدان میسر نہ آسکتے ہوں تو پھر ہمیں اپنی گلی ہی کو صفائی اور اخلاقی اعتبار سے کھیل کے میدان کے معیار پر لاتا ہوگا۔ تاکہ مجبوری کی وجہ سے ہماری ان تنگ تہذیب گلیوں میں کھیلنے والے بدنصیب بچے بھی مخرب اخلاق رجحانوں سے محفوظ رہ سکیں۔

مدرسہ سماج کا وہ اہم ترین معاشرتی مرکز ہے، جہاں بڑے سے بڑے بچے کی ذہنیت میں بھی مفید اور خوش گوار انقلاب لایا جا سکتا ہے، جماعت کی پڑھائی اور ہمجولیوں کے ساتھ غیر کتابی تفریحوں میں تربیت پاکر ہر بچہ اچھا شہری بن سکتا ہے۔ نظام تعلیم کی بنا بچوں کی نفسیات پر رکھی جائے تو معلم بچے کی متعدد دنامیوں کا عین مناسب وقت پر مداوا کر سکتا ہے۔

بچوں کی تعلیم کے دو بنیادی مقاصد یہ ہیں۔

اول۔ بچوں کو متمدن اور با اخلاق شہری بنانا۔

دوم۔ آئندہ زندگی میں کسی مناسب فن کو بطور پیشہ اختیار کرنے میں ان کی مدد کرنا۔

ان ہر دو مقاصد میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کرنا خطرے سے خالی نہیں، وطن کی اخلاقی اور معاشی حالت کا طائرانہ جائزہ لیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ہم ان مقاصد کی تحصیل میں ناکام رہے ہوں، روزمرہ کی زندگی میں بے شعوری، اخلاقی قدروں میں انحطاط اور صحت عامہ میں تنزل اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ ہماری درس گاہیں بچوں کے اخلاق اور شخصیت کی نشوونما میں غفلت برت رہی ہیں، عام بے کاری اور مختلف علوم و فنون میں نالائقی اور افسوسناک طبیعت کے دوردورہ سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم پیشے کی مناسب رہنمائی میں بھی ناکام رہی ہے۔

تعلیمی دنیا میں یہ افسوسناک صورتِ حال فوری توجہ چاہتی ہے، نفسیات یہاں بھی . . .

عاشرے کی مفید خدمات سرانجام دے سکتی ہے ۔ بچوں کی نفسیات سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ مدرس کو ہر لحاظ سے صاف ستھرا رکھنا چاہیے ۔ معلم کی تربیت اور انتخاب میں احتیاط برتنی چاہیے ۔ بچوں کے نصاب کی تدوین ، نفسیاتی اصولوں پر ہونی چاہیے ۔ مختلف اختیاری مضامین کے چناؤ کے لیے بچوں کے طبعی میلانوں کا جائزہ لے کر ان کی مناسب اور بروقت رہنمائی کرنی چاہیے ۔ کند ذہن بچوں کو اپنی استعداد سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے ۔ اپنی مخصوص فطری صلاحیتوں کو چمکانے اور انہیں بروئے کار لانے میں ہر بچے کی مدد کرنی چاہیے ۔ کام چور اور بھگوڑے بچوں کا سائنسی تجزیہ ہونا چاہیے ، اور محض سزا کی بجائے ان کا مناسب علاج کرنا چاہیے ۔ ان تمام باتوں سے ہم اسی صورت پوری طرح مستفیض ہو سکتے ہیں ، جب معلم ، والدین اور بچوں کی نفسیات کا ماہر ایک دوسرے سے تعاون کریں اور اکٹھے مل کر بچے کی رہبری کے لیے منصوبہ تیار کریں ۔

افراد ہی کسی ملک کا بہترین سرمایہ ہوتے ہیں ۔ آج کے بدچلن بالغ شہری کل بُرے بچے تھے ۔ اگر ابتدا میں ان بُرے بچوں کا سائنسی مطالعہ اور علاج ہوا ہوتا تو آج سماج ان میں سے بہتوں کے مہلک مشاغل کی زد سے محفوظ ہوتا ۔ اگر ہم اپنے وطن کو طرح طرح کے فسادوں تنگ نظریوں اور روزافزوں بداخلاقیوں سے پاک رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے ملی پروگراموں میں بچوں کی سائنسی تربیت کو مقدم مقام دینا ہوگا ۔ اس قسم کی منصوبہ بندی میں ہمیں معلم اور والدین کی سائنسی تربیت ، تفریح اور کھیل کے مناسب اہتمامات اور مدرسہ میں بچوں کی تعلیم کو نفسیاتی اصولوں پر ڈھالنا ہوگا ۔ قوتِ افراد کو اخلاقی اور علمی قلعوں اور پُروقار شخصیتوں کی صورتوں میں ڈھالنے کے لیے اپنے تعمیری کاموں میں بھلا ہم بچوں کو کیسے نظرانداز کر سکتے ہیں؟ ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج

٭

ڈنمارک اور اس کا تعلیمی نظام

محمد نواز جوندہ

پس منظر ڈنمارک کے لوگ کچھ انتہائی صلح کل بے ضرر اور غیر انقلابی قسم کے لوگ واقع ہوئے ہیں۔ اہل فرانس کی طرح آئے دن سیاسی ہنگامے وہاں دیکھنے میں نہیں آتے۔ بیسویں صدی کی ابتدا سے لے کر اب تک ۵ سیاسی پارٹیاں چلی آرہی ہیں، قدامت پسند، آزاد خیال، سوشل، ڈیموکریٹ اور کمیونسٹ۔ ہر چار سال بعد باقاعدہ الیکشن ہوتے ہیں اور لوگ سیاسیات میں ہماری طرح حدت پسند نہیں، بالغوں کے حقوق رائے دہندگی اور پارلیمنٹری نظام حکومت پر سب جماعتیں متفق ہیں۔ گذشتہ جنگ عظیم کے دوران میں ڈنمارک ان چند ایک بے بس ہمسایہ ممالک میں سے تھا جن میں نازی افواج نے بے دریغ تاخت و تاراج کیا اور تا وقت شکست وہاں مستقل قیام رکھا۔

آخر جنگ کے بھیانک بادل چھٹ گئے۔ تباہ شدہ ممالک کو اپنی ہر چیز از سر نو تعمیر کرنی پڑی، اہل ڈنمارک، اجتماعی احساس اور سماجی شعور رکھنے والے ہیں (جو ہمارے ہاں عنقا ہے) انہوں نے تھوڑے ہی وقت میں اپنی حالت سنوار لی اور اقتصادی صنعتی اور سماجی ترقی اور فلاح کے منصوبوں اور تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔

لیکن اہل ڈنمارک تعلیم کی اہمیت سے کبھی بھی غافل نہیں ہوئے ہیں۔ سنہ ۱۸۱۱ء کے ایک قانون کی رو سے پرائمری تعلیم کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس کے بعد اب تک ہر تعلیمی منصوبے میں اس قانون کی حیثیت ایک سنگ میل کی سی رہی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۵ء میں پرائمری ایجوکیشن ایکٹ پاس ہوا جس کے اس وقت تک عمل درآمد ہو رہا ہے۔ لیکن لازمی پرائمری تعلیم سنہ ۱۸۱۱ء سے ہی شروع ہے۔

پرائمری اسکول یہ چھوٹے پرائمری اسکول نظم و نسق اور دیگر ہر لحاظ سے ہائی اسکولوں سے

بمدہ ہوتے ہیں میونسپل کمیٹیاں، بورڈ۔ قومی ادارے اور دیگر سماجی انجمنیں حکومت کی گرانٹ سے
ن اسکولوں کو چلاتے ہیں، لازمی تعلیم کی عمر ۷ سال سے لے کر ۱۴ سال تک ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ
پڑھائی کے اوقات کو بڑھایا جاتا ہے۔ مثال یہ ۷ سے ۱۰ برس کے بچوں کے لیے سال میں
۲۴۰ دن اور ہفتے میں ۱۸ سے ۲۸ گھنٹے پڑھائی کے ہوتے ہیں اور ۱۰ سے ۱۴ سال کی عمر کے
بچوں کو ۳۰ سے لے کر ۳۷ گھنٹے فی ہفتہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اس امر کا خاص خیال رکھا جاتا ہے
کہ کسی جماعت میں بچوں کی تعداد مقررہ حد سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ لہٰذا پرائمری جماعتوں میں کسی صورت
میں بھی ۴۰ سے زیادہ لڑکوں کو داخل نہیں کیا جاتا۔

نصاب | ڈینش زبان کی تقریری اور تحریری تعلیم، املا، حساب۔ تاریخ، جغرافیہ، مطالعہ قدرت اور
مطالعہ جنا سٹک کھیلیں، گانا۔ ڈرائنگ اور نقش نگاری اور لڑکیوں کے لیے سلائی کا کام۔

تحریر اور خوش خطی کو بہت اہمیت دی جاتی ہے اور املا کی تو بے حد مشق کرائی جاتی ہے۔
تاکہ لڑکوں کے ہجے غلط نہ ہوں (جو ہمارے اسکولوں کالجوں میں ایک عام شکایت ہے اور
یونی ورسٹی پروفیسر کے کہنے کے مطابق ایم۔ اے کے طالب علم بھی اس سے مُبرّا نہیں) ڈرائنگ
۹ سالہ بچوں کا محبوب مضمون ہے، ہفتے میں پچاس پچاس منٹ کے دو پیریڈ ہوتے ہیں۔

لڑکیوں کو ہفتے میں دو پیریڈ سینے اور بننے کے دیے جاتے ہیں اور ہمارے یہاں کی
طرح کھانے پکانے کا بھی ایک گھنٹہ ہوتا ہے۔

طالب علم اسکول، شہر یا قصبے کی پبلک لائبریری سے خوب استفادہ کرتے ہیں اور
کئی دور افتادہ دیہاتی اسکولوں میں بعض مضامین کا سبق وائرلیس کے ذریعہ سے بھی دیا جاتا ہے،

مڈل اسکول | ۱۱ سے ۱۵ سال کے لڑکوں اور لڑکیوں کو مڈل اسکول میں داخل کرلیا جاتا ہے
اور نصاب میں چند ایک مضامین کا اضافہ ہو جاتا ہے، مثلاً شہریت۔ طبیعات، اور دستکاری
میں لکڑی وغیرہ کا کام، اور لڑکیوں کے لیے امور خانہ داری بہت اہم مضمون قرار دیے جاتے
ہیں، اس کے علاوہ تین غیر ملکی زبانوں سے بھی روشناس کرایا جاتا ہے۔

سینئر اسکول | یہ اسکول مڈل اسکول سے متعلقہ ایک شاخ ہے، جیسے انگلستان
پانچویں اور چھٹی جماعت کے بعد ہائی اسکول میں جاتے ہیں، یا جس طرح امریکہ میں جونیئر
کا پہلا سال ہوتا ہے، اسی طرح ڈنمارک کے سینیئر اسکول میں مڈل سے میٹرک تک تین جماعتیں
ہوتی ہیں ان کو مزید سائنس اور آرٹس کے شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، آرٹس میں انگریزی اور
جرمن زبان پڑھائی جاتی ہے، سائنس میں حساب اور فزکس لازمی مضامین ہوتے ہیں بعض
اسکولوں میں کلاسیکل سکیشن بھی ہوتے ہیں، جہاں یونانی اور لاطینی زبانیں پڑھائی جاتی ہ
فرانسیسی زبان تینوں سیکشنوں میں لازمی مضمون ہے۔

بچوں کی صحت اور روزمرہ ورزش کو وہ لوگ کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ڈ
بلاناغہ روزانہ ایک گھنٹہ ہوتا ہے۔ سال میں دو مرتبہ طالب علموں کے دانتوں کا اور ایک
سارا ڈاکٹری معائنہ کیا جاتا ہے، دانتوں کی صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے، ڈنٹسٹ ا
دوسرا ڈاکٹر ہر اسکول کا اپنا ہوتا ہے، اہل یورپ اس اصول پر پوری طرح کاربند ہیں۔ کہ صفا
اور ورزش ہمارے جسموں کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ پڑھنا ہمارے دماغوں کے ل

دوسری جماعت میں ترقی دینے کے لیے اب تک تحریری امتحانوں کا طریقہ رائج تھا
اب یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ بجائے تحریری امتحان کے طالب علموں کو استاد کی رائے پر اگلی جما
میں ترقی دی جائے، لیکن اگر کسی کے والدین کی اس سے تسلی نہ ہو جیسا کہ عین ممکن ہے تو صرف ا
صورت میں لڑکے کا باقاعدہ تحریری امتحان لیا جائے (ہمارے ہاں اگر یہ طریقہ رائج کیا جا
اساتذہ کرام کی مالی حالت سدھر جائے اور والدین کا رہا سہا احساس ذمہ داری بھی جاتا ر

اسکولوں کا نظم و نسق | اس وقت ڈنمارک میں سینئر اسکولوں کی کل تعداد ۲۷ ہے
۳۴ سرکاری، ۲۲ میونسپلٹیوں کے تحت اور ۱۶ پرائیویٹ اسکول ہیں۔

پرائمری اور سینئر اسکولوں میں ۱۹۳۳ء سے والدین کی کونسل کے نام سے ایک مجلس
ہے۔ اسکولوں کے سارے نظم و نسق اور دیگر ہر قسم کے انتظامیہ امور میں ان کا مشورہ لازمی

اس لحاظ سے پرائیویٹ اور گورنمنٹ اسکول میں کوئی فرق نہیں لیکن ہمارے لیے یہ امر انتہائی حیران کن ہے کہ اسکول کے یہ ارباب بست وکشاد استادوں کی تبدیلیوں، ترقیوں اور تنزلیوں یعنی سفارشوں سے قطعی لاتعلق ہیں۔ بالفاظ دیگر اساتذہ کی ملازمت کونسل کی مرہون منت نہیں۔

جنوری ۱۹۴۷ء میں ڈنمارک کے کل اسکولوں میں طالب علموں کی تعداد ۴۸۱۰۳۹۵ تھی اور اب ہر سال سینئر اسکول کا آخری درجہ یعنی میٹرک کا امتحان ۳۰۰۰ لڑکے اور لڑکیاں پاس کرتے ہیں، ان میں سے تقریباً ۶۰۰ پرائیویٹ ہوتے ہیں، اب "پرائیویٹ پرائمری اسکول ایکٹ" کی رو سے غیر سرکاری اسکولوں کو معقول گرانٹ ملتی ہے، چناں چہ اب ان میں طالب علموں کی تعداد ۱۱۰۰۰ رہا ہے۔ ہماری سماج میں استاد کا جو مقام ہے یورپ میں اس کے بالکل برعکس ہے اور ہمیشہ اچھے دماغ اس پیشے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یونیورسٹی سے باقاعدہ طور پر سند یافتہ ہوئے بغیر کوئی شخص کسی پرائمری اسکول میں بھی پڑھانے کا مجاز نہیں۔

ڈنمارک کے سینئر اسکولوں کے استاد گریجوایٹ ہوتے ہیں جنہیں پھر یونیورسٹی میں باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ مڈل اور پرائمری اسکولوں کے استاد ٹریننگ کالجوں میں پورے چار سال کا کورس کرتے ہیں تب انہیں ایک پرائمری اسکول میں ملازمت ملتی ہے۔ ایسے ٹریننگ کالجوں کی تعداد ۲۱ ہے جن میں سے ۸ سرکاری اور ۱۳ غیر سرکاری ہیں۔ دارالسلطنت کوپن ہیگن میں ایک ٹیچرز ہائی اسکول بھی ہے، جہاں صرف تجربہ کار استادوں کو مزید اعلیٰ تربیت دی جاتی ہے

۱۹۴۷ء میں پرائمری اسکولوں کی تعداد ۲۷۳۲ تھی جن میں ۹۳۹۲ مرد اور ۸۱۱۱ عورتیں بطور معلم کام کرتے تھے۔ ہر اسکول کا نصاب اور طریقۂ تعلیم وزارت تعلیم کے انسپکٹروں کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے، سرکاری انسپکٹر کسی وقت کسی اسکول کا معائنہ کر سکتے ہیں۔

ہر اسکول میں والدین کی کونسل جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کے علاوہ ٹیچرز کونسل بھی ہوتی ہے جن کے مشورے کے بغیر اسکول سے متعلقہ کوئی کام سرانجام نہیں پاتا، علاوہ ازیں ہر میونسپلٹی ایک "تعلیمی کمیٹی" مقرر کرتی ہے اور پرائمری اسکول کا ہیڈ ماسٹر اس کمیٹی کا سیکرٹری ہوتا ہے۔

سینئر اسکول یہ اسکول مڈل اسکول سے متعلقہ ایک شاخ ہے ، جیسے انگلستان میں پانچویں اور چھٹی جماعت کے بعد ہائی اسکول میں جاتے ہیں، یا جس طرح امریکہ میں جونیئر کالج کا پہلا سال ہوتا ہے ، اسی طرح ڈنمارک کے سینئر اسکول میں مڈل سے میٹرک تک تین جماعتیں ہوتی ہیں ان کو مزید سائنس اور آرٹس کے شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ، آرٹس میں انگریزی اور جرمن زبان پڑھائی جاتی ہے ، سائنس میں حساب اور فزکس لازمی مضامین ہوتے ہیں بعض اسکولوں میں کلاسیکل سکیشن بھی ہوتے ہیں، جہاں یونانی اور لاطینی زبانیں پڑھائی جاتی ہیں فرانسیسی زبان تینوں سیکشنوں میں لازمی مضمون ہے ۔

بچوں کی صحت اور روزمرہ ورزش کو وہ لوگ کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ڈرل کا بلاناغہ روزانہ ایک گھنٹہ ہوتا ہے۔ سال میں دو مرتبہ طالب علموں کے دانتوں کا اور ایک مرتبہ سارا ڈاکٹری معائنہ کیا جاتا ہے ، دانتوں کی صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے ، ڈنٹسٹ اور دوسرا ڈاکٹر ہر اسکول کا اپنا ہوتا ہے ، اہل یورپ اس اصول پر پوری طرح کاربند ہیں۔ کہ صفائی اور ورزش ہمارے جسموں کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ پڑھنا ہمارے دماغوں کے لیئے۔

دوسری جماعت میں ترقی دینے کے لیے اب تک تحریری امتحانوں کا طریقہ رائج تھا لیکن اب یہ کوشش کی جارہی ہے کہ بجائے تحریری امتحان کے طالب علموں کو استاد کی رائے پر اگلی جماعت میں ترقی دی جائے ، لیکن اگر کسی کے والدین کی اس سے تسلی نہ ہو جیسا کہ عین ممکن ہے تو صرف اس صورت میں لڑکے کا باقاعدہ تحریری امتحان لیا جائے (ہمارے ہاں اگر یہ طریقہ رائج کیا جائے تو اساتذہ کرام کی مالی حالت سدھر جائے اور والدین کا رہا سہا احساس ذمہ داری بھی جاتا رہے)

اسکولوں کا نظم ونسق اس وقت ڈنمارک میں سینئر اسکولوں کی کل تعداد ۷۲ ہے جن میں ۴۴ سرکاری ، ۲۲ میونسپلٹیوں کے تحت اور ۱۶ پرائیویٹ اسکول ہیں۔

پرائمری اور سینئر اسکولوں میں ۱۹۳۳ء سے والدین کی کونسل کے نام سے ایک مجلس قائم ہے۔ اسکولوں کے سارے نظم ونسق اور دیگر ہر قسم کے انتظامیہ امور میں ان کا مشورہ لازمی ہے

اس لحاظ سے پرائیویٹ اور گورنمنٹ اسکول میں کوئی فرق نہیں لیکن ہمارے لیے یہ امر انتہائی حیران کن ہے کہ اسکول کے یہ ارباب بست وکشاد استادوں کی تبدیلیوں، ترقیوں اور تنزلیوں یعنی سفارشوں سے قطعی لاتعلق ہیں۔ بالفاظ دیگر اساتذہ کی ملازمت کونسل کی مرہون منت نہیں۔

جنوری ۱۹۴۷ء میں ڈنمارک کے کل اسکولوں میں طالب علموں کی تعداد ۴۸۱۰۲۹۵ تھی اور اب ہر سال سینئر اسکول کا آخری درجہ یعنی میٹرک کا امتحان ۳۰۰۰ لڑکے اور لڑکیاں پاس کرتے ہیں، ان میں سے تقریباً ۷۰۰ پرائیویٹ ہوتے ہیں، اب "پرائیویٹ پرائمری اسکول ایکٹ" کی رو سے غیر سرکاری اسکولوں کو معقول گرانٹ ملتی ہے، چنانچہ اب ان میں طالب علموں کی تعداد ۰۰۰ رہا ہے۔ ہماری سماج میں استاد کا جو مقام ہے یورپ میں اس کے بالکل برعکس ہے اور ہمیشہ اچھے دماغ اس پیشے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یونی ورسٹی سے باقاعدہ طور پر سند یافتہ ہوئے بغیر کوئی شخص کسی پرائمری اسکول میں بھی پڑھانے کا مجاز نہیں۔

ڈنمارک کے سینئر اسکولوں کے استاد گریجوایٹ ہوتے ہیں جنہیں پھر یونی ورسٹی میں باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ مڈل اور پرائمری اسکولوں کے استاد ٹریننگ کالجوں میں پورے چار سال کا کورس کرتے ہیں تب انہیں ایک پرائمری اسکول میں ملازمت ملتی ہے، ایسے ٹریننگ کالجوں کی تعداد ۲۱ ہے جن میں سے ۸ سرکاری اور ۱۳ غیر سرکاری ہیں۔ دارالسلطنت کوپن ہیگن میں ایک ٹیچرز ہائی اسکول بھی ہے، جہاں صرف تجربہ کار استادوں کو مزید اعلیٰ تربیت دی جاتی ہے

۱۹۴۷ء میں پرائمری اسکولوں کی تعداد ۲۷۳۲ تھی جن میں ۹۳۹۲ مرد اور ۸۱۱۱ عورتیں بطور معلم کام کرتے تھے۔ ہر اسکول کا نصاب اور طریقۂ تعلیم وزارت تعلیم کے انسپکٹروں کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے، سرکاری انسپکٹر کسی وقت کسی اسکول کا معائنہ کر سکتے ہیں۔

ہر اسکول میں والدین کی کونسل جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کے علاوہ ٹیچرز کونسل بھی ہوتی ہے جن کے مشورے کے بغیر اسکول سے متعلقہ کوئی کام سرانجام نہیں پاتا، علاوہ ازیں ہر میونسپلٹی ایک "تعلیمی کمیٹی" مقرر کرتی ہے اور پرائمری اسکول کا ہیڈ ماسٹر اس کمیٹی کا سیکرٹری ہوتا ہے۔

کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری پرائمری اسکول میں طلبا سے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ چندے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہر روز دوپہر کا کھانا اسکول کی طرف سے دیا جاتا ہے صرف تیس (۳۰) فیصد طلبا ایسے ہوتے ہیں جو گھر سے کھانا پسند کرتے ہیں، باقی سب اس سہولت کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

بالغوں کے اسکول | بالغوں کے لیے نائٹ اسکول کھولے گئے ہیں اس وقت ان اسکولوں میں ۲،۵۰۰ طلبا پڑھتے ہیں اور پرائمری اسکولوں کے اساتذہ میں سے جو تیر استاد اس اسکول کا پرنسپل ہوتا ہے۔ ان اسکولوں میں تقریباً سب عام قسم کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں لیکن ایسے مضامین اور شعبوں پر خاص توجہ دی جاتی ہے جو طلبا عملی زندگی میں کام آسکیں اور انھیں حصول روزگار میں دقت پیش نہ آئے۔ مثلاً ٹائپ۔ شارٹ ہینڈ۔ ریڈیو ٹیلیفون۔ بڑھئی کا کام اور مشینری وغیرہ ایسے اسکول اکثر پرائیویٹ ہوتے ہیں۔ لیکن حکومت کی طرف سے سب کو خاطر خواہ گرانٹ ملتی ہے، معائنہ اور حساب کتاب کی پڑتال بھی گورنمنٹ کے ذمہ ہے اس کے علاوہ بڑے پیمانہ پر سرکاری صنعتی اسکول بھی ہیں، جہاں ہر پیشے کی تسلی بخش تعلیم دی جاتی ہے، یہ اسکول ہر شہر اور بڑے قصبے میں قائم ہیں۔ زراعت میں مہارت حاصل کرنے کے لیے علیحدہ سرکاری اسکول ہیں جو اس وقت تعداد میں ۹ ہیں۔

یونی ورسٹی کی تعلیم | ڈنمارک زمانہ قدیم سے علم و ادب کا گہوارہ چلا آرہا ہے، سب سے پہلی یونی ورسٹی ۱۴۷۸ء میں قائم ہوئی اور اس وقت مندرجہ ذیل عظیم درس گاہیں، قومی ترقی اور تمدن میں مدد و معاون ثابت ہو رہی ہیں۔

ٹیکنیکل یونی ورسٹی، رائل کالج آف فارمیسی، ڈینٹل کالج۔ رائل ڈینش اکیڈمی آف فائن آرٹس، رائل وٹنیری اور اگریکلچر کالج، اور اسکول آف کمرشل سائنس

۱۹۵۱ء میں کوپن ہیگن یونی ورسٹی میں ۶۳۶۴ لڑکے اور ۲،۰۵۴ لڑکیاں زیر تعلیم تھیں۔ اور اس سال ۱،۰۷۰ نے ڈگری حاصل کی۔

۱۹۵۲ء میں ٹیکنیکل یونی ورسٹی میں ۱۷۸۳ طلبا تھے اور ٹریننگ کالج میں ۳۸۴ مرد اور ۹۳ عورتیں زیر تربیت تھیں۔ ٹیچرز ہائی اسکول (جس میں تجربہ کار معلموں کو اعلیٰ تربیت دی جاتی ہے) سال گذشتہ میں ۲۵۰ مرد اور ۱۵۸ عورتیں تھیں۔

ہر یونی ورسٹی میں ۵ شعبے ہوتے ہیں۔ شعبہ دینیات۔ قانون، اقتصادیات، ادویات سائنس اور فلسفہ۔ فلسفہ میں وہ سب کچھ آجاتا ہے جو انگلستان اور امریکہ میں آرٹس سے مراد لی جاتی ہے یونی ورسٹی کا کورس ۵ سے ۷ سال تک ہر شعبے کے مطابق ہوتا ہے۔

ڈنمارک کی یونی ورسٹی میں لکچرر ریڈر اور پروفیسر بننا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ کئی سالوں تک ریسرچ ورک کر کے دکھانا پڑتا ہے اور پھر تھیسس کی قبولیت کے بعد پروفیسروں وغیرہ کا تقرر عمل میں آتا ہے۔

انگلستان اور امریکہ کے قاعدے اور رواج کے خلاف طلبا کو چنداں وظائف نہیں دیے جاتے۔ لیکن یونی ورسٹی کی تعلیم کے دوران میں کوئی فیس یا معاوضہ نہیں لیا جاتا۔ طلبا کو اقتصادی پریشانیوں سے دور رکھنے کے لیے یونی ورسٹی میں لون بنک ہوتا ہے، جن کا سارا انتظام طلبا کے ہاتھ میں ہوتا ہے، طلبا کو کھانے رہائش اور دیگر اخراجات کے لیے وہاں سے بغیر سود کے روپیہ ملتا ہے۔

سویڈن کی ایک یونی ورسٹی میں تو شادی شدہ طالب علموں کے بچوں کے لیے ایک علیحدہ اسکول کھولا گیا ہے، اگرچہ اس وقت ڈنمارک میں ایسا کوئی اسکول نہیں۔ لیکن طالب علموں کی منتخب کونسل نے جس کو قانونی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے تعلیمی زندگی کی بہت سی اہم ذمہ داریوں کو سنبھال لیا ہے۔

علاوہ ازیں "بین الاقوامی سٹوڈنٹس کمیٹی" دوسرے ملکوں کے طلبا سے رابطہ اور اتحاد قائم رکھنے میں بہت مفید ثابت ہو رہی ہے ؂

بچوں کے مشاغل

سکّے جمع کرنا

فضل احمد

ٹکٹوں کی طرح سکے جمع کرنا بھی بچوں کے لیے ایک بڑا دل چسپ اور کارآمد مشغلہ ہے، روپے پیسے صرف چیزیں خریدنے ہی کے کام نہیں آتے، یہ اپنے زمانے کی تھوڑی بہت کہانی بھی سناتے ہیں۔ مثلاً پاکستان بننے سے پہلے ہمارے ملک میں جو سکے چلتے تھے ان پر برطانیہ کے بادشاہ کی تصویر ہوا کرتی تھی۔ آزادی ملنے کے بعد اس تصویر کی جگہ چاند اور ستارے نے لے لی ہم صرف پچھلے چند سالوں کے سکوں کو دیکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا....

اسی طرح اگر ہم ان تمام سکوں کو جمع کریں جو پچھلے چوّن سالوں میں ہمارے ملک میں چلتے رہے ہیں تو اس سے ہمارے ملک کی ایک چھوٹی سی کہانی تیار ہو جائے گی سنہ ۱۹۰۱ء تک یہاں ملکہ وکٹوریہ کا سکہ چلتا رہا، ان کے بعد ایڈورڈ ہفتم کا سکہ چلا۔ سنہ ۱۹۱۱ء سے جارج پنجم کا سکہ چلنے لگا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں ان کی جگہ ان کے بڑے بیٹے ایڈورڈ ہشتم نے لی، کچھ مہینے بعد ان کے چھوٹے بھائی جارج ششم کا سکہ چلنے لگا اور پاکستان بننے تک یہی سکہ چلتا رہا۔

اپنے سکوں کے اس چوّن سالہ مجموعہ کو دیکھ کر ہمیں صرف بادشاہوں کے ادل بدل کی تاریخ ہی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ اور بھی بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ سکوں کی دھاتوں، ان کی شکل و صورت اور ان کے نقش و نگار میں بھی فرق پیدا ہوتا ہے۔ اس صدی کے شروع میں ہمارا روپیہ، اٹھنی، چونی اور دونی چاروں گول شکل کے ہوتے تھے اور تقریباً خالص چاندی سے بنتے تھے، اس چاندی میں صرف ۱/۱۲ حصہ کھوٹ ملا ہوتا تھا۔ کھوٹ کم ہونے کے سبب یہ سکے ذرا جلد گھس جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ چاندی کے سکوں میں کھوٹ بڑھایا جانے لگا، دونی اور چونی چاندی کی بجائے نکل کی بننے لگی، دونی کی

ل چوکور ہوگئ اور چونی کی ہشت پہلو۔ آنے کی شکل پہلی سی رہی۔ پیسے اور ادھنی نے بھی کئی شکلیں لی ہیں، آج صورت یہ ہے کہ ہمارا کوئی سکہ بھی چاندی کا نہیں، سب کے سب نکل اور تانبے سے بنتے ہیں۔ ہمارے سکوں کی یہ چوان سالہ کہانی اس آدھی صدی کے حالات پر بڑی دل چسپ روشنی ڈالتی ہے۔

یہاں تک تو اپنے ملک کے سکوں کا ذکر تھا۔ ہماری طرح دوسرے ملکوں میں بھی طرح طرح کے سکے چلتے ہیں۔ ان سکوں کو جمع کرنا کچھ مشکل بات نہیں۔ آج کل غیر ملکوں میں آنے جانے کی آسانیاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ اکثر پاکستانی بچے اپنے رشتہ داروں یا واقف کاروں کی معرفت تھوڑی سی رقم خرچ کر کے غیر ملکی سکوں کا ایک اچھا ذخیرہ تیار کر سکتے ہیں۔ غیر ملکی سکوں کا یہ ذخیرہ دوسرے ملکوں کے متعلق ہمیں بہت سی باتیں بتائے گا۔ اس کی مدد سے ہمیں اپنے روپے اور غیر ملکی سکوں کی شرح تبادلہ کا کچھ اندازہ ہوجائے گا، ان سکوں کے نقش و نگار سے ہم دوسرے ملکوں کے آرٹ کے متعلق واقفیت حاصل کرلیں گے، سب سے بڑھ کر یہ کہ ان سکوں کی بدولت دوسرے ملکوں کے ساتھ ہمیں لگاؤ پیدا ہوجائے گا۔ مثلاً بہت سے پاکستانی بچوں کے لیے "ترکی" صرف نقشے پر ایک نام ہے اور بس۔ لیکن جو پاکستانی بچہ ترکی کے سکے جمع کرے گا، اسے یہ احساس ہونے لگے گا کہ یہ وہی سکے ہیں جن سے ترک بچے مٹھائیاں اور دوسری چیزیں خریدتے ہیں، شاید ان میں سے کوئی سکہ کمال اتاترک، عصمت انونو یا کسی دوسرے ترک رہ نما کی جیب میں بھی رہا ہو، بالکل ایسے ہی احساسات ایرانی۔ مصری عربی۔ شامی۔ انڈونیشی۔ جاپانی۔ برطانوی اور امریکی سکوں سے پیدا ہو سکتے ہیں۔

پرانے وقتوں کے سکوں کا جمع کرنا اور بھی زیادہ دل چسپ ہے۔ ان سے سینکڑوں۔ ہزاروں سال پہلے کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ٹیکسلا سے نکلے ہوئے سکوں کو دیکھ کر راجہ امبھو اور سکندر اعظم کے زمانے کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے، شاید یہ سکے یونانی فاتح کے ہاتھوں میں سے گذرے ہوں! شہنشاہ جہاں گیر کے سکوں پر بادشاہ اور ملکہ نور جہاں دونوں کے نام

درج ہیں، ان کو دیکھ کر فوراً یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ شاہدرہ کے مقبرہ میں گہری نیند سونے والا شہنشاہ اور اس کی ملکہ دونوں مل کر ملک پر حکومت کیا کرتے تھے۔ غرض پرانے سکے پہلے وقتوں کی بڑی دل کش کہانیاں سناتے ہیں، ان کے نقش و نگار اپنے اپنے وقت کے آرٹ کی خبر دیتے ہیں پرانے سے پرانے سکے جو ہاتھ لگ سکے ہیں وہ آج سے کوئی اڑھائی ہزار سال پہلے کے بنے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس وقت سے لے کر آج تک کے سارے سکے جمع کر لے تو تہذیب دنیا کی ایک مختصر سی تاریخ تیار ہو جائے۔

سکے جمع کرنے سے پہلے اس کام کے متعلق کسی واقف کار شخص یا کسی کتاب سے پوری واقفیت حاصل کر لینی چاہیے، انہیں جمع کر کے اس طرح رکھنا چاہیے کہ وہ ایک نگاہ میں دیکھے جا سکیں اس کی آسان صورت یہ ہے کہ بازار سے پلائی وڈ کے پتلے تختے خرید کر ٹرے تیار کر لیے جائیں ان کے اندر نیلی یا سبز مخمل کا استر لگا دیا جائے، پھر اس کپڑے کی موٹی دھجی سے ہر ٹرے کو برابر مستطیلوں میں بانٹ دیا جائے اور ایک خاص قسم یا خاص زمانے کے سکے ایک مستطیل میں ساتھ ساتھ لگا دیے جائیں۔ یہ ٹرے ایک الگ الماری میں رکھے جائیں جہاں گرد نہ پہونچ سکے۔

غرض سکے جمع کرنا ایک بڑا مفید تعلیمی مشغلہ ہے، ہر بچہ تھوڑی سی رقم خرچ کر کے چاندی نکل اور تانبے کے سکوں کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ اکٹھا کر سکتا ہے ٭

(ریڈیو پاکستان سے نشر کیا گیا)

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

کتب خانے

لندن کارپوریشن کی تعلیمی کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ مدرسوں کے کتب خانوں کو بہتر بنایا جائے کمیٹی نے رائے ظاہر کی ہے کہ اس ضمن میں بہت کچھ کرنا باقی ہے اور اب اس کمی کو پورا کرنے کی ضرورت بہت شدید ہے۔

کمیٹی نے محسوس کیا ہے کہ ثانوی مدرسے کے ہر بچے کے لیے کتب خانے میں کم از کم آٹھ کتابیں ہونی چاہئیں۔ مڈل مدرسوں میں فی بچہ چار کتابیں اور ابتدائی مدرسوں میں فی بچہ دو، اس حساب سے لندن کے مدرسوں میں ۲۳۰۷۰۰۰ کتابیں ہونی چاہئیں، لیکن اس وقت ان کتب خانوں میں صرف ۹۶۷۰۰۰ کتابیں ہیں۔ کتابوں کی یہ کمی پوری کرنے کے لیے کافی رقم خرچ ہوگی۔ کتابوں پر اندازاً ۴۷۵۰۰۰ پونڈ صرف ہوں گے اور زائد الماریوں پر ۱۵۰۰۰۰ پونڈ۔

جنگ سے پہلے ۱۵۰۰۰۰ چھوٹی کتابیں لندن کے ۷۰۰ مدرسوں میں باری باری بھیجی جاتی تھیں، اب ان گشتی کتابوں کی تعداد گھٹ کر کوئی پانچ لاکھ رہ گئی ہے، سابقہ تعداد کی بحالی کے لیے پچاس ہزار پونڈ درکار ہیں۔

لندن کارپوریشن نے فیصلہ کیا ہے کہ مدرسوں کے کتب خانوں کو درست حالت میں لانے کے لیے پانچ سال کے لیے ۱۳۰۰۰۰ پونڈ سالانہ خرچ کیے جائیں، لیکن یہ اس مہم کی آخری منزل نہیں، کیوں کہ ثانوی مدرسوں کو ابھی اور کتابوں کی ضرورت ہوگی، بڑے ثانوی مدرسوں میں جہاں تعداد طلبہ ۸۵۰ سے ۱۰۰۰ تک ہے، آٹھ کتابیں فی طالب علم ایک خاصی تعداد ہے۔ لیکن چھوٹے مدرسوں میں فی طالب علم زیادہ کتابوں کی ضرورت ہے۔

گھر کے خطرات: بہت سے والدین بچوں کو گھر سے باہر بھیجتے ہوئے ہچکچاتے ہیں

ان کا خیال ہے کہ بچے گھر میں زیادہ محفوظ رہتے ہیں۔ اور گھر سے باہر ہمیشہ حادثوں کا کھٹکا رہتا ہے۔ حال ہی میں لارڈ کرک نے دارالامرا میں تقریر کرتے ہوئے گھر کے خطروں پر روشنی ڈالی، اپنی تائید میں اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ انگلستان کے گھروں میں ہر سال سات ہزار مہلک حادثے رونما ہوتے ہیں، بیس لاکھ مزید حادثے ایسے ہوتے ہیں جن کے نتیجہ کے طور پر ہسپتال میں علاج کرانا پڑتا ہے، غرض پندرہ سال سے کم عمر کے جتنے بچے اپنے گھروں میں ہونے والے حادثوں کی نذر ہوتے ہیں ان کی تعداد گھر سے باہر رونما ہونے والے حادثوں سے مرنے والے بچوں سے زیادہ ہے۔ اس عمر کے بچے کسی متعدی مرض کے سبب اتنی تعداد میں نہیں مرتے جتنے گھر کے حادثوں کے طفیل لقمۂ اجل ہو جاتے ہیں۔

لندن شہر کا ذکر کرتے ہوئے لارڈ کرک نے بتایا کہ لندن کے ہر چار شہریوں میں سے ایک کو سال میں ایک مرتبہ اپنے گھر میں کسی نہ کسی طرح کا حادثہ پیش آتا ہے۔

لارڈ کرک نے کہا کہ ہمارے مدرسوں نے سڑکوں کے حادثوں کو کم کرنے کے لیے بڑا مؤثر کام کیا ہے، گھروں میں حادثوں کو کم کرنے کی ذمہ داری والدین پر ہے، پھر بھی استادوں کو چاہیے کہ گھر پر سلامتی کے اصولوں پر بھی باہر کی نسبت زیادہ زور دیں۔

استادوں کی تنخواہیں۔

استادوں کی قومی انجمن کی شمال مغربی شاخ کا ایک اجلاس مانچسٹر میں منعقد ہوا، اس نے ایک قرارداد منظور کی جس میں پچھلے سالوں میں استادوں کی تنخواہ کی عدم استواری پر افسوس کیا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ استادوں کی تنخواہیں فوراً بڑھائی جائیں۔

ایک اور قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ استادوں کی پنشن کے متعلق قانون کی ترمیم کرتے وقت ان کی بیواؤں اور یتیم بچوں کا خاص لحاظ رکھا جائے اور ان کی امداد کے لیے وہی شرح اختیار کی جائے جو دوسرے سرکاری ملازموں کے پس ماندگان کو ملتی ہے۔

ایک اور قرارداد میں تمام استادوں کے لیے یکساں تنخواہ کی تجویز کی مذمت کی گئی اور کہا گیا

سیاسی جماعتوں سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے یہ نعرہ لگایا گیا ہے۔ اگر اس تجویز کو عملی جامہ پہنا دیا گیا تو اس سے ناقابل تلافی نقصان ہوگا اور ملک کے بیشتر مردوں عورتوں اور بچوں کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوگی۔

گھر اور مدرسے کے فرائض

ہولٹ اسکول ڈربول کے صدر معلم مسٹر اے۔ جی۔ رسل نے لندن میں منعقد ہونے والی انجمن صدر معلمین کی صدارت کرتے ہوئے جو خطبہ پڑھا اس میں گھر اور مدرسے کے مختلف فرائض کی وضاحت کی۔

مسٹر رسل نے پہلے جدید دور کے خاص خطروں کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ خطرے دو سرچشموں سے پیدا ہو رہے ہیں۔ پہلا یہ کہ سائنس کی ترقی نے فرد کے دل میں بے یقینی اور بے بسی کا ایک عجب احساس پیدا کر دیا ہے، چناں چہ پہلے اخلاقی انحطاط شروع ہوا۔ اوّل اوّل جو بیزاری کی ذہنیت نے پرورش پائی بعض لوگوں نے خیال کرنا شروع کیا کہ زندگی کی بے حد پیچیدہ اور بھاری بھرکم الجھنوں میں ان کی پست خود غرضیاں چھپی رہیں گی، دوسرا خطرہ اخلاقی تعطل ہے جس کی وجہ سے لوگ معاملات سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے حصے کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

مسٹر رسل نے کہا کہ اس نازک صورت حال کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ استادوں کا ایک کام یہ بھی ہے کہ اپنے شاگردوں کے اندر معاشرتی فہم پیدا کریں، یہ فہم میری رائے میں معاشرتی ضمیر سے بھی ایک وسیع تر چیز ہے۔

اس کی صورت یہ ہے کہ بچے اپنے آپ کو بعض یگانہ صلاحیتوں کے مالک سمجھیں اور یہ محسوس کریں کہ جس معاشرہ کے وہ جزو ہیں اسے بھی ان صلاحیتوں کا حصہ ملنا چاہیے، انہیں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اپنے ماحول اور اپنے ساتھیوں کو اپنی خداداد ذہانت اور اپنی جذباتی گرمی سے متاثر کریں، یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہوگا جب مدرسے اپنے کام کو پوری ہوش مندی کے ساتھ منظم کریں اور طالب علموں کو بہت احتیاط کے ساتھ تربیت دیں۔

مسٹر رسل نے کہا کہ نوجوانوں کو معاشرتی ذمہ داریوں کے لیے تیار کرنا اکیلے مدرسے ہی کا فرض

بلکہ اس میں گھر کو بھی حصہ لینا چاہیے تعلیم میں مواقع کی یکسانیت کے متعلق بہت کہا جاتا ہے لیکن اس یکسانیت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مدرسوں کی طرف سے حائل نہیں ہوتی۔ بلکہ اس رکاوٹ کا سبب یہ ہے کہ مختلف گھر تعلیم کے متعلق بہت مختلف نظریے رکھتے ہیں۔

اگر تمام بچوں کے لیے داخلہ کے مواقع بالکل ایک سے ہوں اور سب کو ایک سی مالی سہولت بھی مل جائے تو بھی سب کو ایک جیسی تعلیمی سہولتیں میسر نہیں آئیں گی، کیوں کہ بعض بچوں کے والدین تعلیم اور مدرسے کے متعلق فہمیدہ ہم دردی کا جذبہ نہیں رکھتے، ان میں سے کئی تعلیم اور مدرسے کے مقاصد کو اچھی طرح نہیں سمجھتے، وہ اس جذباتی گرمی سے خالی ہیں جو مدرسے اور گھر کے تعلقات کو زندگی کی تر و تازگی بخشتی ہے۔

مٹی کے تیل کی کہانی

رائل انسٹی ٹیوشن لندن مدرسوں کے طالب علموں کے لیے علمی اور سائنسی لیکچروں کا بندوبست کرتی رہتی ہے، پچھلے دنوں سر فرانک ڈیل نے مٹی کے تیل کی کہانی بیان کی، مدرسوں کے بچے ہال میں جمع تھے کہ یکایک بجلی کی روشنی بجھ گئی لہٰذا سر فرانک ڈیل ایک ٹمٹماتی ہوئی موم بتی ہاتھ میں لیے تقریر کرتے داخل ہوئے، یہ وہ موم بتی تھی جو سو سال سے زیادہ عرصہ پہلے فراڈے نے اسی انسٹی ٹیوشن میں استعمال کی تھی، اس کی مدھم روشنی میں فاضل مقرر نے وہ ان گنت طریقے بیان کرنے شروع کیے جن سے ۱۸۵۷ء کے بعد سے مٹی کے تیل نے موم بتی کی جگہ لی تھی۔ تقریر کوئی گھنٹہ بھر جاری رہی، جدید سائنس کے سب کرشمے فاضل مقرر کے قابو میں نظر آتے تھے۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجال ——— شعبہ مدارس

۲۵۲۸/ جنوری ۱۹۵۰ء — محمد یوسف علی خان بی۔ اے، پی۔ ای۔ ایس (دوم) ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس میانوالی کو ۲ جنوری ۱۹۵۰ء قبل دوپہر سے مہر عبد الحمید کی جگہ جو راولپنڈی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہ چکے ہیں۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس منٹگمری مقرر کیا گیا۔

ش۔ محمد سلیم۔ بی۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس (دوم) صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ کو ۱۰ جنوری ۱۹۵۰ء قبل دوپہر سے م منظور العزیز بیگ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے صدر معلم گورنمنٹ نارمل اسکول چنیوٹ مقرر کیا گیا۔

ی/۲۳۱۵ ۲۴ جنوری ۱۹۵۰ء — م محمد یوسف ظفر، ایس۔ وی ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م مشتاق احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (۶۰ — ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۳۲۱ ۲۴ جنوری ۱۹۵۰ء — م عبد الرحمٰن اختر میٹرک، ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول بھوچال کلاں کو تاریخ حاضری سے م فیض حق کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں۔ اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول للہ مقرر کیا گیا۔

〃 — م۔ عدالت خان، ایس۔ وی۔ ایک امیدوار کو م۔ عبد الرحمٰن اختر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے (۶۰ — ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول بھوچال کلاں مقرر کیا گیا۔

ای/۲۳۱۷ ۲۴ جنوری ۱۹۵۰ء — م۔ عبد الرشید الف۔ اے، پی۔ ٹی (والٹن) ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م چراغ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (۶۰ — ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پاکپتن مقرر کیا گیا۔

ای/۲۱۲۲ ۲۴ جنوری ۱۹۵۰ء — م۔ سعید احمد خان۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ کو تاریخ حاضری سے س۔ محمد تقی بخاری کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ

اے۔ ڈی۔ آئی لائل پور مقرر کیا گیا۔

ای/۲۲/۲۱ س۔ محمد تقی بخاری۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) اے۔ ڈی۔ آئی۔ لائل پور کو تاریخ
۲۲ جنوری ۱۹۵۵ء سے م۔ عبدالحکیم عثمانی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی کا مدرس گورنمنٹ
اسکول جڑانوالہ مقرر کیا گیا۔

م۔ عبدالحکیم عثمانی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی
جڑانوالہ کو تاریخ حاضری سے م الٰہی بخش جاکھر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ
انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول راجن پور مقرر کیا گیا۔

م۔ الٰہی بخش جاکھر بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ
اسکول راجن پور کو تاریخ حاضری سے م۔ سعید احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
تنخواہ پر قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۵/۲۱ ڈاکٹر غلام یاسین خاں نیازی۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ انسپکٹر تربیتی مدارس
۲۲ جنوری ۱۹۵۵ء ۷ جنوری ۱۹۵۵ء سے پی۔ ای۔ ایس درجہ اول کی ایک آسامی پر پی۔ ای۔ ایس درجہ
کے اعلیٰ پیمانہ تنخواہ (۴۰۰ ـــ ۱۱۵۰) میں ترقی دی گئی۔

سید شبیر حسین۔ ایم اے۔ بی۔ ٹی افسر تعلیمات محکمہ تعلیم لاہور کو ۷ جنوری ۱۹۵۵ء سے پی
درجہ اول کی ایک آسامی پر پی۔ ای۔ ایس درجہ اول کے اعلیٰ پیمانہ تنخواہ (۴۰۰ ـــ ۱۱۵۰
(قائم مقام) میں ترقی دی گئی۔

ای/۲۴/۱۹ م۔ محمد اکرم۔ صنعتی مڈل ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد ایوب انور کی جگہ جن کی
۲۰ جنوری ۱۹۵۵ء ہوئی تھی لیکن حاضر نہیں ہوئے (۶۰ ـــ ۱۲۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں عارضی ڈرائنگ ماسٹر
گورنمنٹ ہائی اسکول لیہ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۶/۱۹ م۔ مشتاق احمد۔ میٹرک ایس۔ وی اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ کو تاریخ حاضری
۲۰ جنوری ۱۹۵۵ء غلام رسول نثار کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
شاہ پور صدر مقرر کیا گیا۔

ای/۰/۱۶ م۔ مشتاق احمد خاں۔ بی۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس (دوم) کو جو اس وقت انسپکٹر تربیتی مدارس
۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کی جگہ کام کر رہے ہیں ۱۲ دسمبر ۱۹۵۴ء قبل دوپہر سے م۔ عبدالواحد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو
صدر معلم سنٹرل ماڈل اسکول لاہور ہو چکا ہے، ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس لائل پور مقرر کیا

س۔ نذر محمد بخاری۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس دوم (آزمائشی) ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس گجرات کو ۲۷ دسمبر ۱۹۵۴ء قبل دوپہر سے مسٹر نجم الدین کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس سرگودھا مقرر کیا گیا۔

چ۔ علی اکبر ایم۔ اے پی۔ ای۔ ایس (دوم) ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس مظفر گڑھ کو ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء بعد دوپہر سے س نذر محمد بخاری کی جگہ جو تبدیل ہو چکے ہیں ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس گجرات مقرر کیا گیا۔

خ۔ محمد اقبال ایم اے پی۔ ای۔ ایس (دوم) ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس راولپنڈی کو ۱۸ دسمبر ۱۹۵۴ء بعد دوپہر سے ایک موجودہ آسامی پر ڈپٹی انسپکٹر مدارس قسمت ملتان مقرر کیا گیا۔

م۔ عبدالعزیز ایم۔ اے پی۔ ای۔ ایس۔ ڈپٹی انسپکٹر مدارس قسمت راولپنڈی ۱۱ دسمبر ۱۹۵۴ء قبل دوپہر سے خ محمد اقبال کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے، ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس راولپنڈی مقرر کیا گیا۔

پیر عبدالحمید بی۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس منٹگمری کو ۱۰ دسمبر ۱۹۵۴ء قبل دوپہر سے م۔ عبدالعزیز۔ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ڈپٹی انسپکٹر مدارس قسمت راولپنڈی مقرر کیا گیا۔

۱۷۶۸ م۔ چراغ محمد چوہدری میٹرک پی۔ ٹی (۷۰ — ۱۴۰) قائم مقام ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی
ی ۱۹۵۵ء اسکول پاکپتن کو تاریخ حاضری سے م۔ بشیر احمد چوہدری کی جگہ جن کا تبادلہ کالج کے شعبہ میں ہو چکا ہے (۱۳۰ — ۲۵۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۱۳۰/- روپے ماہوار پہ ورزش ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ مقرر کیا گیا۔

۱۲۷۵ م۔ انیس احمد صدیقی (۷۰ — ۱۴۰) قائم مقام معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول
ری ۱۹۵۵ء ننکانہ کو تاریخ حاضری سے م۔ ملیح الرحمان کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پہ قائم مقام معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا مقرر کیا گیا۔

// م۔ ملیح الرحمان قریشی (۷۰ — ۱۴۰) قائم مقام معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا کو تاریخ حاضری سے م۔ انیس احمد صدیقی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پہ قائم مقام معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول ننکانہ مقرر کیا گیا۔

۱۱۷۸ م۔ محمد نذیر فاروقی ایک امیدوار کو یکم نومبر ۱۹۵۴ء سے ایک نئی منظور شدہ آسامی پر ۷۵ —
جنوری ۱۹۵۵ء ۱۹۰ کے پیمانہ تنخواہ میں ۷۵/- روپے ماہوار پر قائم مقام معلم فنون و دستکاری جونیئر ماڈل اسکول حسن آباد مقرر کیا گیا۔

۱۶۱/ ۳۹ م. نذیر احمد فاروقی. بی. اے. بی. ٹی. ایل. ایل. بی (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ
۳ جنوری ۵۸ء ہائی اسکول بھالیہ کو تاریخ حاضری سے پیرزادہ محمد بخش کی جگہ جو گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ
کے صدر معلم مقرر ہو چکے ہیں اپنی تنخواہ پر اے. ڈی. آئی کیمبل پور مقرر کیا گیا۔

صیغہ نساء ـــ شعبہ مدارس

ڈبلیو/۲۴۶۶ مس اکبری عبدالمجید ایف. اے. سی. ٹی. ایک امیدوار کو ۲ جنوری ۵۸ء قبل دوپہر استانی
۲۴ جنوری ۵۸ء فردوس فاطمہ کی جگہ جو رخصت پر ہیں (۷۵ ـــ ۱۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں ۹۰/- روپے
ماہوار پر قائم مقام نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول چیچا وطنی مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۲۴۲۷ استانی حمیدہ بیگم ایس. وی. ایک امیدوار کو ۳۱ مارچ ۵۸ء تک کی تاریخ حاضری سے
۱۷ جنوری ۵۸ء استانی اللہ رکھی کی جگہ جو سبکدوش ہو چکی ہیں (۶۰ ـــ ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۶۰/-
روپے ماہوار پر قائم مقام اردو معلمہ زنانہ گورنمنٹ ہائی اسکول راوی روڈ لاہور مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۱۸۹۷ استانی رمضان بی بی جے. اے. وی. نائب معلمہ زنانہ گورنمنٹ مڈل اسکول ساہی وال کو
جنوری ۵۸ء یکم اکتوبر ۵۷ء سے ۳۰ نومبر ۵۷ء تک مس رسول فاطمہ کی جگہ جن کو رخصت دی جا چکی
ہے (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں ۱۳۰/- روپے ماہوار پر قائم مقام صدر معلمہ گورنمنٹ
زنانہ مڈل اسکول ساہی وال مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۱۹۹۸ مس سعیدہ بیگم بی. اے. بی. ٹی (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول
جنوری ۵۸ء قصور کو ۳ جنوری ۵۸ء سے ۲ اپریل ۵۸ء تک مسز ز. عمر کی جگہ جن کو رخصت مل چکی ہے
اپنی تنخواہ پر قائم مقام صدر معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول قصور مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۱۵۶۵ مس حمیدہ بانو جے. اے. وی (۶۰ ـــ ۱۴۰) اردو معلمہ گورنمنٹ زنانہ نارمل اسکول لالہ موسیٰ
جنوری ۵۸ء کو ان احکام کے جاری ہونے کی تاریخ سے مس علی حسن کے مستعفی ہونے سے خالی ہونے والی
جگہ پر (۷۵ ـــ ۱۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ نارمل اسکول لالہ موسیٰ
مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۱۲۶۷ مس محمودہ سلطانہ منظور حسین جے. اے. وی (۶۰ ـــ ۱۴۰) اردو معلمہ گورنمنٹ زنانہ
جنوری ۵۸ء ہائی اسکول چیچا وطنی کو تاریخ حاضری سے مس رسول فاطمہ برقی کی جگہ جو بی. ٹی گریڈ میں
تبدیل ہو چکی ہیں (۷۵ ـــ ۱۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول
خانیوال مقرر کیا گیا۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجو کیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر مین یہ دو ھی تعلیمی رسالے ھین - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر مین یہی دو تعلیمی رسالے ھین - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں مین مقبول ھین -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھہ روپیہ (انگریزی) اور چھہ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں مین اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر

پنجاب ایجو کیشنل جرنل

اموزش

۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

شمارہ ۱۲]   لاهور   [مارچ ۵

اس شمارہ میں

ادارہ تحریر { پروفیسر سراج الدین / ایم - اے - مخدومی }
معاونین { عبدالغفور چودھ / فضل احمد }

تعلیمی ماہنامہ کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

17 AUG 1955

آموزش

لاہور

مارچ سنہ ۱۹۵۵ء

لد ــــــــــــ ۷

مارہ ــــــــــــ ۱۲

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

اداریہ

ایم ۔ اے ۔ مخدومی

سات برس گذرے پاکستان نے اپنے اوپر ایک ایسا نظامِ تعلیم مسلط پایا جس کی غایت یہ تھی

ہ برطانوی استعماری نظم و نسق کے لیے کچھ دفتری ملازم اور کلرک پیدا کرے، اس کا یہ منشا

نہیں تھا کہ ایک نوخیز قوم کے لیے رہنما، یا فنی ماہر یا جمہوری طرزِ زندگی کے لیے پڑھے لکھے

عوام پیدا کرے ۔

حال ہی میں ایک غیر ملکی ماہرِ تعلیم نے پاکستان کا دورہ کرنے کے بعد اپنے تاثرات یہ کہ کر

بیان کیے کہ اس ملک کو بے حد بڑے تعلیمی مسائل کا سامنا ہے ۔

یہ مسائل جہاں پاکستانی ماہرینِ تعلیم کی قوتِ عمل کو للکارتے ہیں وہاں وہ انہیں

کام کرنے کا ایک بڑا موقع بھی پیش کرتے ہیں ۔ ہماری تعلیمی ضرورتیں سہ گانہ ہیں۔

(۱) قومی سرگرمی کے ہر میدان میں ہمیں پُرخلوص اور فعال رہنماؤں کی ضرورت ہے ۔

(۲) ایک نیم صنعتی معاشی زندگی کے لیے ہمیں ماہر کاریگروں کی ضرورت ہے ۔

(۳) ہمیں ایسی روشن خیال رائے عامہ کی ضرورت ہے جو جمہوری طرزِ زندگی کو کامیاب بنانے کا

عزم کر چکی ہو، اور اس لیے مفت اور جبری تعلیم کی حامی ہو ۔

ہمارے تعلیمی مسائل کا کچھ اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اگرچہ تقسیمِ ملک کے بعد

ہمارے مدرسوں کی تعداد حیران کن تیزی کے ساتھ بڑھی ہے ۔ لیکن پھر بھی شہری رقبوں میں

ہمارے ساٹھ فی صد سے زیادہ بچے مدرسوں میں نہیں آ رہے ، دیہی علاقوں میں یہ تناسب

کافی کم ہے ، اس کا مطلب یہ ہے کہ قوم کو دن بدن زیادہ توانائی اور مالی وسائل تعلیم

صرف کرنے ہوں گے ، ہمارے مستقبل کا بڑا انحصار اس بات پر ہوگا کہ جو انسانی اور مالی ذ

تعلیم کی نذر ہو رہے ہیں وہ کس زمانہ سے اور کس قسم کے فوائد پیدا کر رہے ہیں۔ لیکن اس بات
انحصار تعلیمی رہنمائی کی خوبی پر ہے۔ تعلیمی قیادت کو یہ بات لوگوں کے سامنے عملی طور پر پیش کرنا
ہوگی کہ معاشرتی اور معاشی زندگی کو بہتر بنایا جا سکتا ہے، ایسی فعال رہنمائی کے بغیر کوئی معاشی
اور معاشرتی ترقی ممکن نہیں، صدیوں کے جمود کو توڑنے کی صرف یہی صورت ہے کہ معاشی
اور معاشرتی زندگی کی سرحدوں کو وسیع تر کیا جائے ؛

(انگریزی سے ترجمہ)

ا تعلیم کے مقاصد اور اُن کی تحصیل

ل احمد

سائنس کے مشہور عالم نیوٹن نے اپنے متعلق کہا تھا کہ میری مثال اس بچے کی ہے جو ساحل پر
ونگوں سے کھیل رہا ہو، علم و حکمت کے اتھاہ سمندر کی مجھے کچھ خبر نہیں، نیوٹن کے وقت سے
لراب تک سائنس اور علوم و فنون نے جو ترقی کی ہے اسے دیکھ کر علم کے کسی متلاشی یہ پکار اٹھتے
یا کہ جدید سائنسوں اور دیگر علوم کو پوری طرح احاطہ کرنا دن بدن ایک مشکل کام بنتا جا رہا ہے
ج سے سو سال پہلے سائنس کے ایک طالب کو جن حقائق کو بنیاد قرار دے کر کام کا آغاز کرنا
تا تھا آج ان کا مجموعہ کئی گنا ہو چکا ہے، نیوٹن، کاپرنیکس یا دوسرے ماہرین سائنس نے جس
سائنسی سطح پر اپنے انقلاب آفریں انکشافات کیے تھے آج اس سے کئی گنا بلند ہوئے بغیر کوئی
انکشاف کرنا ممکن نہیں، انسان کو زندگی کی جو مختصر مہلت دی جاتی ہے اس کو دیکھتے ہوئے
کیا اس بات کا کھٹکا تو نہیں کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ موجدوں اور ماہرین سائنس
کا وجود کم ہوتا جائے گا؟ بظاہر اس کا جواب ہاں میں نظر آئے گا لیکن انسانی زندگی کے ایسے تاریک
مستقبل کی فی الحقیقت کوئی وجہ نہیں، وہ اس لیے کہ ہر آنے والی نسل کو سائنس یا دوسرے علوم
میں ابجد سے آغاز کرنا نہیں پڑتا، علمی تحقیق و جستجو کے میدان میں ان کی منزل وہاں سے شروع
ہوتی ہے جہاں ان کے پیش روؤں کی منزل ختم ہوئی تھی، پہلے لوگوں کی محنت نے جہاں تک
راستہ صاف کر دیا تھا اسے اس سے آگے قدم بڑھانا ہوتا ہے، اس طرح گویا ہر نئی پود اپنے سے
پہلی نسل کے کندھوں پر کھڑی ہو کر حقیقت کے پراسرار چہرے کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے، یہ اسی
بات کا صدقہ ہے کہ آج سائنس کا ایک اوسط طالب علم نیوٹن سے زیادہ سائنسی حقائق پر نگا
رکھتا ہے یا بات کا ایک سمجھدار طالب علم ارسطو سے زیادہ باخبر ہے اور ریاضی کا اچھ

طالب علم اقلیدس سے زیادہ جانتا ہے۔

لیکن اس استدلال سے ایک غلط فہمی پیدا ہونے کا ڈر ہے یہ درست ہے کہ آج یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے کئی طلبہ نیوٹن، کوپرنیکس، البیرونی، غزالی اور ارسطو کے مقابلہ میں زیادہ باتیں جانتے ہیں، تاہم اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ان جلیل القدر سائنس دانوں اور عالموں کے ہم پلہ ہیں، ان عالموں نے جو حقائق اور اصول دنیا کو بتائے وہ خالص ان کے اپنے ذہن کی پیداوار تھے، انہوں نے اپنے پیش روؤں کے دریافت کردہ حقائق کو نگاہ میں رکھ کر نظام فطرت پر ایک گہری آفاقی نگاہ ڈالی اور مطلوبہ حقائق اور اصولوں کی نئی نئی کارفرمائیوں کا کھوج لگایا، اگر زندگی انہیں چند اور دہائیوں کی مہلت دیتی تو یہ لوگ علم وفضل کے ذخیرہ میں کئی گنا اور اضافہ کر دیتے، ان کے مقابلے میں ہماری یونیورسٹیوں کے طالب علم گو دوسروں کے دریافت کردہ حقائق اور اصولوں کو ازبر کیے ہوئے ہیں، مگر ان کے اس علم میں وہ سائنسی گہرائی اور آفاقی وسعت نہیں جو مذکورہ صدر عالموں کو نصیب تھی، یونیورسٹیوں کے عام طالب علم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ بالغ نظر عالموں اور سائنس دانوں کی معلوم کردہ باتوں کو سمجھ کر اخذ کریں، وہ انہیں ہمہ گیر کائناتی نظام کی ناگزیر کارفرمائیوں کے رنگ میں نہیں دیکھ سکتے۔ تاہم یونیورسٹی تعلیم کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ غیر معمولی ذہانت رکھنے والے ہونہار طلبہ کی اس طور پر تربیت کرے کہ وہ تحقیق واکتشاف اور علم ونظر کی نئی نئی راہیں نکالتے رہیں، ہر چند ایسے طالب علم انگلیوں پر گنے جا سکیں گے جو فکر ونظر کی اس بلندی پر پہونچ سکیں، پھر بھی ان کا کھوج لگانا اور ان کی موزوں تعلیم وتربیت کا اہتمام کرنا قومی بقا اور انسانی فلاح دونوں کے لیے ایک سا ضروری ہے، کسی ایسے جوہر قابل کا یوں ہی ضائع ہو جانا ایک بہت بڑا قومی نقصان ہے، اس نقصان کا پورے طور پر سد باب کرنا اعلیٰ تعلیم کی ایک بھاری ذمے داری ہے، اگر کسی ملک میں اعلیٰ تعلیمی اداروں کی فراوانی ہو، لیکن یہ ادارے سالہا سال تک کوئی دیدہ ور پیدا نہ کریں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اعلیٰ تعلیم اپنے ایک بڑے مقصد میں ناکام رہی ہے، اس پر جو روپیہ خرچ

جا رہا ہے وہ پورا نفع نہیں دے رہا۔ ایسی صورت میں اعلیٰ تعلیم کے نصاب (جس میں نفس مضمون
طریقہ ہائے تدریس ہر دو شامل ہیں) کی تعمیر نو ہونی چاہیے۔

روشن خیال طبقہ

ہم پیچھے کہہ آئے ہیں کہ جب اعلیٰ تعلیم پوری طرح کامیاب ہو تو بھی وہ
گنتی کے صاحب فکر و نظر لوگ پیدا کر سکے گی، وجہ یہ کہ اس کے لیے جو
فوق العادۃ ذہانت و فطانت درکار ہے وہ بہت تھوڑے لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ یہاں
شاید بعض ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ اعلیٰ تعلیم صرف انہی لوگوں کے لیے کیوں نہ مخصوص کر دی جائے
جو صاحب فکر و نظر بننے کی صلاحیت رکھتے ہوں؟ ایسا کرنا دو وجوہ کی بنا پر غیر پسندیدہ ہے، پہلی
وجہ یہ ہے کہ ابھی تک تعلیم کوئی ایسے امتحان یا آزمائشیں وضع نہیں کر سکی جن کی مدد سے کسی بچے کے
متعلق حتمی طور پر کہہ دیا جائے کہ وہ آگے چل کر ایک بڑا ادیب، دانشور یا عالم بنے گا۔ فکر و نظر ایسی قیمتی
متاع ہے کہ اس کی موجودگی کا جہاں تھوڑا سا گمان بھی ہو وہاں بھی اس کی پرورش کے لیے ہر ممکن
سہولت بہم پہنچانی چاہیے۔ اس لیے لامحالہ اعلیٰ تعلیم کے دروازے نسبتاً زیادہ لوگوں پر کھلے
ہونے چاہئیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ گو اصحاب فکر و نظر کا وجود ایک بیش قیمت دولت ہے، اس
دولت کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھی کچھ لوگ چاہئیں
لوگ عام زبان میں روشن خیال طبقہ کے نام سے پکارے جاتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن
یہ استعداد تو نہیں کہ فکر و نظر کی نئی راہیں نکال سکیں لیکن وہ ایسی راہیں نکالنے والوں
پہچان ضرور سکتے ہیں اور ان کی دریافت کردہ راہوں کی اضافی قیمت کا فیصلہ بھی کر سکتے ہیں
کام بھی کافی اہم ہے، اگر روشن خیال طبقہ موجود نہ ہو تو سائنس دانوں کی کاوش اور عالمو
کی محنت کی حوصلہ افزائی بہت کچھ گھٹ جائے، یہ روشن خیال طبقہ آج دنیا کے ہر مہذب
میں موجود ہے اور یہ اعلیٰ تعلیم ہی کی پیداوار ہے، روشن خیال طبقہ سے وہ لوگ مراد
جنہوں نے یونیورسٹی کی تعلیم پائی اور گو انہوں نے خود کوئی سائنسی انکشاف یا نمایاں علمی

انجام نہیں دیا لیکن اپنے زمانے کے متعدد عالموں کے نظریوں اور اصولوں کو بنیاد عمل بنانے والے یہی لوگ ہیں، اس لیے تعلیم کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ روشن خیال طبقہ کو نہ صرف پیدا کرے بلکہ ایسے وسعت

سائنس اور فنون

فنی ماہروں اور عام روشن خیال طبقہ میں جو باہمی تعلق ہے اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اس تعلق کے برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ روشن خیال طبقہ اور ماہر ایک دوسرے کی زبان کو سمجھیں یعنی روشن خیال طبقہ کو ماہرین فن کے استدلال کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے، سائنس کی دنیا میں یہ شرط بڑی حد تک مفقود ہو چکی ہے، اس صدی میں سائنس اور ٹکنالوجی نے اس تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے کہ ان کی مختلف شاخوں کی زبان حد درجہ فنی ہو کر رہ گئی ہے، پہلے حالت یہ تھی کہ صرف سائنس دان ہی سائنس دانوں کے استدلال کو سمجھ سکتے تھے، عام روشن خیال لوگ اسے کچھ زیادہ نہیں سمجھ سکتے تھے، آج حالت یہ ہو گئی ہے کہ ایٹم کے ماہروں کی بات صرف ایٹم ہی کے ماہر سمجھ سکتے ہیں، اسے عام سائنس دان بھی نہیں سمجھ سکتے گویا سائنس کے میدان میں عام روشن خیال طبقے کا تقریباً قریباً خاتمہ ہی ہو گیا ہے، روشن خیال لوگ سائنسی ماہروں کے کام کی قدر و قیمت نہیں جانچ سکتے، انہیں چار و ناچار ان کی ہر بات کو ماننا ہی پڑتا ہے۔

فنون کے میدان میں معاملہ بالکل الگ ہے، موسیقی ہو یا مصوری، شعر و ادب ہوں یا معاشرتی علوم، ان فنون و علوم کے ماہروں کے مقام کا فیصلہ روشن خیال طبقہ ہی کرے گا، فنون کے شاہکاروں کو دیکھ کر سر دھننے والے یہی لوگ ہوں گے، شعر و ادب کی اچھوتی ترکیبوں کو سراہنے والے بھی یہی ہوں گے اور سیاسیات و معاشیات کے نئے نظریوں کو فکر و عمل کی بنیاد بنانے والے بھی یہی۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے انزوا سے فنی مہارت میں بے شک اضافہ ہوا ہے، لیکن اب یہ خیال زور پکڑ رہا ہے کہ اس کا عوامی زندگی سے یوں کٹ جانا پسندیدہ نہیں، خالی فنی مہارت کسی کو اچھا انسان نہیں بنا سکتی، اچھا انسان بننے کے لیے اسے ان انسانی زروبانیوں کی بھی تھوڑی بہت خبر ہونی چاہیے جو فنون کی شکل میں محفوظ چلی آتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اب یہ

جب کیا جانے لگا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے طلبہ کے لیے بھی فنون اور معاشرتی علوم میں واقفیت لازمی قرار دی جائے تاکہ وہ مخصوص فنی مہارت کے ساتھ ساتھ انسانی قلب و دماغ کے تقاضوں سے بھی باخبر ہیں۔

مدرسے کی تعلیم

ہم نے اعلیٰ تعلیم کے دو اہم مقاصد قرار دیے ہیں :-
(الف) صاحب فکر و نظر لوگوں کا پیدا کرنا۔ (ب) ایک روشن خیال طبقہ پیدا کرنا جو اصحاب فکر و نظر کے کام سے لطف اندوز ہو اور اس کام کی قدر و قیمت کے متعلق صحیح رائے قائم کرے۔ یہاں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر روشن خیال طبقہ کا پیدا کرنا اعلیٰ تعلیم کا کام ہے تو مدرسے کی تعلیم کے ذمے کیا کام ہے! ہم دیکھ چکے ہیں کہ اصحاب فکر و نظر کے کام کو سمجھنے اور اس کے متعلق رائے قائم کرنے کے لیے سائنس، فنون یا معاشرتی علوم میں خاص ادراک کی ضرورت ہے، یہ ادراک ان علمی میدانوں میں مخصوص مطالعہ ہی سے پیدا ہو سکتا ہے اور یہ مخصوص مطالعہ یونی ورسٹی تعلیم سے پہلے ممکن نہیں، مدرسے کا فرض کسی مخصوص مطالعہ کا اہتمام کرنا نہیں بلکہ علوم و فنون کی ابجد سے آگاہ کرنا ہے، ابتدائی مدرسہ لکھنے پڑھنے اور گنتی کی بنیادی مہارتیں بہم پہنچاتا ہے، یہ وہ آلاتی مضامین ہیں جن کے بغیر علم کی طرف قدم اٹھانا ہی ممکن نہیں، جب طالب علم تحصیل علم کے ان آلوں سے لیس ہو جاتے ہیں تو پھر ثانوی درجے پر وہ ان کی مدد سے سائنس، فنون اور علوم کی ابجد سیکھتے ہیں، وہ کسی خاص مضمون میں مہارت پیدا نہیں کرتے۔ بلکہ زبان، ریاضی، فنون، معاشرتی علوم اور سائنس غرض علم کے تمام میدانوں کے متعلق ابجد کا مطالعہ کرتے ہیں، اس ابجد کو اخذ کیے بغیر وہ جدید سائنسی تہذیب میں اپنا راستہ نہیں ڈھونڈ سکتے، مدرسے کی تعلیم کا کام ابتدائی قسم کی عام واقفیت اور شہری صلاحیت پیدا کرنا ہے، اس کے برعکس اعلیٰ تعلیم گاہیں ایک خاص قسم کی بینائی پیدا کرنے کا اہتمام کرتی ہے۔

طریقِ تدریس

اعلیٰ تعلیم کے مقاصد دیکھ لینے کے بعد اب ہم اس قابل ہیں کہ اس کے لیے

موزوں طریقہ ہائے تدریس دریافت کر سکیں کچھ سال ہوئے پنجاب یونی ورسٹی کی طرف سے کالجوں کے اساتذہ کے نام ایک سوال نامہ جاری کیا گیا تھا جن میں ان اصحاب سے ان کے پسندیدہ طریقہ تدریس کے متعلق بھی دریافت کیا گیا تھا۔ جواب میں بعض بزرگواروں نے بڑے فخریہ لہجے میں کہا تھا کہ وہ سالہا سال تک پڑھانے کے باعث اپنے مضمون پر اتنے حاوی ہو چکے ہیں کہ انہیں اب کسی تیاری کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ بعض نے کہا تھا کہ انہوں نے نوٹ تیار کر رکھے ہیں جو ان کی ساری قابلیت اور سارے تجربے کا نچوڑ ہیں وہ سال بسال ان نوٹوں کے سہارے پڑھانے جاتے ہیں، کیوں کہ اس سے بہتر تیاری تصور ہی میں نہیں آسکتی۔

معلوم نہیں مستقل طور پر تیار کردہ نوٹوں کو لکھا دینے کے طریقہ کو کیا نام دیا جائے اگر اعلیٰ تعلیم میں طلبہ کے لیے صرف اسی قدر کافی ہو کر وہ استاد کے لکھائے ہوئے نوٹ احتیاط سے لکھ لیں اور امتحان کے قریب ان کے ضروری حصوں کو زبانی یاد کرلیں تو یہ غایت گھر پر بیٹھے بھی پوری ہو سکتی ہے، پروفیسر صاحب کے نوٹ اگر ایسے ہی جادو اثر ہیں تو انہیں طبع کرایا جا سکتا ہے تاکہ استاد اور شاگرد دونوں املا لکھانے اور لکھنے کی زحمت سے بچ جائیں۔ لیکن یہ طریق کار اعلیٰ تعلیم کے اوپر بیان کیے گئے مقاصد کو ہرگز پورا نہیں کرے گا، اس سے صحیح معنوں میں روشن خیال طبقہ بھی پیدا نہ ہو سکے گا چہ جائیکہ صاحب فکر و نظر لوگ پیدا ہوں۔

دو متبادل راستے

اعلیٰ تعلیم کی اصل غائت کو پورا کرنے کے تمام طور پر دو طریقے رائج ہیں:-

(۱) استاد موضوع کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح تیار ہو کر آئے اور لیکچر کے ذریعے ان پر پوری شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالے۔

(۲) طالب علموں کے ایک چھوٹے گروہ کے ساتھ جو تعداد میں پندرہ بیس سے زیادہ نہ ہوں اجازت دہ ماحول میں اس طرح بحث و تمحیص کی جائے کہ موضوع کے سارے پہلوؤں پر اچھی طرح روشنی پڑ جائے۔

اعلیٰ تعلیم کے جو مقاصد بیان ہو چکے ہیں ان کے پیش نظر یہ دونوں طریق مفید مطلب کام

ے سکتے ہیں، بعض استاد ایک طریقے میں زیادہ ماہر ہوں گے بعض دوسرے میں۔ ایک
ٹا یا یونی ورسٹی کی فضا لیکچر کے لیے زیادہ سازگار ہوگی، دوسروں کی طریق بحث و تمحیص کے لیے
ن استادان دونوں کے مرکب سے اپنا جداگانہ طریق کار وضع کریں گے، اس ضمن میں کسی
ی معیار پسندی پر زور دینے کی ضرورت نہیں، لیکن پرانی روایات اور اپنے زمانہ طالب علمی
ے تاثرات کے سبب بہت سے پروفیسر لیکچر کو ترجیح دیتے ہیں، بحث و تمحیص سے کامیابی کے ساتھ
ام لینے والے استاد نسبتاً کم ہیں، اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ دونوں طریقوں میں سے
بحث و تمحیص کا طریق اعلیٰ تعلیم کے مقاصد سے زیادہ قریب ہے، یہ فکر و نظر کی تربیت ایسے پرتاثیر
عملی طریق سے کرتا ہے جو کسی دوسری طرح ممکن نہیں، لیکچر میں کچھ واضح کمیاں ہیں لیکن ان کے
باوجود بعض ایسے تعلیمی فوائد ہیں جن کے لیے لیکچر بہت خوب ہے۔

عملی تجربہ کی شہادت

حال ہی میں ریاست اوہائیو (ریاست ہائے متحدہ امریکہ) کے ایک
بڑے کالج کے استاد طبیعات نے اپنے ذاتی تجربہ کے نتائج ایک
مضمون کی شکل میں پیش کیے ہیں، ان کی رائے ہے کہ استاد اور طلبہ کے درمیان افہام و تفہیم
کی غالباً اس سے بدتر اور کوئی صورت نہیں کہ استاد اکیلا ہی گھنٹہ پون گھنٹہ بولتا چلا جائے
اس سارے وقت میں اس کے سوا اور کسی کی آواز نہ سنائی دے اور طالب علم خاص تعلیمی اغراض
کے لیے لیکچر کے نہایت عمدہ نوٹ لیتے جائیں۔ اگر یہ لیکچر حد درجہ قابلیت کے ساتھ دیا جائے، طلبہ
پوری توجہ سے اسے سنتے رہیں اور اس کے اہم نکات قلم بند کرلیں تو بھی یہ طریق کار ایک
نسبتاً ادنیٰ درجے کی کامیابی حاصل کرے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر طالب علم سوال و جواب
ے استاد کو اپنے ردّ عمل سے باخبر نہیں رکھتے تو اس کے پاس یہ تعین کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ
وہ ذہنی طور پر اس کے ہم قدم ہیں، چپ چاپ کے سناٹے کو ذہنی ہم قدمی کے مترادف خیال کرنا
ایک ایسا مفروضہ ہے جو تعلیمی اور نفسیاتی طور پر درست نہیں، اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ سب طالب علم
پروفیسر کے استدلال کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں تو عملاً اس تقریر کا ماحصل کیا ہے؟ یہی نا کہ

کہ نصاب کے مندرجات کو کھول کر بیان کیا جا رہا ہے۔ اب اگر کوئی کتاب ان مندرجات کو اسی شرح و بسط کے ساتھ صاف ستھری زبان اور مناسب پیرائے میں بیان کر دے تو لیکچر کی کیا ضرورت باقی رہی؟ بلکہ یہ کتاب ایک لحاظ سے لیکچر پر فوقیت رکھے گی، کیوں کہ ہر طالب علم اسے اپنی افتادِ طبع کے مطابق پڑھے گا، اسے یہ کھٹکا نہیں ہوگا کہ اگر لحظہ بھر توجہ ادھر ادھر ہٹی تو کوئی اہم نقطہ ہاتھ سے نکل جائے گا اور امتحان کے وقت مشکل کا سامنا ہوگا۔

طلبہ کے نوٹ

لیکچر پر یہ اعتراض اس وقت بھی وارد ہوتا ہے جب اس کی ہر شے معیاری ہو لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کے اکثر عناصر بے حد بے پروائی کے ساتھ یکجا کیے جاتے ہیں، اگر استاد نے پوری دل سوزی کے ساتھ تیاری کر رکھی ہے تو اس بات کا کیا یقین ہے کہ طالب علم لیکچر کے اچھے نوٹ تیار کریں گے! ۱۹۲۶ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے واسر کالج کے کتب خانے نے طلبہ کے نوٹوں کا ایک نمونہ شائع کیا تھا، جسے دو مزاح نگاروں نے مزے لے لے کر مرتب کیا تھا، سچ یہ ہے کہ پروفیسر صاحب اپنے الفاظ اور جملوں کے چننے میں لاکھ احتیاط برتیں اور ان کی ادائیگی میں انتہائی صحت و سکون کا اہتمام کریں، پھر بھی سننے والوں کی توجہ لازمی طور پر غیر مسلسل ہوگی، وہ نہ صرف صحیح مفہوم کے بعض حصوں کو حاصل نہیں کریں گے بلکہ جن حصوں کو درست طور پر سمجھیں گے انہیں بھی ایسے الفاظ کا جامہ پہنائیں گے جو کچھ دن اور ہفتے گزرنے پر عجیب و غریب مطالب کے حامل نظر آئیں گے۔

لیکچر کا مقام

لیکچر کی ان واضح کمیوں کو دیکھ کر پوچھا جا سکتا ہے کہ اس سے کام لینے کا اور کون سا جواز باقی رہ جاتا ہے؟ تدریس کے بعض مدارج پر لیکچر ہی موزوں ترین طریق کار نظر آتا ہے، آغازِ کار میں طلبہ کو یکجا کر کے انہیں آئندہ نصاب کے مقاصد، بنیادی مطالب اور طریقۂ کار کے متعلق بتائے بغیر چارہ نہیں، مطالعہ کی کسی اکائی کو شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ جماعت ایک مشترکہ مقصد کو اپنائے، یہ کام لیکچر ہی کے ذریعہ انجام پا سکتا ہے، جب مطالعہ کی یہ اکائی ختم ہونے کو ہو تو جماعت کو پھر

باہم نے اور اس مطالعہ پر تبصرہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض علمی تجربات
و مشاہدات ایسے ہیں جن کے لیے جماعتی طریق ہی حسب حال رہتا ہے۔ مثلاً ایک نمونے کا
سبق یا عملی تجربہ پیش کیا جا رہا ہے، یا باہر سے کوئی عالم آیا ہے، اس عالم کو یہ تکلیف نہیں
دی جا سکتی طلبہ کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے ساتھ بار بار بات چیت کرے، وہ لامحالہ سب کو
یکساں ہی بار خطاب کرے گا۔ ان مواقع کے علاوہ بحث و تمحیص کے سرگرم حامی کو بھی بعض اوقات
اس لیے لیکچر سے کام لینا پڑے گا کہ اس کے پاس اتنا وقت نہیں کہ جماعت کو چھوٹے گروہوں
میں بانٹ کر ہر گروہ کے لیے الگ الگ بحث و تمحیص کا بندوبست کرے اور یا اس لیے کہ بعض اوقات
وہ پرانی روایات و عادات سے اس حد تک متاثر ہو جائے گا کہ لیکچر کو زیادہ سہل راستہ خیال کرے۔
لیکچر کے بعض اور فوائد بھی ہیں، لیکچر کو طلبہ کے سامنے ایک طبع شدہ جواب مضمون کی تشکل میں بھی
پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکچر کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ تقریر سامعین کے سامنے ایک ممتاز
قابلیت اور مخصوص علمی اصولوں کے ساتھ ممتاز وابستگی کا زندہ نمونہ پیش کر سکتی ہے، تقریر
طلبہ کے سامنے اس بات کا عملی مظاہرہ کر سکتی ہے کہ موزوں الفاظ کو کس طرح چنا جاتا ہے اور
انہیں کیوں کر ایک پُر تاثیر رواں پیرائے میں پیش کیا جاتا ہے، مسائل کے مختلف پہلوؤں کو
کس طرح منظم کیا جاتا ہے، اگر طالب علم اس قابل ہے کہ تقریر کے استدلال کو اول سے آخر تک
اچھی طرح سمجھ لے تو اسے یہ اطمینان بخش احساس ہوتا ہے کہ لیکچر کا موضوع ایک ایسے
علم یا سائنس سے تعلق رکھتا ہے جس کا نفس مضمون اور طریق استدلال ہر دو قابل فہم اور
دل چسپ ہیں۔

ایک فطری جوہر رکھنے والا گویا، واعظ اور وکیل ہمیشہ اپنے کان پر بھروسہ رکھتا ہے اس کا
حساس کان اسے بتاتا ہے کہ اس کی آواز اور الفاظ کا اتار چڑھاؤ کس حد تک کامیاب نتیجہ
پیدا کر رہا ہے، بالکل یہی حال ایک ذمہ دار مقرر کا ہے، اسے یہ فوراً معلوم ہو جانا چاہیے، کہ
اس کے الفاظ حاضرین کی اکثریت کو متاثر کر رہے ہیں یا نہیں۔

ان ساری باتوں کے باوجود لیکچر کی افادیت واضح طور پر محدود ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ لیکچر سننے والے طالب علموں کا ردعمل بے کیفی اور سرگرمی کی انتہاؤں کے بین بین ہوگا، وہ ذہنی سرگرمی کے اس فعال درجہ پر کبھی نہیں پہونچ سکتے جو تقریر کرنے والے یا مضمون لکھنے والے کا خاصا ہوا کرتی ہے، عموماً کہا جاتا ہے کہ مقرر نے موضوع کو اس رنگ میں پیش کرتا ہے جس سے وہ سننے والوں کی قوت عمل کو للکارتا ہے، اور پھر وہ اس مسئلہ کے حل کا ڈھنگ بھی بتادیتا ہے، یہ طریق کار ایسی ذہنی آسائش کا ضامن ہے جو نوجوان طلبہ کو کبھی کبھی ضرور میسر آجانی چاہیے۔ لیکن انہیں اس کا عادی نہ بنانا چاہیے۔ انہیں اکثر مسائل کے حل اپنے دل ودماغ پر زور ڈال کر خود معلوم کرنے چاہئیں، یہ لگاتار اور فعال ذہنی محنت ایک باقاعدہ طور پر منظم بحث ومباحثہ ہی کے طفیل میسر آسکتی ہے، ایسا بحث ومباحثہ جو نہایت بے تکلف اور پرمحبت فضا میں کیا جائے۔

بحث وتمحیص

کالج کے درجہ پر طالب علم ذہنی پختگی کے اس مقام پر پہونچ چکے ہوتے ہیں کہ حالات کی پوری ذمے داری خود سنبھال سکیں، اس منزل پر بھی اگر انہیں بچوں کی طرح بے بس رکھا جائے اور استاد وشاگرد کا رشتہ انہیں مفروضوں پر قائم رہے جو مدرسے کی زندگی میں کارفرما تھے تو اس کا یقینی نتیجہ اس خام کاری کو عام کرنا ہے جس کی ہمیں اکثر شکایت ہے، کالج کے درجہ پر یہ نکتہ خاص طور پر اہم ہے کہ استاد اور شاگرد میں سوائے اس کے اور کچھ فرق نہ ہو کہ اول الذکر کو اس کا وسیع تر علم اور پختہ تر تجربہ رہنمائی کا کام سونپتے ہیں، لیکن یہ رہنمائی ایک نگہبان کی رہنمائی نہیں، ایک شفیق دوست کی رہنمائی ہونی چاہیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ بحث وتمحیص کی فضا ہر قسم کے رسمی تکلف سے آزاد ہونی چاہیے، اس اجازت دہ ماحول کے پیدا کرنے اور طلبہ کو اس کا خوگر بنانے کے لیے استاد کو خاص کوشش کرنا ہوگی، لیکن یہ محنت توقع سے زیادہ پھل لائے گی، بحث وتمحیص میں حصہ لینے والے افراد تیزی سے خود آگہی اور حقیقت پسندی کے سبق سیکھنے لگیں گے، بہتوں کو اپنے ایسے جوہروں کی خبر ہونے لگے گی جن کا انہیں وہم وگمان تک نہ تھا، بعض کے غیر ضروری پندار اور خود نمائی کا علاج ہونے لگے گا، سب کے سب ایک دوسرے کو

ی مگر دوستانہ تنقید کو برداشت کرنے لگیں گے۔ ہر ایک کو نپے تلے الفاظ، سلجھے ہوئے خیالات اور مہذب
یہ بیان اختیار کرنا پڑے گا۔ ہر مسئلہ پر رنگا رنگ نقطہ ہائے نگاہ سے روشنی پڑے گی، جوں جوں
ت گذرتا جائے گا بحث میں حصہ لینے والوں پر یہ حقیقت کھلتی جائے گی کہ صرف واقعات و معلومات
ذکر لینے اور دوسروں کی تقریروں کو سن لینے سے کام نہیں چلتا، بلکہ اپنے طور پر سوجھ بوجھ کے ساتھ
لائل کو تولنے اور انہیں ترتیب دینے اور ان سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی ضرورت، اس سے کہیں زیادہ
ہے، یہ ذہنی مہارت ہر طالب علم کو اس قابل بنا دے گی کہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ پر حملہ کرنے کے لیے
بھی تیار ہو جائے، اسے اب نہ صرف اپنی قوت فکر پر بھروسہ ہوگا بلکہ وہ ان طریقوں سے بھی واقف
ہو جائے گا جن کی مدد سے ہر الجھن کو حل کیا جاتا ہے۔

ایک بین مثال

بحث و تمحیص کے طریق کو محض تقریری سبق سننے پر جو فوقیت حاصل ہے۔
اس کی نمایاں سب سے بین مثال ہر استاد کا ذاتی تجربہ ہے۔ راقم کو ایک دوست کا
قول یاد ہے جو کہا کرتے تھے کہ جس مضمون میں اعلیٰ مہارت حاصل کرنا مقصود ہو اسے پڑھانے
لگ جاؤ، اگر لیکچر کا سن لینا بھی اتنا ہی مفید ہوتا جتنا اس کا تیار کرنا تو استاد اور شاگرد ہر دو ایک ہی
ذہنی سطح پر ہوتے، لیکن ایسا نہیں ہے، ہر نوجوان استاد جانتا ہے کہ جب اس نے تدریس کا کام
شروع کیا تو اسے اپنے مضمون کے کئی پہلوؤں پر اچھی طرح عبور نہیں تھا، لیکن ایک مرتبہ پڑھا لینے
کے بعد اس کے تمام نکتے صاف ہو گئے، آخر اس کی کیا وجہ؟ وجہ صرف یہ کہ استاد کو طالب علموں کے
طرح طرح کے شکوک دور کرنے ہوتے ہیں، اسے ان کے مختلف سوالوں کے جواب تلاش کرنے
ہوتے ہیں، پہلے اس نے صرف کتابیں پڑھ کر یا استادوں کے لیکچر سن کر یہ یقین کر لیا تھا کہ وہ مضمون
حاوی ہو گیا ہے، لیکن اب یہ یقین اس وقت ہوگا جب وہ اس مضمون کے ہر نکتہ کو پوری وضاحت
کے ساتھ طالب علموں کو سمجھا سکے گا۔ پہلا علم الیقین تھا تو دوسرا عین الیقین ہے۔ لیکچر زیادہ سے
زیادہ علم الیقین ہی عطا کر سکتا ہے اور بس لیکن بحث و تمحیص علم، الیقین کی دولت عطا کرتا
عین الیقین کے درجہ تک پہنچنے کے لیے اتنا کافی نہیں کہ کسی پر سکون گوشہ میں بیٹھ کر کتا

پڑھ لی جائے یا مزے سے پاؤں پھیلا کر کسی کی تقریر سن لی جائے اس کے لیے ایک سخت تر مرحلہ میں سے گذرنا پڑتا ہے وہ مرحلہ ہے دوسروں کے دو ستانہ اعتراضات کی تشفی کرنا، جو استاد لیکچر کو ذریعۂ تدریس بناتا ہے وہ اپنے لیے تو اجتہاد کا راستہ پسند کرتا ہے۔ لیکن اپنے طالب علموں کے لیے تقلید کا راستہ، وہ انہیں اس تخلیقی راستہ پر قدم نہیں رکھنے دیتا جس کے بغیر دل و دماغ کے حقیقی جوہر نہیں کھل سکتے۔

خاتمہ کلام مضمون کے اول میں اعلیٰ تعلیم کے مقاصد کا ذکر کیا گیا تھا۔ ہم نے دیکھا تھا کہ یہ مقاصد دوگونہ ہیں، پہلا مقصد ایسے صاحب فکر و نظر لوگوں کی تخلیق ہے جو علوم و فنون اور سائنس کے میدان میں قیادت کے فرائض انجام دیں، دوسرا مقصد ایسا روشن خیال طبقہ پیدا کرنا ہے جو اس مختصر سی قائد جماعت کے کارناموں کو جانچ سکے۔ ان دونوں اغراض کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ اعلیٰ تعلیم تفکر اور تدبر کی تربیت کرے۔ اس وقت ہمارے یہاں اعلیٰ تعلیم کا بڑا اسہارا لیکچر کا طریق ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں نے اب لیکچر کی بجائے بحث و تمحیص کا طریق اپنانا شروع کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ لیکچر بے شک ایک بلند پایہ شخصیت کی تاثیر کو نمایاں کرنے کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اس کی مدد سے کسی مسئلہ کو گرما دینے والے طور پر پیش بھی کیا جا سکتا ہے لیکن ان سے زیادہ اہم وہ ذہنی ورزش ہے جو تفکر اور تدبر کی ضامن ہے۔ اصلی سوچ بچار اسی وقت ممکن ہے جب انسان اپنے آپ کو کسی الجھن میں پھنسا پائے۔ یہ الجھن اسے ذہنی کاوش پر ابھارتی ہے اور اس طرح سوجھ بوجھ سے کام لینے، مناسب الفاظ کے استعمال کرنے اور مجلس میں بیٹھ کر بات کرنے کی مشق ہو جاتی ہے۔

بحث و تمحیص کا طریق اختیار کرنے کے لیے وقت اور دوسری سہولتوں کی فراوانی چاہیے، ہمارے یہاں کالجوں میں جو ہجوم ہے وہ کمرہ جماعت میں اس طریقہ کے اختیار کرنے کی زیادہ اجازت نہیں دیتا۔ لیکن غیر تدریسی مشاغل کے سلسلہ میں اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ کالجوں میں اتالیقی نظام بھی رائج ہے جس کے ماتحت طالب علموں کا ایک چھوٹا سا گروہ ہفتے میں دو ایک بار ایک اتالیق

س جمع ہوتا ہے، اس فرصت کو بحث و مباحثہ کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، لیکچر کے دوان
ی لبا اوقات کسی نکتہ پر بات چیت چھیڑی جا سکتی ہے، غرض اعلیٰ تعلیم کو ہر اس موقع سے فائدہ
ا چاہیے جو زیادہ سے زیادہ طالب علموں کو خود سوچنے اور اپنے خیالات کو دوسروں کے سامنے
رکرنے پر مجبور کرے۔

معاملات پر اپنے طور پر سوچنے کی صلاحیت ہی وہ بلند جوہر ہے جو انسان کو حقیقی انسانی
ی علا کرتا ہے، یوں سوچنے کو تو ہر انسان سوچتا ہے، لیکن سوچ بچار کی مختلف سطحوں
ں بڑا فرق ہے، جو شخص یوں ہی بیکار بیٹھا خیالی قلعے تعمیر کرتا رہتا ہے سوچتا وہ بھی ہے، لیکن
ی سوچ بہت گھٹیا درجے کی سوچ ہے، جو لوگ پرانی لکیروں کو پیٹنے ہی میں زندگی گذار دیتے
یں سوچتے وہ بھی ہیں، ان کی سوچ خیالی پلاؤ پکانے والے سے اونچے درجے کی ہے لیکن
ا سے بھی اونچا درجہ نہیں دیا جا سکتا، اس سے بلند تر مقام اس سوچ بچار کا ہے جو پرانی ڈھپوں سے
ہٹ کر اپنے لیے نئی نئی راہیں نکالتی ہے، اس ذہنی اپچ کو تفکر و تدبر کا نام دیا گیا ہے اس
میں کچھ کلام نہیں کہ غور و فکر کا مادہ ہی آدمی کو انسانیت کے معراج تک پہونچا سکتا ہے، جو
لوگ اس اجتہادی نگاہ سے عاری ہیں ان کے دلوں پر گویا قفل لگے ہوئے ہیں، قرآن حکیم
نے قفل کا استعارہ اس لیے استعمال کیا ہے کہ فطرت نے ان دلوں کو بنجر پیدا نہیں کیا
انہیں سوچنے سمجھنے کی استعداد پوری دی گئی تھی۔ لیکن یہ لوگ اس استعداد سے کام
نہیں لیتے۔ اعلیٰ تعلیم کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ تعلیم پانے والوں کو تفکر او تدبر کا عادی
بنائے۔

دنیائے عرب میں

تعلیمی اور ثقافتی تبدیلیاں

محمد عبدالعزیز (مسلسل نمبر ۲)

ثانوی مدارس

ابتدائی مدارس کی طرح ثانوی مدارس کا معیار تعلیم نصاب اور نظام کار وہی ہے۔ ان اداروں میں جو رجحانات فکر سرگرم عمل ہیں انہیں ابتدائی مدرسوں کی فکری اور ذہنی بلندی سے کسی طرح علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک ہی تصویر کے دو رخ اور ایک ہی چشمے کے دو دھارے ہیں۔ یہاں بھی درس و تدریس ہی پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے، سماجی مشاغل اور طلبہ کی ہمہ گیر نشوونما اگرچہ ادارے کی ذہنی تربیت کا خشت اول سمجھی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود نصاب کی چند مخصوص قوتوں کے علاوہ سارے تدریسی التزامات شجر ممنوعہ کا درجہ رکھتے ہیں، اس لیے بالعموم یہ ادارے کالجوں میں داخلے کی تربیت کا کام دیتے ہیں۔ بغداد کے "مدرسۃ الاقتصادیہ" کے علاوہ کوئی مدرسہ ایسا نہیں ہے جس کے فارغ التحصیل براہ راست کسی یونی ورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ لے سکیں گویا یہ مدرسے ہمارے موجودہ ہائی اسکولوں سے ملتے جلتے ہیں، یعنی یونی ورسٹی میں داخل ہونے کے لیے انٹرمیڈیٹ کالجوں میں داخل ہونا ناگزیر ہے۔ پیشہ ورانہ مدرسوں میں بھی تعلیم کا معیار اس سے مختلف نہیں البتہ اگر کسی مخصوص شاخ میں کسی مدرسے میں اعلیٰ تعلیم کا بھی انتظام ہے تو طالب علم وہیں اپنی تعلیم ختم کر سکتا ہے لیکن اس قسم کے ادارے بہت کم ہیں، بلکہ اس مقام پر ایک طالب علم اگر ایک شاخ سے کسی دوسری شاخ میں جانا چاہے تو اس میں وقت بھی صرف ہوتا ہے اور وہ مہارت بھی پیدا نہیں ہونے پاتی۔

پاکستان میں بھی فنی اور ٹکنیکل ثانوی مدرسوں کی بڑی کمی ہے اور اگر خال خال کہیں دو ایک ایک ایسے ادارے موجود ہیں تو وہ ملک کی ضروریات پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ برطانیہ سے جو نظام تعلیم ہمیں ورثے میں ملا ہے وہ ثانوی مدرسوں میں بھی مختلف علوم کے چند ابتدائی موضوعات سے متعارف

کرانے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ ہر مدرسے میں جو تعلیم دی جاتی ہے یا بچوں کی جس عنوان سے پرورش ہوتی ہے یا جس نوع پر ان کی تربیت کی جاتی ہے اس کا زندگی سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں یا اگر تعلق ہوتا ہے تو اتنا سطحی ہوتا ہے کہ مدرسے کی فضا سے نکل کر بچہ دنیا کی تلاطم خیزیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا، عربوں کے ثانوی مدرسوں میں بھی اسی طرح نصاب کے چند مخصوص موضوعات پر زور دے کر طلبہ کو حقائق امروز و فردا سے بے گانہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان حالات میں کیا ان اداروں میں زندگی کا سوز و گداز پیدا ہو سکتا ہے؟ کیا یہاں انسان "در شاہین شکار" اور "یزداں گیر" بن سکتا ہے، بظاہر تو اس کا کوئی قرینہ نہیں ویسے اگر اکا دکا کوئی مرد کار پیدا ہو جائے تو اسے ہم ایک بہت بڑا اعجاز یا کرشمہ کہہ سکتے ہیں۔

ان مدرسوں کے ارباب حل و عقد یا جو بچے یہاں تعلیم پاتے ہیں باوجود والدین ان سے متعلق ہیں ان کی نگاہیں محدود، ان کا مطمح نظر پست، ان کے خیالات سطحی اور ان کی منزل غیر متعین ہوتی ہے۔ وہ اس نصابی تعلیم کو تعلیم بلکہ عین علم سمجھتے ہیں، اور اس کی تحصیل میں اپنا سارا وقت اور اپنی تمام توجہ صرف کر دیتے ہیں (اسے وہ برتر اور افضل سمجھتے ہیں) اس لیے ہر گھرانہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کی پوری پوری کوشش کرتا ہے کیوں کہ اپنی معاشری زندگی میں ایک معزز مقام حاصل کرنے کے لیے یہی تعلیم ضروری بلکہ مقدم ہے۔ اس لیے لوگ بالعموم اس کی طرف بھاگتے تو ہیں لیکن اس سے توقع کے مطابق فائدہ نہیں اٹھا سکتے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہر بچے کی ایک ذہنی اٹھان ہوتی ہے، اس کے فطری رجحانات ہوتے ہیں اور اس کے جبلی خواص ہوتے ہیں جو اس کی زندگی کی تعمیر و تخریب میں پورا پورا حصہ لیتے ہیں، اس لیے جن طلبہ کی ذہنی سطح معمول سے نیچی ہوتی ہے وہ مدرسے کی امتحانی پابندیوں کا شکار ہو کر اپنی بعض فطری خوبیاں بھی کھو دیتے ہیں۔

طلبہ کی اجتماعی تربیت کے پیش نظر اس وقت تک صرف عراق میں ثانوی مدارس کی تعمیر نو کی کوشش کی گئی ہے، لیکن یہ کوشش بھی ایسی ہمہ گیر نہیں ہے جو عراق کی تمام تر تعلیمی ضروریات کا احاطہ کر سکے۔ پچھلے دنوں یونیسکو نے عراق میں ابتدائی لازمی تعلیم کے مسئلے پر ایک مختصر سا رسالہ شائع کیا ہے اس کے مندرجات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عراق میں تعلیم کو مفید عام بنانے کے لیے اب تک جو قدم

اٹھایا گیا منزل سے بہت دور ہے ۱۹۳۲ء میں منرو کمیشن رپورٹ شائع ہوئی لیکن چوں کہ بعض عراقی ماہرین تعلیم کو ہر علاقے اور ہر قریے کے لیے ایک ہی نصاب تعلیم رکھنے پر اصرار تھا، اس لیے اس رپورٹ کی مخالفت ہوئی اور بنیادی طور پر عراقی مدرسوں کے نظام کار اور نصاب میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی، اس سلسلے میں مصر و شام اور لبنان کا بھی یہی حال ہے، اگرچہ اب کہیں کہیں ان روایاتی مدارس کے پہلو بہ پہلو زراعتی اقتصادی، صنعتی اور ٹکنیکل مدرسے بھی کھل رہے ہیں۔ مگر ہر ملک میں ان کی حیثیت اب تک مسلم نہیں ہو سکی، ان فنی مدرسوں سے فائدہ اٹھانے کی اب تک نہ تو طلبہ نے کوشش کی نہ والدین نے کوئی توجہ دی اور نہ حکومت نے انہیں جدید سے جدید تر بنانے کے لیے کوئی عملی اقدام کیا۔ اس طرح نہ تو ان کی صحیح افادیت سے عوام روشناس ہو سکے اور نہ حکومت کی منصوبہ بندی کے پیش نظر قوم کی آنے والی نسلوں کی مالی اور اقتصادی مشکلات کا کوئی حل پیش کر سکی، یہ ایک ایسا اہم مسئلہ ہے جو ہر ملک میں موجود ہے، اور جس کا حل سوچے بغیر سیاسی یا سماجی اعتبار سے ترقی کرنا ایک بے معنی سی بات ہے۔

عوام اور ثانوی تعلیم

عرب ممالک میں خواہ عراق ہو یا مصر، شام ہو یا لبنان یا جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی علاقے۔ عمان اور مسقط عوام کی معاشی زندگی پر افلاس اور ناداری کا اطلاق ہوتا ہے، نہ انہیں پیٹ بھر کر روٹی میسر آتی ہے اور نہ تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا، عوام کا معیار زندگی پست ہے اور اب تک یہ حکومتیں عوام کی معاشی فلاح و بہبود کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھا سکیں اور جو قوم معاشی اور اقتصادی لحاظ سے پست ہوتی ہے اس کا اپنی معاشرتی اصلاح کے لیے عوام کی ذہنی اور تعلیمی ترقی کی طرف توجہ دینا بظاہر تو ایک بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں بھی ایک مفلس مزدور یا کسان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلا سکے، اس کے ذرائع اتنے محدود ہوتے ہیں کہ خاندان کی روزمرہ ضروریات کا پورا ہونا ہی دشوار ہو جاتا ہے، بچوں کو مدرسہ کس طرح اور کیوں بھیجا جائے، دنیائے عرب میں مصر، لبنان، شام اور عراق ترقی یافتہ اور زیادہ متمدن سمجھے جاتے ہیں۔ مگر ان ملکوں میں بھی تعلیم اتنی گراں ہے کہ ایک قلیل المال اور کثیر الاولاد اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دلا سکتا۔ مثلاً عراق کے ثانوی مدارس کی سالانہ فیس ساٹھ روپے ہے۔ شام میں

نوے روپے اور مصر میں دو سو پینسٹھ روپے۔ مصر کی ان شرحوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عوام اس نظام تعلیم سے کوئی معتدبہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اگر ایک متوسط گھرانے کی ماہانہ آمدنی دو سو روپے ماہانہ ہو اور ہر گھر میں چار پڑھنے والے ہوں اور گھر میں کم سے کم چھ افراد ہوں تو بچوں کی تعلیم و تربیت نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتی ہے۔

اگر ان حالات کا ہم اپنے ملک کی معاشری اور تعلیمی زندگی سے موازنہ کریں تو ان میں کوئی ایسا نمایاں فرق نہیں۔ فیس کی شرح عام مدرسوں میں ہمارے یہاں بھی ساٹھ اور اسّی کے بین بین ہوتی ہے، اور عوام کی اقتصادی حالت بھی اتنی اچھی نہیں ہے کہ ایک متوسط طبقے کا انسان بآسانی ان تعلیمی اخراجات کو برداشت کر سکے۔ عراق، شام اور مصر میں طلبہ کی اس مالی پریشانی سے بچانے کے لیے ۲۵ سے ۴۰ فی صد تک فیس معاف کر دی جاتی ہے۔ عراق میں ۱۴ انتظامی واحدے ہیں۔ ہر واحدے کی تعلیم کا انتظام بھی اگرچہ علیحدہ علیحدہ ہے۔ لیکن یہ انتظام ایک مرکزی تعلیمی مجلس کے تابع ہے، اس لیے ثانوی مدارس کے نظام کار اور نصاب میں کوئی اختلاف نہیں۔ ہر صوبے میں ثانوی مدارس میں زیر تعلیم طلبہ کو ان کی ضروریات کے لیے ایک معقول رقم خرچ کی جاتی ہے، اس رقم سے ان بچوں کو کتابیں کاپیاں وغیرہ بھی مہیا کی جاتی ہیں اور ان کی رہائش کا بھی انتظام کیا جاتا ہے، لیکن اس سے صرف وہی طلبہ فائدہ اٹھاتے ہیں جو ابتدائی مدرسوں کے امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کر کے ثانوی مدرسوں میں داخل ہو جاتے ہیں، اس لیے بالعموم وہ طلبہ جو گاؤں میں رہتے ہیں یا جن کے والدین بدویانہ زندگی کے عادی ہیں وہ اس رعایت سے بھی قابل قدر فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ شام اور مصر میں بھی کچھ اس قسم کے انتظامات کیے جا رہے ہیں لیکن اس وقت تک حکومت ثانوی تعلیم کو مفت اور لازمی نہ بنا سکی۔ فلسطین، شرق اُردن، سعودی عرب اور دوسرے عرب علاقوں میں تو ثانوی تعلیم کا یہ ابتدائی انتظام بھی نہیں ہے، اس لیے طلبہ کی ایک معمولی سی تعداد ثانوی مدرسوں میں داخل ہو سکتی ہے۔ مثلاً شرق اردن میں ابتدائی مدارس کے بعد ایک سخت انتخاب کے بعد صرف چند غیر معمولی ذہین بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے، لبنان میں بھی ثانوی مدارس کا کوئی معقول انتظام نہیں، یہ ادارے یا تو نجی انجمنوں کے زیر اہتمام چل رہے ہیں، یا

بیرونی ممالک والے ان اداروں کے نظم ونسق کے ذمہ دار ہوتے ہیں، اس لیے جو بچہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہے اسے ثانوی مدارس کی چھلنی میں سے گذرنے کے لیے انہیں اداروں کا رخ کرنا پڑے، جہاں فیس کی شرح بھی زیادہ ہوتی ہے اور تعلیم میں یکسانی کا بھی فقدان ہوتا ہے، اس سے نہ تو بچوں میں قومی شعور پیدا ہوتا ہے اور نہ ان کی منزل ہی متعین ہوتی ہے، ان کی مثال ایک ایسے شتر بے مہار کی ہے جو کارواں سے علیحدہ ہو کر بلبلاتا ہوا بے ہنگم سی دوڑ لگاتا ہے۔

قومی نقصان

ان مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عرب ممالک میں نئی نسل کی بہر ایک قوم بنانے کی کوشش نہیں کی جا رہی، لبنان میں اگر تعلیم کا انتظام نجی اور بیرونی اداروں کے ہاتھ میں ہے تو اردن میں ایک مختصر سی تعداد کو ثانوی تعلیم کے حصول کی اجازت دی جاتی ہے، مصر اور عراق وشام میں بھی حالات کچھ اس قسم کے ہیں، لیکن ہر ملک میں تعلیم کی مانگ روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ حکومت اب تک عوام کو اس بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا نہیں کر سکی، عراق میں ثانوی مدارس میں طلبہ کی تعداد کو کم کرنے کے لیے ان طلبہ کو مدرسہ سے خارج کر دیا جاتا ہے جو ایک درجے میں دو سال ناکام ہوتے ہیں، یا ایسے طلبہ کو مدرسہ سے نکال دیا جاتا ہے جنھیں وظیفہ ملتا ہے مگر وہ تعلیمی ترقی کی دوڑ میں اپنے دوسرے ساتھیوں سے پیچھے رہ جاتے ہیں، حکومت نے اسے علاج سمجھا اور اس علاج کو ہر سرکاری ثانوی مدرسے میں کر آزمایا، لیکن یہ علاج کیمیا اثر ثابت نہ ہوا، جو بچے سرکاری مدرسوں سے نکال دیے جاتے ہیں وہ دوسرے نجی اداروں میں داخل ہو کر اپنی تعلیم کی تکمیل کی کوشش کرتے ہیں، اس میں بیشتر اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں، اس کا ایک بڑا اثر یہ بھی پڑا کہ عراق اور مصر میں نجی اداروں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہونے لگا، قوم وملت کی خدمت کے لیے نہیں، حصول زر اور مالی منفعت کے لیے۔ اگرچہ ہمارے ملک میں ثانوی مدارس میں داخل ہونے کے لیے کوئی ایسی شرط نہیں لڑکا ان اداروں میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کر سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود ہمارے موجودہ ثانوی مدارس ملک کی بڑھتی ہوئی تعلیمی ضروریات کے پیش نظر بہت کم ہیں، اس لیے بڑے بڑے شہروں میں غیر منظور شدہ تعلیمی اداروں کی کثرت ہے، یہ تعلیم گاہیں نہیں علم کی دکانیں ہیں، جہاں علم سکھایا نہیں جاتا

بیچا جاتا ہے، جہاں متعدد طلبہ کی تربیت نہیں بلکہ ان سے ایک معقول رقم لے کر انہیں تعلیم کے چند مبادیات سے روشناس کرانا ہوتا ہے اور اداروں کے قیام کا مقصد خالصتاً تجارتی ہے، پاکستان کے ہر بڑے شہر میں تعلیم کے یہ تجارتی اڈے ہر بڑی سڑک بلکہ گلی اور کوچوں میں بھی مل جائیں گے۔

اس قسم کے ادارے غیر شعوری طور پر بچوں کے ذہنوں کو مفلوج و معطل بنا دیتے ہیں، ان سب ان کی فکری اور ذہنی صلاحیتیں چھین لیتے ہیں، اس لیے آگے چل کر یہ لوگ قوم و ملک کی کوئی ایسی خدمت نہیں کر سکتے جو مجموعی حیثیت سے ان کے لیے بھی مفید ہو اور قوم کو بھی اس سے فائدہ پہونچے، اور قوم کے ایک بہت بڑے گروہ کا اس طرح مفاد پرست اور ذات پرست بن جانا ایک بہت بڑا قومی نقصان اور ایک بہت بڑا ملی خسارہ ہے، عرب ممالک میں حکومتیں ابتدائی اور ثانوی مدارس کی طرف بہت کم توجہ دیتی ہیں۔ ان کا میدان عمل بعض حالات میں صرف اعلیٰ تعلیم تک محدود رہتا ہے اور یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ صرف اعلیٰ تعلیم کسی قوم کی ترقی اور ان کی فلاح اور بہبود کی ضامن نہیں ہو سکتی، اس لیے ایک قومی شعور پیدا کرنے کے لیے عرب ممالک کے لیے سیاسی تنظیم کے ساتھ ساتھ تعلیمی منصوبہ بندی کی بھی ضرورت ہے، اگر اسی طرح اغماض برتا گیا تو کچھ عجب نہیں کہ ان کی تمام ترقی مسدود ہو کر رہ جائے۔ مصر و شام، عراق و لبنان اور فلسطین وادرون میں مغربی تہذیب و تمدن، مغربی معاشرت کا بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ اس لیے یہاں مغرب پرستی کی رو میں پرانے ادارہ ہائے فکر کو ڈھا کر نیا نقطہ نظر پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، یہ تجدد در اصل ایک فکری تبدیلی کی غمازی خود کرتا ہے، لیکن ابھی یہ صرف لباس اور آداب معاشرت کی نقالی سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

پیشہ ورانہ تعلیم

مغربی ممالک صنعتی لحاظ سے دنیا کے دوسرے خطوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ اس لیے ہر ملک اپنی صنعت و حرفت کو فروغ دینے کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کام کرتا ہے اور اپنے کارخانوں کو زیادہ سے زیادہ مفید اور سائنٹفک بنانے کے واسطے کوشاں رہتا ہے، اس مقصد کے حصول کے لیے ان ممالک میں فنی اور ٹکنیکل ادارے کھلتے ہیں جو صنعتی مرکزوں میں کام کرنے والے مزدور اور ماہر پیدا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے

برعکس عرب ممالک ابھی اس صنعتی دوڑ میں بہت پس ماندہ ہیں بعض علاقوں میں تو صرف معمولی معمولا
گھریلو دستکاریاں ہیں جو مقامی ضروریات کو بھی مشکل سے پورا کر سکتی ہیں اور پھر ان کی تیار کردہ
چیزیں نہ تو اتنی خوب صورت ہوتی ہیں اور نہ اتنی پائدار کہ مغربی مصنوعات کا مقابلہ کر سکیں۔ اس کے
علاوہ اگر کہیں کہیں اکا دکا صنعتی مراکز قائم ہو گئے ہیں تو قدیم نظریات کے مطابق وہاں صرف ان پڑھ
اور جاہل ہی مزدور اور مستری کی حیثیت سے کام کرتے ہیں اور اگر انھیں کسی فنی ہائی اسکول میں
تھوڑی بہت تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا تو یہ تعلیم یافتہ مزدوروں اور ماہروں سے کہیں کم تنخواہ پر
کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، جو لوگ مدرسوں میں رہ کر صنعتی تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ یقیناً
ان مزدوروں اور ماہروں سے بہتر نہیں ہوتے جو دن رات محنت کر کے اپنے جسمانی اور ذہنی قوی
کو استعمال کر کے کارخانے میں اپنے لیے ایک مقام پیدا کر لیتے ہیں۔

پہلی عالم گیر لڑائی نے عربوں میں انتشار اور لامرکزیت پیدا کی تو دوسری عالم گیر لڑائی میں ہر قوت تشتت
ثبت ہو گئی۔ زندہ قومیں زندگی کے ہر شعبے میں زندہ ہوتی ہیں اور جن پر خواب گراں طاری ہو جاتا ہے
وہ اس کشاکش حیات میں آگے بڑھنے سے قاصر رہتی ہیں، چناں چہ ۱۹۱۳ء اور زمانۂ مابعد جنگ
سے عربوں نے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی آداب و اطوار کو اپنا لیا، مغرب نے جن سیاسی اور
انتظامی روایات کی پرورش اپنے سیاسی مقبوضات میں کی اس کا ایک مقصد یہ بھی رہا ہے کہ ملک
میں ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جو انگریزوں کی استعماری چالوں اور سامراجی عزائم کو پورا کرتی
رہے، اس لیے ان سرکاری ملازموں کو ملک کی معاشرتی زندگی میں ایک وسیع مقام بخشنا بھی
انگریزوں کی ایک سیاسی چال تھی، اس سے انگریزوں کو اچھے خادم اور ملک کو برے حاکم مل گئے،
ان کی تعلیم و تربیت اس نہج پر کی جاتی تھی کہ یہ کبھی مغرب گریز نہ بن سکیں۔ ہمارے ملک میں بھی
مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہیں، لباس میں گفتگو میں، آداب معاشرت
غرض قدم قدم پر مغرب کی پیروی مستحسن اور ضروری سمجھی جاتی ہے، لیکن عرب ممالک اس تقلید بے جا
میں ہم سے بھی آگے ہیں حتیٰ کہ ان کی مستورات نے بھی مغربی خواتین کا عریاں لباس اختیار کر لیا ہے

چناں چہ یہ مغرب زدہ نئی جماعت ہر کام میں آقایان فرنگ کی پیروی کرتی ہے اور چوں کہ انھوں نے پیشہ ورانہ یا فنی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اس لیے آج بھی نہ اس کی ضرورت کو محسوس کیا جاتا ہے اور نہ عوام کے رجحانات ہی میں کوئی تغیر پیدا ہوا۔ ہر شخص سرکاری ملازمت کے حصول کے لیے ثانوی مدارس اور اعلیٰ تعلیم گاہوں کے تعلیمی نصاب ہی کو اپنی آخری منزل سمجھتا ہے، اس سلسلے میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ ماہرین تعلیم نے بھی فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی اصلاح کی طرف اب تک کوئی توجہ نہیں دی اگرچہ یہ درست ہے کہ کبھی کبھی بعض حلقوں سے اس کمی کی ضرورت کی صدا اٹھتی رہتی ہے۔

عراق میں فوجی خدمت لازمی ہے لیکن جو طلبہ ثانوی مدارس میں زیر تعلیم ہوتے ہیں انھیں اعلیٰ تعلیم کی تکمیل تک اس کلیے سے مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے۔ اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ مخصوص افسروں کی تربیت کے کورس میں شامل ہو جاتے ہیں، اس طرح وہ فوجی خدمات سے بھی بچ جاتے ہیں اور معاشرے میں اپنے لیے ایک اونچا مقام بھی حاصل کر لیتے ہیں، ان حالات میں آخر وہ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی طرف کیوں راغب ہوں، فلسطین شام اور دوسرے ملکوں کا بھی یہی حال ہے۔

مٹی کا تیل عرب ممالک کی سب سے بڑی صنعت ہے لیکن یہ صنعت بھی بیرونی تجارتی کمپنیوں کے قبضے میں ہے، اور مقامی حکومتیں محض حق شاہی پر اکتفا کر لیتی ہیں۔ سعودی عرب کویت اور عراق میں تیل کے چشمے ہیں لیکن ان چشموں سے تیل نکالنا بیرونی ماہروں کا ہی کام ہے۔ عرب ایک مزدور کی حیثیت سے کام کرتا ہے اور اپنے ملک کی دولت اپنے ہاتھوں سے دوسروں کو دے دیتا ہے، عربوں کی سماجی اور اقتصادی زندگی کا یہ ایک الم ناک پہلو ہے، چاہیے تو یہ تھا کہ ان فطری وسائل سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان میں خود ایک جذبۂ خود کاری پیدا ہوتا اور اس صنعت کو فروغ دینے میں وہ خود پیش پیش ہوتے، یہاں انجینیر، انتظام کار اور ماہرین عرب ہی ہوتے۔

فنی مدارس

فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی طرح زراعت اور تجارت میں بھی عربوں نے اب تک کوئی نمایاں ترقی نہیں کی، دمشق حلب بغداد اور دوسرے شہروں میں اگرچہ از منۂ قدیم سے یہ بہت بڑے تجارتی مراکز تصور کیے جاتے ہیں، اور آج بھی ان کی تجارتی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہے

اس کے باوجود ان شہروں میں تجارت کا چلن وہی پرانا ہے، حساب کتاب اور لین دین کے ایسے تجارتی
طریقے جدید اصول تجارت سے بالکل مختلف ہیں، لیکن اب رفتہ رفتہ بیروت اور قاہرہ ایسے تجارتی مرکز
بنتے جاتے ہیں، جو تجارتی دوڑ میں دوسروں کا مقابلہ کر سکتے ہیں، ان حالات کے پیش نظر کیا یہ ممکن تھا کہ
ان علاقوں میں تجارتی مدارس قائم کیے جاتے۔

زراعتی مدارس

دنیائے عرب کا شمالی علاقہ تمام تر ایک زرعی علاقہ ہے اور صدیوں سے اس خطہ میں
کاشت ہوتی چلی آرہی ہے۔ بلکہ قرون اولیٰ میں بعض زراعتی آلات اور طریق کاشت
کے موجد بھی عراق و شام والے ہی تھے مگر مسلمانوں کے عہد زوال میں جہاں دمشق و بغداد کی علمی، سیاسی
اور تعلیمی سیادت قائم نہ رہی تو اس قوم نے اپنی ذہنی اپج سے کام لینا ہی چھوڑ دیا اور زراعت کو اسی
پرانی ڈگر پر چلاتے رہے، لیکن پچھلے پچاس برس سے زراعت کو فروغ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے، مصر میں
زرعی اصلاحات نے تو کم و بیش ایک انقلابی صورت اختیار کر لی ہے، عراق میں بھی نہروں کی تعمیر اور
آب پاشی کے جدید انتظامات نے اسے بہتر بنا دیا ہے، لیکن ہر ملک میں بڑے بڑے زمینداروں کا وسیع
وعریض اراضی پر قابض ہونا ترقی کی راہ میں بہت بڑی اکاوٹ ہے، زمینداری کا نظام اگرچہ خالصتاً عجمی
ہے اور عربوں کی سادہ قبیلائی زندگی سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مگر اب یہی نظام صدیوں سے
ان کی سماجی زندگی کا ایک جزو بن گیا ہے، اس کے باوجود ہر ملک میں زراعتی مدرسے قائم ہو رہے
ہیں جہاں طلبہ کو جدید اصول زراعت کی تربیت دی جاتی ہے۔

جدید تجربے

بعض حساس اور اہل الرائے عرب فنی اور پیشہ ورانہ مدرسوں کے قیام پر بہت زیادہ
زور دے رہے ہیں، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جب یہ اپنے شہروں سے نکل کر
دوسروں کی بڑھتی ہوئی تجارت اور فروغ کو دیکھتے ہیں تو انھیں اپنی پس ماندگی کا احساس ہوتا ہے۔
اے کاش ہم بھی تجارت میں اتنے ہی اونچے ہوں اور ہمارے صنعتی ادارے بھی ایسے فن کار اور
ایسے ماہر پیدا کر سکتے جس سے ہماری معاشی اور اقتصادی بدحالی دور ہو جاتی، کیا یہ ممکن نہیں؟
ان جذبات سے سرشار ہو کر یہ لوگ ٹکنیکل اداروں کے قیام اور ان کی اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں

چناں چہ اس احساس کی بدولت کچھ دنوں سے عراق اور مصر میں ایسے ادارے قائم ہو رہے ہیں جو آگے چل کر یقیناً ملک کی ترقی کے ضامن بن جائیں گے بعض ملکوں نے ٹکنیکل مدارس کے اجرا اور قیام کا ایک مبسوط منصوبہ بھی بنالیا ہے لیکن ابھی تک ان منصوبوں پر عمل درآمد نہیں ہوا، کچھ تو مالی مشکلات کی وجہ سے کچھ سہل انگاری کی وجہ سے مگر جب ایک مرتبہ رہوار زندگی کی باگ کو اس طرف موڑ دیا گیا ہے تو اس کے منزل پہ پہونچ جانے کی بھی توقع کی جا سکتی ہے۔

مدرسوں میں امتحانات

دنیا کے مختلف ممالک کے موجودہ نظام تعلیم میں امتحانات کو ایک اہم درجہ حاصل ہے مغربی ممالک اگرچہ تعلیمی ترقی کی دوڑ میں بہت آگے جا چکے ہیں لیکن کے طالب علم کو ذہنی اور علمی صلاحیتوں کا اندازہ لگانے کے لیے کم و بیش ہر ملک میں مختلف مدارج کے امتحانات ہوتے رہتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ ان کی نوعیت زمانے کی رفتار کے ساتھ بدلتی رہے عرب ممالک میں بھی چوں کہ موجودہ نظام تعلیم مغرب ہی سے مستعار ہے اور ہر ایک ملک کی وزارت معارف اسے انھیں خطوط پر چلانے کی آرزومند بھی ہے، اس لیے ہر تعلیمی سال کے اختتام پر مدرسوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں امتحانات ہوتے ہیں اور انھیں امتحانات کے نتائج پر طلبہ کو آگے بڑھنے کی اجازت ملتی ہے۔ فلسطین میں صرف میٹری کولیشن کا امتحان ہوتا ہے، ابتدائی اور وسطانی جماعتوں میں امتحانات نہیں ہوتے، ہر مدرسے میں طلبہ کی تعلیمی ترقی کا ایک چارٹ ہوتا ہے، اس چارٹ کو سامنے رکھ کر طالب علم کو اگلے درجے میں ترقی دے دی جاتی ہے اور اگر طالب علم سال بھر کام کرنے سے عمداً گریز کرتا رہا تو اسے ترقی نہیں ملتی۔ اگلی جماعتوں میں ترقی دینے کا یہ اصول بہت ہی قدیم ہے۔ ہمارے پرانے مشرقی مدارس میں یہی طریق کار رائج تھا، اور آخر میں دستار فضیلت اس طالب کے سر پہ باندھی جاتی تھی جو علم کے مختلف شعبوں پر دست گاہ حاصل کر لیتا تھا۔

مصر شام اور عراق میں ابتدائی، وسطانی اور ثانوی تین امتحان ہوتے ہیں، دور جدید میں طلبہ کو معیار کے مطابق اگلی جماعت میں ترقی دینے کا یہی ایک ذریعہ ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ طلبہ کو خارج کرنے کا بھی یہ ایک موثر حربہ ہے، امتحانات میں طلبہ کی ایک بہت بڑی اکثریت ناکام یا ب

ہو جایا کرتی ہے اور جو طلبہ اس میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے انہیں اگلی جماعتوں میں پڑھنے کی اجازت
نہیں مل سکتی، اس لیے طلبہ اور اساتذہ دونوں امتحان سے بہت گھبراتے ہیں، طلبہ اس لیے کہ معلوم نہیں
انہیں اگلی جماعت میں ترقی ملے گی یا نہیں، اساتذہ اس لیے کہ انہیں خود اپنی تدریس اور اپنی محنت کے
نتائج کا اندیشہ رہتا ہے اور سال میں کم سے کم دو تین مہینے تک امید و بیم کی یہ کیفیت طاری رہتی ہے۔

امتحانات سال بھر طلبہ کے سر پر سوار رہتے ہیں اور مدرسوں میں مدرس اور محکمے کا مطمح نظر بچوں کو
متمدن، مہذب اور با اخلاق بنانا نہیں امتحان پاس کرانا ہوتا ہے، اگر امتحان میں لڑکے کامیاب ہو جاتے
ہیں تو پڑھانے والا ایک جید عالم اور اگر خدانخواستہ طلبہ ناکام رہ جاتے ہیں تو پڑھانے والا بڑا نالائق بلکہ
بہت بڑا جاہل شمار ہوتا ہے۔ اس لیے اساتذہ اور طلبہ دونوں ہر کام امتحانی نقطۂ نگاہ سے کرتے ہیں۔ اور
ہر سرکاری اور نجی ادارے میں امتحان ہی کو زندگی کا سب سے بڑا نصب العین سمجھ کر انہیں موضوعات کی
تدریس پر زور دیتے ہیں جو امتحانی نقطۂ نگاہ سے مفید ہوں، اس طرح تعلیم کا مقصد طلبہ کے ذہنوں کو متنوع
بنانا نہیں بلکہ امتحان کی بازی گری سکھانا ہوتا ہے، کوئی ادارہ یا کوئی مدرس اس راہ سے ہٹ کر نہ تو نئے
تجربے کر سکتا ہے اور نہ طلبہ کو اپنی ڈگر پر چلا سکتا ہے، اس کے سامنے نصاب کا ایک متعین راستہ اور امتحان
کی آخری منزل ہے جسے طے کرنا اس کا آخری فرض سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے نظام امتحان کی طرح مغرب ممالک میں بھی امتحان کی نوعیت کچھ اتنی مختلف نہیں، وہاں بھی
ممتحن پر اعتبار نہیں کیا جاتا، اس لیے طلبہ کے نام وغیرہ اس سے پوشیدہ ہی رہتے ہیں۔ مدرسوں کے اساتذہ
اور پرنسپل کو ان امتحانات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، محکمۂ تعلیم کے ارباب حل و عقد کو یہ خیال رہتا ہے
مبادا والدین یا ان کے دوست اپنے بچوں کو کسی دباؤ کی وجہ سے پاس کرالیں، اس سے جو سب سے بڑی
خرابی پیدا ہوتی ہے وہ اخلاقی پستی اور ذمہ داری کا عدم احساس، اس لیے ایک طبقہ تو نظام امتحان میں
اصلاح کی ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہا ہے۔ دوسرا طبقہ امتحانات کے حق میں ہے، ان کے خیال میں
امتحان کی بدولت مدارس کا معیار تعلیم اونچا ہو جاتا ہے، اور نجی مدرسوں اور تجارتی تعلیم گاہوں پر بالخصوص
اس کا ایک اچھا اثر پڑتا ہے، یا کم از کم اعلا والوں پر حکومت کی گرفت تو مضبوط رہتی ہے اس کے علاوہ نصاب تعلیم

اور امتحان کی یکسانی کی وجہ سے قومی اتحاد اور قومی یک جہتی کے بھی زیادہ مواقع حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ ہر مدرسے میں عربی زبان، مقامی تاریخ و جغرافیہ کی تدریس لازمی ہے، اس لیے ان کا امتحان بھی ایک ہی معیار سے ہونا چاہیے۔

امتحانات کا یہ نقطۂ نظر وقیع ہو سکتا ہے، لیکن اسے ناگزیر کہنا ترقی پسندی کا منہ چڑھانا ہے۔ تعلیمی ترقی امتحانات کے بغیر بھی ممکن ہے، اگر انسان کی زندگی کا عظیم ترین مقصد محض چند روایاتی باتوں کو پڑھ کر امتحان پاس کر لینا ہی ہے تو امتحانات فی الواقع نئی نسل کی بہت زیادہ خدمات انجام دے رہے ہیں، لیکن اگر انسانی زندگی اس سے زیادہ وقیع وارفع ہے تو عرب ممالک کو بھی اپنے موجودہ نظام پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ مدرسے کے ماحول سے نکل کر وہ دنیا جس میں طلبہ داخل ہوتے ہیں ان کی اپنی اس محدود دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے، اس میں حوادث کے تھپیڑے بھی ہوتے ہیں اور اختلافات کی تلاطم خیزی بھی، یہ سوچنا کہ ہر شخص خاموشی اور سلامت روی کے ساتھ موجوں کے اس طوفان سے پار اتر جائے گا ایک خیال عبث ہے، اس لیے مدرسوں میں تعلیم کا مقصد امتحان ہی نہیں بلکہ طلبا کو آنے والی دشواریوں کے مقابلے کے لیے تیار کرنا ہے، وہ مودب اور مہذب بھی ہوں، ان میں ہمدردی اور خلوص بھی ہو، اور قومی حمیت بھی، سماجی شعور بھی ہو اور ذہنی بلندی بھی اگر ایک طالب علم کی شخصیت میں ان خواص کا فقدان ہو تو یہ تعلیم نہیں سوداگری ہوئی ۔

...یہ میں مجرم بچوں کی عدالتیں

...الرؤف

...ﺖ ۱۹۰۸ء کے چلڈرن ایکٹ کی رو سے برطانیہ میں مجرم بچوں کی علیحدہ عدالتیں قائم ہوئیں۔ اس سے
وہاں کئی علاقوں میں ایسی عدالتیں موجود تھیں مگر ان کی حیثیت غیر سرکاری تھی۔

...وں کی عدالت میں صرف وہ مجرم پیش ہوتے ہیں جن کی عمر آٹھ سال سے زائد اور سترہ سال سے کم
ہے، ان عدالتوں کا محل وقوع، ان کی تشکیل اور کارروائی عام عدالتوں سے بہت مختلف ہوتی
...ڈرن اینڈ ینگ پرسنز ایکٹ ۱۹۳۳ء کے مطابق یہ قرار پایا کہ بچوں کی عدالت عام عدالت
عمارت سے علیحدہ ہو۔ اور اگر یہ صورت کسی طرح ممکن نہ ہو تو پھر بچوں کے مقدموں اور عام
...رموں کی سماعت کے اوقات مختلف ہوں، تاکہ کم سن مجرم، عام یا بالغ مجرموں سے حتی الوسع
...سکے۔ لندن اور کئی دوسرے بڑے شہروں میں تو بچوں کی عدالتوں کے لیے مخصوص عمارات تعمیر
ہیں۔ مگر کئی اضلاع میں اب بھی عام عدالتوں کی عمارتوں میں ہوتی ہیں۔

...رطانوی بچوں کی ایک عدالت کا خاکہ کچھ یوں ہے کہ کمرۂ عدالت میں داخل ہوتے ہی سامنے
...ے صاحبان بیٹھے نظر آتے ہیں۔ قانون کی رو سے ان مجسٹریٹوں کی تعداد تین سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔
...میں کم از کم ایک عورت ہونی چاہیے۔ مجسٹریٹوں کے لیے قانون کا فاضل ہونا بھی ضروری نہیں
[illegible] معاشرتی مشاغل کی
[illegible] کے مطابق ان کے لیے [illegible] معاملوں اور [illegible]
[illegible] لازمی ہے، بچوں کی عدالت کے مجسٹریٹ عموماً متعلقہ علاقے کے بارسوخ اور مخلص شہری
ہوتے ہیں، جو اپنے ذاتی مشاغل کے علاوہ معاشرے کے فلاحی اور اصلاحی کاموں میں عوام الناس
سے کہیں زیادہ دلچسپی لیتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنے کام کی تنخواہ نہیں ملتی۔ ان تینوں مجسٹریٹوں
میں سے ایک عدالت کا صدر ہوتا ہے جو درمیان میں بیٹھتا ہے اور باقی دو اس کے دائیں بائیں۔

کرسیٔ عدالت کی دائیں طرف محرر کی جگہ ہوتی ہے۔ محرر عدالت کا باتنخواہ عہدہ دار ہے، اور اس کے لیے قانون کا جاننا لازمی ہے۔ اسے گویا عدالت کا قانونی مشیر کہنا چاہیے۔ عدالت کی کرسی کی بائیں طرف نقیب بیٹھتا ہے۔ نقیب کی میز پر مقدس بائبل رکھی ہوتی ہے، جب گواہ گواہی دینے کے لیے مجسٹریٹوں کے روبرو کھڑے ہوتے ہیں تو نقیب ان سے بائبل پر صدق بیانی کے لیے حلف اٹھواتا ہے، اس کے علاوہ کمرۂ عدالت میں قانون کی رو کے مطابق نظم و نسق قائم رکھنا بھی نقیب کے فرائض میں سے ہے، مجسٹریٹوں کے عین سامنے مجرم بچوں کے کھڑے ہونے کی جگہ ہوتی ہے اور ان کے پیچھے ان کے والدین یا سرپرستوں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں پڑی ہوتی ہیں، ان کرسیوں کے پیچھے پروبیشن آفیسر دکل اتھارٹی کے افسران، پولیس کے آفیسر اور اخباری نمائندے بیٹھتے ہیں۔ عدالت کے دونوں پہلوؤں میں گواہوں طالب علموں تماشائیوں وغیرہ کے لیے نشستیں ہوتی ہیں۔

مجرم بچے کو نہایت انسانیت سے تحمل کے ساتھ عدالت کے کمرہ میں لایا جاتا ہے، وہ کمرے میں داخل ہونے ہی مجسٹریٹوں کے بالکل سامنے کھڑا ہو جاتا ہے، اس کے والدین یا سرپرست اس کے پیچھے اپنی مختص جگہوں پر بیٹھ جاتے ہیں، مقدمے کی کارروائی شروع ہوتی ہے، بچے کو اس پر عائد کردہ جرم پڑھ کر سنایا جاتا ہے، پھر اس سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا یہ صحیح ہے کہ تم نے فلاں فلاں دن فلاں فلاں خلاف قانون حرکت کی ہے، میں نے دیکھا کہ اکثر برطانوی بچے کسی حیل و حجت کے بغیر اقرار جرم کر لیتے تھے۔

عدالت میں حاضری سے پہلے مجرم بچے سے متعلق تمام ضروری تحقیقات، نہایت سائنسی طریقے سے مکمل کر لی جاتی ہیں، جو مختلف رپورٹوں کی شکل میں عدالت میں پہنچ جاتی ہیں، مثلاً والدین کی رپورٹ، سکول کی رپورٹ، پروبیشن آفیسر کی رپورٹ۔ ماہر نفسیات کی رپورٹ، ڈاکٹر کی طبی رپورٹ وغیرہ وغیرہ جن میں مختلف وقتوں میں بچے کی زندگی کے مختلف شعبوں پر اچھے خاصے سائنسی مشاہدے ہوتے ہیں جنہیں مختلف مشاہدوں نے اپنے مخصوص زاویہ ہائے نگاہ سے ترتیب دیا ہوتا ہے، ان رپورٹوں سے مقدمے کے زیر سماعت مجرم سے متعلق مکمل مواد مل جاتا ہے، سماعت کے دوران میں عدالت مسلسل

برطانیہ میں مجرم بچوں کی عدالتیں

ڈاکٹر عبدالرؤف

سنہ ۱۹۰۸ء کے چلڈرن ایکٹ کی رو سے برطانیہ میں مجرم بچوں کی علیحدہ عدالتیں قائم ہوئیں۔ اس سے پہلے بھی وہاں کئی علاقوں میں ایسی عدالتیں موجود تھیں مگر ان کی حیثیت غیر سرکاری تھی۔

بچوں کی عدالت میں صرف وہ مجرم پیش ہوتے ہیں جن کی عمر آٹھ سال سے زائد اور سترہ سال سے کم ہوتی ہے، ان عدالتوں کا محل وقوع، ان کی تشکیل اور کارروائی عام عدالتوں سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ چلڈرن اینڈ ینگ پرسنز ایکٹ سنہ ۱۹۳۳ء کے مطابق یہ قرار پایا کہ بچوں کی عدالت عام عدالت کی عمارت سے علیحدہ ہو۔ اور اگر یہ صورت کسی طرح ممکن نہ ہو تو پھر بچوں کے مقدموں اور عام عدالتی مقدموں کی سماعت کے اوقات مختلف ہوں، تاکہ کم سن مجرم، عام بالغ مجرموں سے حتی الوسع دور رہ سکے۔ لندن اور کئی دوسرے بڑے شہروں میں تو بچوں کی عدالتوں کے لیے مخصوص عمارات تعمیر ہو چکی ہیں۔ مگر کئی اضلاع میں اب بھی عام عدالتوں کی عمارتوں میں ہوتی ہیں۔

برطانوی بچوں کی ایک عدالت کا خاکہ کچھ یوں ہے کہ کمرۂ عدالت میں داخل ہوتے ہی سامنے مجسٹریٹ صاحبان بیٹھے نظر آتے ہیں، قانون کی رو سے ان مجسٹریٹوں کی تعداد تین سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اور ان میں کم از کم ایک عورت ہونی چاہیے۔ مجسٹریٹوں کے لیے قانون کا فاضل ہونا بھی ضروری نہیں مگر ہوم سیکرٹری کے سرکلر کے مطابق ان کے لیے بچوں کے عمومی معاملوں اور معاشرتی مشاغل کی سمجھ بوجھ لازمی ہے۔ بچوں کی عدالت کے مجسٹریٹ عموماً متعلقہ علاقے کے بارسوخ اور مخلص شہری ہوتے ہیں، جو اپنے ذاتی مشاغل کے علاوہ معاشرے کے فلاحی اور اصلاحی کاموں میں عوام الناس سے کہیں زیادہ دلچسپی لیتے رہتے ہیں، ان لوگوں کو اپنے کام کی تنخواہ نہیں ملتی۔ ان تینوں مجسٹریٹوں میں سے ایک عدالت کا صدر ہوتا ہے جو درمیان میں بیٹھتا ہے اور باقی دو اس کے دائیں بائیں۔

کرسی عدالت کی دائیں طرف محرر کی جگہ ہوتی ہے ۔ محرر عدالت کا باتنخواہ عہدہ دار ہے ، اور اس کے لیے قانون کا جاننا لازمی ہے ۔ اسے گویا عدالت کا قانونی مشیر کہنا چاہیے ۔ عدالت کی کرسی کی بائیں طرف نقیب بیٹھتا ہے ۔ نقیب کی میز پر مقدس بائبل رکھی ہوتی ہے ، جب گواہ گواہی دینے کے لیے مجسٹریٹوں کے روبرو کھڑے ہوتے ہیں تو نقیب ان سے بائبل پر صدق بیانی کے لیے حلف اٹھواتا ہے ، اس کے علاوہ کمرۂ عدالت میں قانونی کارروائی کے مطابق نظم و نسق قائم رکھنا بھی نقیب کے فرائض میں سے ہے ۔ مجسٹریٹوں کے عین سامنے مجرم بچوں کے کھڑے ہونے کی جگہ ہوتی ہے اور ان کے پیچھے ان کے والدین یا سرپرستوں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں پڑی ہوتی ہیں ، ان کرسیوں کے پیچھے پروبیشن آفیسر لوکل اتھارٹی کے افسران ، پولیس کے آفیسر اور اخباری نمائندے بیٹھتے ہیں ۔ عدالت کے دونوں پہلوؤں میں گواہوں ، طالب علموں ، تماشائیوں وغیرہ کے لیے نشستیں ہوتی ہیں ۔

مجرم بچے کو نہایت انسانیت سے تحمل کے ساتھ عدالت کے کمرہ میں لایا جاتا ہے ، وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجسٹریٹوں کے بالکل سامنے کھڑا ہو جاتا ہے ، اس کے والدین یا سرپرست اس کے پیچھے اپنی مختص جگہوں پر بیٹھ جاتے ہیں ، مقدمے کی کارروائی شروع ہوتی ہے ، بچے کو اس پر عائد کردہ جرم پڑھ کر سنایا جاتا ہے ، پھر اس سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا یہ صحیح ہے کہ تم نے فلاں فلاں دن فلاں فلاں خلاف قانون حرکت کی ہے ، میں نے دیکھا کہ اکثر برطانوی بچے کسی حیل و حجت کے برملا اقرارِ جرم کر لیتے تھے ۔

عدالت میں حاضری سے پہلے مجرم بچے سے متعلق تمام ضروری تحقیقات ، نہایت سائنسی طریقے سے مکمل کی جاتی ہیں ، جو مختلف رپورٹوں کی شکل میں عدالت میں پہنچ جاتی ہیں ، مثلاً والدین کی رپورٹ ، اسکول کی رپورٹ ، پروبیشن آفیسر کی رپورٹ ، ماہر نفسیات کی رپورٹ ، ڈاکٹر کی طبی رپورٹ وغیرہ وغیرہ ۔ ان رپورٹوں میں مختلف وقتوں میں بچے کی زندگی کے مختلف شعبوں پر اچھے خاصے سائنسی مشاہدے ہوتے ہیں جن میں مختلف مشاہدوں نے اپنے مخصوص زاویہ ہائے نگاہ سے ترتیب دیا ہوتا ہے ، ان رپورٹوں سے عدالت کو زیر سماعت مجرم سے متعلق مکمل مواد مل جاتا ہے ، سماعت کے دوران میں عدالت مسلسل

ان رپورٹوں کی روشنی میں بچے کے جرم کو سمجھنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے، جب بچے کے معاشرتی نفسیاتی اور جسمانی پہلو زیر بحث آتے ہیں تو ان رپورٹوں کے متعلقہ اندراجوں کا حوالہ دیا جاتا ہے اور اگر کسی پہلو سے متعلق مزید معلومات کی ضرورت محسوس ہو تو سماعت ملتوی کر کے مطلوبہ تفاصیل حاصل کر لی جاتی ہیں، ان تمام رپورٹوں کو جمع کر کے عدالت میں لانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مجسٹریٹ محض بچے کے جرم پر ہی توجہ مرکوز نہ رکھیں بلکہ ان تمام کوائف کا بھی گہرا جائزہ لیں جو جزئی یا کلی طور پر اسے سماج دشمن سمتوں میں چلانے کا سبب بنے ہوں، اپنی کارروائی کے اس مخصوص پہلو کی بنا پر بچوں کی عدالت عام عدالتوں سے ممتاز نظر آتی ہے، جب عدالت میں ان رپورٹوں کی چھان پھٹک ہوتی ہے تو عدالت کا کمرہ ایک اچھا خاصا معاشرتی تحقیقی ادارہ سا دکھائی دیتا ہے۔ برطانیہ میں اپنے اڑھائی سالہ قیام کے عرصہ میں مجھے بچوں کی متعدد عدالتوں میں مشاہدوں کے لیے جانے کا اکثر اتفاق ہوا، میں جس عدالت میں بھی جاتا تھا، مجھے سماعت کے سارے دوران میں خشک قانونی ماحول کی بجائے مفید معاشرت سائنسی ماحول کی حقائق طلب فضا غالب نظر آتی تھی، دوران سماعت میں مناسب موقعوں پر مجسٹریٹ بچے پر جرح بھی کرتے تھے، مگر یہ جرح نہایت متحمل اور مشفقانہ انداز میں ہوتی تھی۔

جرم ثابت ہو جائے تو عدالت کو دو قسم کے اختیارات حاصل ہیں :-

اول - اصلاحی۔

دوم - تعزیری

چھوٹی موٹی لغزشوں اور پہلی بار خفیف جرم کے ارتکاب پر عموماً معاملہ محض معمولی ضمانت پر ہی ختم کر دیا جاتا ہے، اگر مجسٹریٹ مناسب سمجھیں تو بچے کو نگرانی میں بھیج دیا جاتا ہے۔ نگرانی میں بھیجنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بچہ کسی معینہ عرصہ کے لیے لوکل اتھارٹی کے کسی موزوں رکن کی زیر نگرانی رہتا ہے۔ نگرانی کے اس سارے عرصہ میں بچے کے روزمرہ کردار کا باقاعدہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، زیادہ اہم مجرموں کو اپروڈ اسکولوں میں بھیج دیا جاتا ہے جو مجرم بچوں کی موزوں تربیت کا بہترین ادارہ ہیں۔

۱۹۳۳ء کے کرمنل جسٹس ایکٹ کے مطابق بچوں کی بیدزنی کے اختیارات سلب کر لیے گئے ہیں۔ اب عدالت کے تعزیری اختیارات صرف خفیف جرمانہ اور مناسب سزا تک ہی محدود کر دیے گئے ہیں۔ عدالت بچے کو دو پونڈ سے زائد جرمانہ نہیں کر سکتی، مجرم بچہ جرمانہ نہ ادا کر سکے تو اسے ریمانڈ ہوم کی تحویل میں دے دیا جاتا ہے جہاں اسے ایک ماہ سے زائد عرصہ تک رکھنا خلاف قانون ہے۔ اگر عدالت کو مجرم بچے سے زیادہ ہی خلاف معمول بداخلاقی سرزد ہونے کا خدشہ ہو تو اسے ریمانڈ سنٹر میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اور جہاں کوئی ریمانڈ سنٹر موجود نہ ہو وہاں اسے بچوں کی جیل ہی میں رکھا جاتا ہے۔ اگر دا قر ثبوت مل جائے کہ بچے کے جرم میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر والدین کا حصہ بھی ہے تو عدالت انہیں بھی جرمانہ کر سکتی ہے انہیں قانونی نگرانی کے دوران میں بچے کے اخراجات ادا کرنے کے لیے کہہ سکتی ہے۔

بچوں کی عدالت میں مجرم بچوں کے علاوہ ایسے بچے بھی پیش کیے جاتے ہیں جو لاوارث ہوں یا جو والدین کی بدسلوکی کا شکار ہو رہے ہوں۔ ایسے بچے جو والدین کے قابو سے نکل چکے ہوں یا بری صحبت کا شکار ہو چکے ہوں یا جن کے متعلق اخلاقی جرائم کے ارتکاب کا فوری اندیشہ ہو، چنانچہ اس ضمن میں کوچہ و بازاروں میں آوارہ پھرتی ہوئی کم سن لڑکیاں اکثر عدالت میں لائی جاتی ہیں، ایسے بچے عموماً پولیس۔ پروبیشن آفیسر یا بچے کے اپنے خاندان کے علاوہ کسی دوسرے فرد کی وساطت سے عدالت میں پیش ہوتے ہیں۔ مگر یوں بھی ہوتا ہے کہ تنگ آئے ہوئے والدین جب بچے کو اپنے اختیار سے باہر نکلتا ہوا پاتے ہیں تو وہ خود ہی بچوں کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا دیتے ہیں، اس قسم کے سرکش بچوں کو عدالت عموماً کچھ عرصہ کسی مناسب اور ذمہ دار فرد کے زیر تحویل کر دیتی ہے۔

مقدمے کی سماعت بے انتہا دلچسپ اور معلومات افزا ہوتی ہے سماعت کے دوران میں ان تمام عناصر پر روشنی پڑتی رہتی ہے جو بچوں کو جرائم پر مائل کرتے ہیں، اکثر مقدموں میں معاشرتی اور ماحولی عناصر کی اہمیت خوب واضح ہو جاتی ہے، میں نے دیکھا کہ مجرم بچوں کی زیادہ تعداد غریب گھرانوں سے آتی تھی، میں نے ہزاروں برطانوی مجرم بچوں کا مشاہدہ کیا، اکثر مجرم بچے افلاس زدہ اور کم تعلیم یافتہ گھرانوں سے آتے تھے، کئی مجرم بچوں کے والدین بھی کسی نہ کسی جرم کی پاداش میں قیدی رہ چکے

ہوتے تھے۔ ناقص گھریلو تربیت جو گل کھلاتی ہے، میں نے اس کا تماشہ برطانیہ میں بچوں کی عدالت میں اچھی طرح دیکھا۔ ناقص تربیت کے علاوہ جد وجہد للبقاء کی پیہم دقتوں سے تنگ آکر بھی بچہ جرائم کی رنگین دنیا میں تسکین ڈھونڈنے لگتا ہے، اس صنف کے مجرم اکثر چوری اور جنسی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں، معاشرتی عناصر کے علاوہ بچوں کی عدالت میں ماحول کی اہمیت بھی خوب نمایاں ہوتی ہے لندن کے مشرقی حصص میں بچوں کی عدالتیں مقابلتاً زیادہ مصروف رہتی ہیں، اس علاقے میں گندے اور تاریک مقام زیادہ ہیں، یہاں جرم کی شرح زیادہ ہونے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ناسازگار طبعی ماحول میں بداخلاقی کے لیے شدید تحریکی قوت موجود ہے، میں اپنے سارے مطالعہ کے دوران میں یہ محسوس کرتا رہا کہ برطانیہ میں بچوں کی عدالت میں جہاں قانون کے ترازو میں بگڑے بچوں کے کردار تلتے ہیں۔ برطانوی معاشرے کے ان تمام تاریک اور متعفن پہلوؤں پہ روشنی بھی پڑتی ہے، جو خلاف قانون کردار کا اہم سبب ہیں، اس اعتبار سے مجھے بچوں کی عدالت انصاف کا ادارہ ہونے کے علاوہ ایک بے انتہا مفید ملی ادارہ معلوم ہوتی تھی، جسے برطانیہ کی معاشرتی زندگی میں بجا طور پہ اس قدر اہم مقام دیا گیا ہے ۔

جغرافیہ کا پہلا سبق

نذیر احمد

مدرسے کا ایک اوسط طالب علم دنیا کے جغرافیہ کے متعلق جس قدر بے خبر ہوتا ہے۔ اس کا حال ہر اس شخص کو معلوم ہے جسے کبھی ان کی جغرافیائی معلومات جانچنے کا اتفاق ہوا ہو، اس بے خبری سے طرح طرح کے لطیفے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ راقم کو اس سلسلے میں ایک بہت مزیدار لطیفہ اب تک یاد ہے، دوسری عالمی جنگ جاری تھی اور برما جاپانیوں کے ہاتھ میں جا چکا تھا۔ انسپکٹر صاحب مدرسے کا سالانہ معائنہ کرنے آئے، نویں جماعت میں انہوں نے ایک طالب علم کو کہا کہ نقشے پر برما دکھاؤ۔ لڑکا ہندوستان کے نقشہ میں بڑی توجہ سے مختلف شہروں کے نام پڑھنے لگا تاکہ کہیں برما لکھا ہوا نظر آجائے، اس قسم کی جغرافیائی بے خبری کافی عام ہے اور یہ کسی خاص ملک کے طلبہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ طالب علم کسی وجہ سے ان اہم جغرافیائی تصورات کو اخذ نہیں کر سکتے جو تدریس جغرافیہ کی جان ہیں۔

جغرافیہ پڑھانے والے استاد کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ہر طالب علم دنیا کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہے، اس کے بعض حصوں کے متعلق اس کی واقفیت خاصی ہو سکتی ہے لیکن خواہ استاد لاکھ علمن کرے اور خواہ مدرسہ کا کتنا ہی وقت جغرافیہ کی نذر کیوں نہ کر دیا جائے پھر بھی مدرسہ چھوڑنے پر اکثر طلبہ کو دنیا کے بیشتر حصوں کے متعلق بہت تھوڑی ہی واقفیت ہوگی، اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے یہ امر اور بھی اہم ہو جاتا ہے کہ تدریس جغرافیہ میں زیادہ زور بنیادی جغرافیائی تصورات پر دیا جائے۔

نوآموز استادوں کے لیے اشارے | تربیتی درس گاہوں سے فارغ ہو کر مدرسوں میں

کام کا آغاز کرتے وقت جغرافیہ کے اکثر نوجوان معلموں کے دل میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ جغرافیہ کا پہلا سبق کس طرح دیا جائے جبکہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ یہ جماعت پہلے کیا کچھ جانتی ہے؛ اس کی سابقہ قابلیت کا اندازہ کس طرح لیا جائے؛ طلبہ جہاں تک پہلے پڑھ چکے ہیں اس سے آگے کس طرح چلایا جائے، ان اور اس طرح کے دوسرے سوالوں کا پیدا ہونا بالکل قدرتی ہے۔

جغرافیہ کا معاملہ ریاضی اور دوسرے مضامین سے الگ ہے، یہاں نفس مطالعہ ساری دنیا اور نظام کائنات ہے، اس مطالعہ کا آغاز کس نقطہ سے ہو؛ ان سوالوں کے بندھے ٹکے جواب دینا تو مشکل ہے، البتہ ایک نوجوان استاد کی رہنمائی کے لیے بعض اہم اشارے بتائے جا سکتے ہیں۔

(۱) جغرافیہ کے ہر طالب علم میں یہ استعداد پیدا ہو جانی چاہیے کہ وہ نقشہ کو پڑھ سکے، اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ وہ نقشہ دیکھ کر یہ بتا سکے کہ آیا یہ برصغیر پاک وہند کا نقشہ ہے، یا ایشیا کا یا افریقہ کا۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ دیدہ ریزی کر کے شہروں اور دریاؤں کے نام نقشے میں تلاش کر سکے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نقشے سے وہ تمام معلومات اخذ کر سکے جو ایک تربیت یافتہ نگاہ کو اس سے اخذ کرنی چاہییں، وہ نقشے کو دیکھ کر مختلف ملکوں اور مقامات کے طبعی حالات کا صحیح اندازہ کر سکے، اسے نقشہ کی مدد سے دنیا کے مختلف مقامات کے جغرافیائی ماحول کا ایک جیتا جاگتا تصور ہاتھ لگ سکے، یہ غرض حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ طالب علم نقشہ میں استعمال کی گئی علامتوں کو محض رنگ برنگی لکیریں اور عجیب و غریب نشانات خیال کرنے کی بجائے ان کا صحیح مفہوم سمجھنے لگے۔

نقشے کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ طالب علم اطراف کا سچا تصور حاصل کریں۔ انہیں یہ خوب معلوم ہو جائے کہ مشرق، مغرب، شمال اور جنوب سے کیا مراد ہے، راقم کو ایک متعلم استاد کا سبق یاد ہے جس نے ایک تصویر میں سورج کو شمال سے نکلتا دکھایا تھا۔ اطراف کا درست تصور حاصل کیے بغیر نقشہ سے جغرافیائی معلومات اخذ کرنا ناممکن ہے، اطراف کے متعلق یہ عام تصور کہ جوں جوں شمال کو بڑھیں سردی بڑھتی جاتی ہے، لیکن جوں جوں جنوب کو

جائیں گرمی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ موزوں استثنائی صورتوں کا حامل ہونا چاہیے، جون کے مہینے میں ہم لاہور سے پشاور تک شمال کو بڑھتے جائیں گرمی میں کوئی کمی محسوس نہ ہوگی۔ اس کے برعکس اگر ہم جنوب مغرب میں بڑھتے ہوئے کراچی چلے جائیں تو گرمی کی بجائے خوش گوار ٹھنڈک محسوس ہوگی جس کی وجہ سمندر کا معتدل اثر ہے۔

(۲) دوسرا بنیادی جغرافیائی تصور جو ہر طالب علم کو ہونا چاہیے وہ دنیا کے آب و ہوا کے لحاظ سے خطے ہیں، طالب علم کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہونی چاہیے کہ استوائی خطے، صحرائی خطے، بحیرۂ روم کے خطے اور دوسرے خطوں سے کیا مراد ہے، ان خطوں میں درجہ حرارت اور بارش کی کیا کیفیت ہے، وہاں کیسی نباتات ملتی ہے اور کیوں؟ انسان نے ان مختلف خطوں میں اپنی زندگی کو جغرافیائی حالات کے مطابق کیوں کر ڈھالا ہے، غرض طالب علم یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ جائے کہ انسان دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف طور پر زندگی بسر کرتا ہے اور اس اختلاف کی واضح وجوہ ہیں۔

(۳) تیسرا بنیادی جغرافیائی تصور دن رات کے چھوٹے بڑے ہونے اور موسموں کے متواتر ادل بدل کے اسباب کا اچھی طرح سمجھنا ہے، اس کے لیے نظام شمسی کے سارے کارخانے کو وضاحت کے ساتھ ذہن نشین کرنا ضروری ہے، اس کے ضمن میں سورج اور چاند گرہن اور جوار بھاٹا کے اسباب کی وضاحت بھی ہونی چاہیے، بلکہ استاد کو ایک قدم اور آگے بڑھ کر ستاروں کی حیرت انگیز دنیا کا کچھ حال بھی بتا دینا چاہیے، تاکہ جغرافیہ کے طالب علموں کو ستاروں کے بے تحاشا فاصلوں اور نظام کائنات کی اتھاہ وسعت کا کچھ احساس ہو جائے۔

پہلا سبق نوجوان استاد جب نئی جماعت کو پہلا سبق دیتا ہو قدرتی طور پر یہ چاہتا ہے کہ یہ سبق غیر معمولی تاثیر کا حامل ہو، اس کے لیے وہ عموماً رنگ برنگ تصویروں اور جدید ترین رنگین نقشوں پر بھروسہ کرتا ہے، سروے آف پاکستان نے پچھلے چند سالوں میں نہایت اعلیٰ درجے کے نقشے چھاپے ہیں، بعض استادوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ پہلی بار جماعت میں قدم رکھتے وقت وہ بغل میں ایسے نقشوں کا مجموعہ دبائے ہوں جو جماعت نے پہلے نہ دیکھے ہوں

ہم نقشوں کی افادیت کا ذکر پیچھے کر چکے ہیں۔ بے شک جغرافیہ کے ہر طالب علم کو نقشہ پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہونا چاہیے۔ لیکن اس کام کا آغاز پہلے سبق ہی سے نہ ہونا چاہیے، سروے آف پاکستان یا اس طرح کے دوسرے اچھے نقشوں کا استعمال اس وقت تک ملتوی رہنا چاہیے جب تک استاد اور جماعت ایک دوسرے سے اچھی طرح مانوس ہو جائیں۔

جغرافیہ کے صاحب فہم پرانے استادوں کے تجربے کا نچوڑ یہ ہے کہ پہلا سبق یا تو جغرافیائی ماحول کی ایک انتہا سے شروع ہونا چاہیے اور یا دوسری انتہا سے۔ یعنی پہلے دن یا تو استاد مقامی نواح کا ایک صاف ستھرا خاکہ تیار کرے اور فوری طور پر گردوپیش کے ماحول سے کام کا آغاز کرے اگر یہ نہیں تو پھر اسے یہ چاہیے کہ پہلا سبق نظام شمسی پر دے اور سورج سے ابتدا کر کے اس کے گرد گھومنے والے سیاروں کا حال بتائے۔

پہلی صورت میں مطالعہ کا آغاز مدرسے کے ارد گرد کے ماحول سے کیا جاتا ہے اور یہ مطالعہ باہر کی طرف پھیلتا ہوا پہلے پاکستان اور بعد میں دنیا کے مطالعہ پر ختم ہوتا ہے، دوسری صورت میں کام کی ابتدا کائنات کی لامحدود وسعت سے ہوتی ہے، اس کائناتی نظام میں پہلے دنیا کا مقام دیکھا جاتا ہے اور پھر اپنے ملک پاکستان کا۔

ان طریقوں میں سے بہتر کون سا ہے؟ مشہور تعلیمی اصولوں کی روشنی میں جو ٹریننگ کالج میں پڑھائے جاتے ہیں نوجوان استاد فوراً یہ کہے گا کہ معلوم سے نامعلوم کی طرف پیش قدمی کرنا زیادہ پسندیدہ ہے، اس لیے جغرافیہ کے مطالعہ کا آغاز مقامی جغرافیہ سے ہونا چاہیے، یہ دلیل اپنی جگہ درست ہے، لیکن اس ضمن میں دو باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں:-

(۱) مقامی جغرافیہ اور نظام شمسی کے درمیان کوئی منطقی یا نفسیاتی رشتہ نظر نہیں آتا۔

(۲) نظام شمسی کے متعلق استاد کو ایک نہ ایک دن پڑھانا ضرور ہوگا، اگر مطالعہ کا آغاز مقامی جغرافیہ سے کیا گیا ہے تو نظام شمسی کا حال لازمی طور پر سابقہ مطالعہ سے غیر متعلق دکھائی دے گا۔

ہم فرض کرتے ہیں کہ استاد کام کا آغاز مقامی جغرافیہ سے کرتا ہے۔ ہم یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ سبق پڑھانے والے چھوٹی جماعت کے کم عمر طلبہ ہیں ان کا فوری ماحول ظاہر ہے کہ خود مدرسہ ہے۔ بلکہ اس سے ایک قدم اور آگے جا کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا فوری ماحول وہ کمرہ ہے جس میں وہ بیٹھے ہیں لہذا کام کا آغاز کمرۂ جماعت ہی سے ہونا چاہیے۔ سب سے پہلے کمرہ جماعت کا خاکہ تیار ہونا چاہیے۔ ہر چند طالب علم کہیں کہ یہ کام پہلے کیا جا چکا ہے استاد کو یہ منصوبہ ترک نہ کرنا چاہیے۔ طالب علم جب کام کو ہاتھ ڈالیں گے تو انہیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ یہ کام کس قدر دلچسپ ہے اور نیا بھی۔

کمرے کا خاکہ تیار کرنے کے لیے استاد کو پہلے یہ یقین کر لینا چاہیے کہ ہر طالب علم کے پاس رولر اور باریک پنسل موجود ہے، اس کے ساتھ ہی ہر طالب علم کے پاس ایک کافی بڑا کاغذ کا تختہ بھی ہونا چاہیے، طالب علموں کو پہلے سے مطلع کر دینا چاہیے کہ یہ ضروری اشیا ساتھ لے کر آئیں، بہتر یہ ہے کہ چند زائد پنسلیں بھی موجود رہیں تاکہ ضرورت کے وقت کام آئیں۔

اس خاکے کے متعلق سب سے ضروری احتیاط یہ ہے کہ یہ ایک حقیقی نقشہ ہو، اس کی ہر علامت اور ہر لکیر کوئی فرضی برائے نام چیز نہ ہو بلکہ طلبہ کے لیے کسی حقیقی جغرافیائی عنصر کی نمائندگی کرے، اس سلسلہ میں پہلا کام شمال کی سمت کی تعیین ہے۔ قطب نما کی مدد سے کمرے کی شمالی دیوار تعیین کر لی جائے۔ "یہ شمالی دیوار ہے"، اس سے پرے شہر کا فلاں دروازہ ہے، اسی سمت میں اور آگے جہلم کا شہر آتا ہے، اس سے آگے آزاد کشمیر کا علاقہ اور اس سے بھی آگے غلام کشمیر کا نمبر۔ "یہ کمرے کی جنوبی دیوار ہے"، اس سمت میں آگے بڑھتے جائیں تو تو کی اور ریاست بہاولپور بن سے گذرتے ہوئے ہم بھارتی ریاست بیکانیر میں جا پہنچیں گے، اطراف کا یہ زندہ تصور بے حد اہم ہے، اس لیے کام کا آغاز اسی سے ہونا چاہیے۔

اب اگلا قدم کاغذ کے تختہ پر اطراف کا تعین کرنا ہوگا۔ اچھا تو اس تختہ کا شمال کون سا ہے ؟ ں کا اوپر کا کنارہ شمال ہے، اس پر لفظ شمال لکھ لو، اب شمال کی مدد سے تختے کے جنوبی، مشرقی

اور مغربی کنارے معلوم کرو اور ان پر اطراف کے نام لکھ دو۔

یہ ہو جائے تو اگلا کام پیمانہ کا مقرر کرنا ہے۔ زیادہ قابل عمل پیمانہ یہ ہے کہ ایک
انچ کو دو فٹ کے برابر فرض کر لیا جائے، یعنی تیار کردہ خاکے اور اصل کمرے میں ۱ : ۲۴ کی نسبت ہو
اب دو طالب علم لمبے فیتے کی مدد سے شمالی دیوار کی لمبائی ناپیں، دو اور طالب علم اس پیمائش
کی پڑتال کریں۔ پیمائش کی صحت کا یقین ہو جانے پر اصل لمبائی کو فرضی پیمانے میں تبدیل کیا جائے
اور تمام طالب علم اپنے اپنے کاغذ پر شمالی دیوار کی لکیر کھینچیں۔ اسی طرح مشرقی دیوار ناپی جائے
اور کاغذ کے تختوں پر مشرقی دیوار ایک لکیر سے ظاہر کر دی جائے اور بالآخر کمرے کو ایک مستطیل کی
شکل میں دکھا دیا جائے۔

اس کے بعد کمرے کے اندر کی اشیاء کو ظاہر کرنا ہوگا، کمروں میں ڈیسکوں کی چند قطاریں ہوں گی
تختہ سیاہ ہوگا۔ استاد کی میز کرسی ہوگی۔ ان تمام چیزوں کی لمبائی چوڑائی ناپ کر انہیں اپنے اپنے
مقامات پر ظاہر کر دیا جائے، ڈیسکوں کی قطاروں اور دوسری چیزوں کے درمیانی فاصلہ کے
متعلق پوری احتیاط برتی جائے۔

اس عملی کام کی تفصیلوں کو زیادہ کھول کر بیان کرنے سے عمداً احتراز کیا گیا ہے، ہر سمجھدار
استاد اچھی طرح جانتا ہے کہ اس سبق کو کامیابی کے ساتھ نباہنے اور اس سے پورا فائدہ اٹھانے
کے لیے کن کن باتوں کی طرف توجہ دینی چاہیے تاکہ طالب علم اس کام کو ایک دل چسپ مشغلہ
سمجھ کر اس میں پورے انہماک کے ساتھ لگ جائیں۔

جب کمرے کا خاکہ یوں تیار ہو جائے تو طلبہ کو یہ بات ذہن نشین کرا دینی چاہیے کہ اگر کمرے پر
چھت نہ ہو اور کوئی شخص ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اسے دور اوپر سے دیکھے تو یہ کمرہ اسے اسی
طرح نظر آئے گا۔ کمرے کا نقشہ گویا کمرے کی ایک تصویر ہے جو دور اوپر سے لی گئی ہو۔ اسی
بات کو سمجھانے کے لیے شہروں اور بستیوں کے وہ نقشے دکھائے جا سکتے ہیں، جو
ہوائی جہاز سے کھینچے گئے ہوں۔ اگر طالب علم خود اپنے شہر کا ہوائی منظر دیکھ سکیں تو

بہت خوب رہے۔ غرض طلبہ کو یہ بات خوب ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہر نقشہ فی الحقیقت مختلف مقامات، ملکوں اور براعظموں کا ہوائی منظر پیش کرتا ہے۔ جس طرح ہوائی جہاز سے لیے گئے شہروں کے مناظر میں مختلف چیزوں کو مختلف علامتوں سے ظاہر کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح جغرافیہ کے نقشوں میں دریاؤں، پہاڑوں، سڑکوں، ریلوں اور شہروں کو ظاہر کرنے کے لیے مخصوص علامتیں مقرر ہیں۔

مقامی نواح

کرہ جماعت کا نقشہ تیار ہو جانے کے بعد مقامی نواح کا نقشہ تیار ہونا چاہیے اس سلسلے میں تجربہ کار استادوں نے ایک انتباہ بہت ضروری سمجھا ہے، وہ یہ کہ مقامی نواح کا پہلا نقشہ ایک تخمینی خاکہ ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیمائش کے معاملہ میں یہاں کرہ جماعت کے نقشہ کی سی صحت کی پابندی نہ کرنی چاہیے، ایسا کرنے سے وقت بے حد خرچ ہوگا اور نتائج حوصلہ افزا نہ ہوں گے۔

مقامی نواح کا نقشہ تیار کرنے کی زیادہ قابل عمل صورت یہ ہے کہ موٹے کاغذ کا ایک تختہ لے لیا جائے جس کی لمبائی نو انچ اور چوڑائی آٹھ انچ ہو، اس تختے کے عین درمیان میں اپنے شہر قصبے یا گاؤں کا نشان لگا دیا جائے، اب نقشہ کا پیمانہ مقرر ہو جائے۔ فرض کیجیے کہ ایک انچ ایک میل کے برابر قرار دیا گیا ہے، اب یہ دیکھا جائے کہ ہمارے شہر کے ٹھیک شمال میں کاغذ کے کنارے کے قریب کون سا گاؤں، یا قصبہ یا شہر واقع ہے، یا اس جگہ سے کونسی سڑک، یا ریل یا نہر گذرتی ہے؟ یہاں اس آبادی یا نہر، ریل سڑک کو ظاہر کر دیا جائے۔ پھر دیکھا جائے کہ ٹھیک شمال میں واقع بستی اور ہمارے شہر کے درمیان بالکل سیدھا خط کھینچنے سے کون کون سے گاؤں یا بستیاں راستے میں پڑتی ہیں۔ ان سب کا نشان اپنے اپنے ٹھکانے پر ظاہر کر دیا جائے، اسی طور پر ٹھیک جنوب، مشرق اور مغرب کے کناروں پر واقع شہروں کے نشان لگا کر ان کے اور اپنے شہر کے درمیانی فاصلے میں اندراجات کر دیے جائیں۔

مختلف چیزوں کو ظاہر کرنے کے لیے مختلف رنگ اور علامتیں مقرر ہونی چاہییں۔ مثلاً

اور مغربی کنارے معلوم کرو اور ان پر اطراف کے نام لکھ دو۔

یہ ہو جائے تو اگلا کام پیمانہ کا مقرر کرنا ہے۔ زیادہ قابل عمل پیمانہ یہ ہے کہ ایک انچ کو دو فٹ کے برابر فرض کر لیا جائے، یعنی تیار کردہ خاکے اور اصل کمرے میں ۱ : ۲۴ کی نسبت ہو۔ اب دو طالب علم لمبے فیتے کی مدد سے شمالی دیوار کی لمبائی ماپیں، دو اور طالب علم اس پیمائش کی پڑتال کریں۔ پیمائش کی صحت کا یقین ہو جانے پر اصل لمبائی کو فرضی پیمانے میں تبدیل کیا جائے اور تمام طالب علم اپنے اپنے کاغذ پر شمالی دیوار کی لکیر کھینچیں۔ اسی طرح مشرقی دیوار ناپی جائے اور کاغذ کے تختہ پر مشرقی دیوار ایک لکیر سے ظاہر کر دی جائے اور بالآخر کمرے کو ایک مستطیل کی شکل میں دکھا دیا جائے۔

اس کے بعد کمرے کے اندر کی اشیاء کو ظاہر کرنا ہوگا، کمروں میں ڈیسکوں کی چند قطاریں ہوں گی تختہ سیاہ ہوگا۔ استاد کی میز کرسی ہو گی۔ ان تمام چیزوں کی لمبائی چوڑائی ماپ کر انہیں اپنے اپنے ٹھکانے پر ظاہر کر دیا جائے، ڈیسکوں کی قطاروں اور دوسری چیزوں کے درمیانی فاصلہ کے متعلق پوری احتیاط برتی جائے۔

اس عملی کام کی تفصیلوں کو زیادہ کھول کر بیان کرنے سے عمداً احتراز کیا گیا ہے، ہر سمجھدار استاد اچھی طرح جانتا ہے کہ اس سبق کو کامیابی کے ساتھ نبانے اور اس سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے کن کن باتوں کی طرف توجہ دینی چاہیے تاکہ طالب علم اس کام کو ایک دلچسپ مشغلہ سمجھ کر اس میں پورے انہماک کے ساتھ لگ جائیں۔

کمرے کا خاکہ یوں تیار ہو جائے تو طلبہ کو یہ بات ذہن نشین کرا دینی چاہیے کہ اگر کمرے پر چھت نہ ہو اور کوئی شخص ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اسے دور اوپر سے دیکھے تو یہ کمرہ اسے اس رنگ میں نظر آئے گا۔ کمرے کا نقشہ گویا کمرے کی ایک تصویر ہے جو دور اوپر سے لی گئی ہو، اس نکتہ کی مزید وضاحت کے لیے شہروں اور بستیوں کے وہ نقشے دکھائے جا سکتے ہیں، جو ہوائی جہاز میں بیٹھ کر لیے گئے ہوں۔ اگر طالب علم خود اپنے شہر کا ہوائی منظر دیکھ سکیں تو

بہت خوب رہے۔ غرض طلبہ کو یہ بات خوب ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہر نقشہ فی الحقیقت مختلف مقامات، ملکوں اور براعظموں کا ہوائی منظر پیش کرتا ہے۔ جس طرح ہوائی جہاز سے لیے گئے شہروں کے مناظر میں مختلف چیزوں کو مختلف علامتوں سے ظاہر کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح جغرافیہ کے نقشوں میں دریاؤں، پہاڑوں، سڑکوں، ریلوں اور شہروں کو ظاہر کرنے کے لیے مخصوص علامتیں مقرر ہیں۔

مقامی نواح کمرہ جماعت کا نقشہ تیار ہو جانے کے بعد مقامی نواح کا نقشہ تیار ہونا چاہیے اس سلسلے میں تجربہ کار استادوں نے ایک انتباہ بہت ضروری سمجھا ہے، وہ یہ کہ مقامی نواح کا پہلا نقشہ ایک تخمینی خاکہ ہونا چاہیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ پیمائش کے معاملہ میں یہاں کمرہ جماعت کے نقشہ کی سی صحت کی پابندی نہ کرنی چاہیے، ایسا کرنے سے وقت بے حد خرچ ہوگا اور نتائج حوصلہ افزا نہ ہوں گے۔

مقامی نواح کا نقشہ تیار کرنے کی زیادہ قابل عمل صورت یہ ہے کہ موٹے کاغذ کا ایک تختہ لے لیا جائے جس کی لمبائی تیرہ انچ اور چوڑائی آٹھ انچ ہو، اس تختے کے عین درمیان میں اپنے شہر قصبے یا گاؤں کا نشان لگا دیا جائے، اب نقشہ کا پیمانہ مقرر ہو جائے۔ فرض کیجیے کہ ایک انچ ایک میل کے برابر قرار دیا گیا ہے، اب یہ دیکھا جائے کہ ہمارے شہر کے ٹھیک شمال میں کاغذ کے کنارے کے قریب کون سا گاؤں، یا قصبہ یا شہر واقع ہے؟ یا اس جگہ سے کونسی سڑک، یا ریل یا نہر گذرتی ہے؟ یہاں اس آبادی یا نہر، ریل یا سڑک کو ظاہر کر دیا جائے۔ پھر دیکھا جائے کہ ٹھیک شمال میں واقع بستی اور ہمارے شہر کے درمیان بالکل سیدھا خط کھینچنے سے کون کون سے گاؤں یا بستیاں راستے میں پڑتی ہیں۔ ان سب کا نشان اپنے اپنے ٹھکانے پر ظاہر کر دیا جائے، اسی طور پر ٹھیک جنوب، مشرق اور مغرب کے کناروں پر واقع شہروں کے نشان لگا کر ان کے اور اپنے شہر کے درمیانی فاصلے میں اندراجات کر دیے جائیں۔

مختلف چیزوں کو ظاہر کرنے کے لیے مختلف رنگ اور علامتیں مقرر ہونی چاہییں۔ مثلاً

دریاؤں اور نہروں کو نیلی لکیروں سے دکھایا جائے، سڑکوں کو سرخ لکیروں سے اور ریلوں کو سیاہ لکیروں سے۔ اسی طور پر کاشت شدہ رقبوں، بنجر زمینوں، سیم زدہ رقبوں اور کارخانوں کو ظاہر کرنے کے لیے حسب سہولت علامتیں وضع کی جا سکتی ہیں۔

حرف آخر جغرافیہ پڑھانے والے نئے استاد کے لیے یہ پہلے دو چار اسباق کا تجربہ تھا۔ مضمون کے اول میں کہا گیا تھا کہ جغرافیہ پڑھانے میں زیادہ اہمیت بنیادی جغرافیائی تصورات کو حاصل ہے۔ ان میں نقشہ پڑھنے کی صلاحیت کو پہلا درجہ دیا گیا تھا۔ یہ صلاحیت بنے بنائے نقشے استعمال کرنے سے نہیں بلکہ خود نقشے تیار کرنے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے، جب تک طالب علم اپنے ہاتھوں سے ان چیزوں اور مقامات کے نقشے تیار نہیں کرتے جن کو وہ دن رات اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اس وقت تک اچھے سے اچھا نقشہ بھی ان کے لیے رنگین علامتوں کے گورکھ دھندے سے زیادہ وقعت نہیں رکھے گا۔

جب طالب علم کمرۂ جماعت اور مقامی نواح کے نقشے تیار کر لیں تو اس کے بعد سروے آف پاکستان یا دوسرے اداروں کے طبع کردہ معیاری نقشوں سے کام لینا فائدہ مند رہے گا اب طلبہ استاد سے مانوس بھی ہو چکے ہیں اور وہ نقشوں کی علامتوں کا اصل مقصد بھی سمجھ چکے ہیں، اب ان کے دلوں میں یہ خیال پیدا نہ ہوگا کہ ان عجیب و غریب رنگین لکیروں اور علامتوں کا کیا مطلب ہے جو نقشے میں دی گئی ہیں:

جاپان کا جدید نظام تعلیم

شیخ نذیر احمد

جاپانیوں کا امتیازی قومی نشان یہ ہے کہ غیر ملکی اثرات سے متاثر ہونے اور اس تہذیب کو اپنانے کی بے پناہ صلاحیتیں ان میں موجود ہیں۔ لیکن وہ ایسا کرنے سے پیشتر قومی زاویہ نگاہ سے ان پہلوؤں کی افادیت کا خوب جائزہ لے لیتے ہیں۔ کورانہ تقلید کو گناہ کبیرہ گردانتے ہیں۔ یہ خاصہ باقی ایشیائی قوموں کے مقابلے میں ان کا طرۂ امتیاز ہے، اور اسی میں ان کی قومی ترقی کا راز مضمر ہے۔ لہذا اس جاذبیت کو کورانہ تقلید کا نام دینا چنداں مناسب نہیں۔ انہوں نے جن اثرات کو بھی قبول کیا ہے ان پر تہ دید تک غور و خوض کیا ہے۔ بہ نظر عمیق ان کے محاسن اور معائب کی جانچ پڑتال کی ہے۔ ملی معیار پر پورا اترنے والے امور کو اپنانے میں فراخ دلی سے کام لیا ہے۔ ایسا کرنے سے انہوں نے اپنے آپ کو متحرک اور زندہ قوم ثابت کیا ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد جاپان ثقافتی اور سماجی زندگی میں مغربی جمہوری نظام سے دوچار ہوا۔ سیاسیات عالیہ سے لیکر حفظان صحت کے معمولی اصول اسی نظام سے اخذ کیے گئے۔ شاطران مغرب نے پوری کوشش کی کہ مشرق کے اس مرکزی نقطہ پر اپنے چنگل خوب جمائیں۔ لیکن اہل جاپان بھی بڑے نباض ہیں۔ وہ ہر قدم پوری صحت و احتیاط سے اٹھاتے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں ستائیس امریکی ارکان پر مشتمل ایک وفد جاپان پہنچا جس نے نظام تعلیم کا پورا پورا جائزہ لے کر اصلاح کار کے لیے تجاویز پیش کیں۔ نصاب تعلیم درسی کتب اور زبان کی اصلاح کے متعلق غور و پرداخت کیا۔ خوب گہرے مطالعہ کے بعد انہوں نے مغربی طرز و روش کی روشنی میں اپنی سفارشات شائع کیں۔ لیکن جاپانی ماہر

صرف ان تجاویز کو درخورِ اعتنا سمجھا جن کی افادیت کو جاپانی شہریوں کے لیے مسلّم پا اور جن کے نافذ کرنے میں قومی اور شخصی زندگی میں بنیادی تبدیلیوں کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

جاپانی نظامِ تعلیم پر مغرب کا رنگ مغربی تسلط سے بہت پہلے غالب تھا، صنعت وحرفت کے میدان میں جاپانیوں نے اہلِ مغرب سے بہت کچھ سیکھا۔ اسی طرح تعلیمی دنیا میں انہوں نے مغربی نظام سے خوب استفادہ کیا۔ شروع شروع میں جرمنی اور فرانس کے نمونے لبطور ماڈل استعمال کیے گئے۔ بر ورِ ایام جاپانی جمہور کی ضروریات کے سانچے میں انہیں ڈھال لیا گیا۔ موجودہ جاپانی نظامِ تعلیم کی جمہوری تشکل کی اغلب وجہ مغربی تسلط ہے، جوں ہی اسکولوں میں جمہوری نظام قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ جاپانی ماہرین اس پر عمل پیرا ہونے میں بڑے مستعد ثابت ہوئے۔ اگرچہ انہیں ابتدائی مراحل پر چند دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑا مثال کے طور پر یوشو کنڈا صدر معلم ناگویہ اسکول نے جنسی مساوات کے جمہوری اصول سے متاثر ہو کر حکم دیا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کا جسمانی معائنہ ایک ہی کمرہ میں ہو، اس کے اس حکم کے خلاف اس قدر زہر پھیلا کہ اس بے چارے کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔

جاپان کے نظامِ تعلیم میں جمہور کا اصول کبھی بھی مستعمل نہیں ہوئے تھے۔ ایامِ قدیم سے تعلیم کی بنیادیں ادنیٰ و اعلیٰ کی سماجی تفاوت قائم رکھی جا رہی تھی۔ یہی نظامِ تعلیم جاپانی معاشرہ میں طبقاتی تفریق کا ذمہ دار تھا۔ شاہی خاندان کو اس سماجی نظام میں صفِ اول میں شمار کیا جاتا تھا، درباروں میں غیر ملکی سفرا کے ساتھ علما اور فضلا بحیثیت معلم ان شہزادوں کی تعلیم و تدریس کے فرائض سر انجام دیتے تھے۔ سمرائی یا فوجی طبقہ دوسرے درجہ پر تھا۔ جسے شاہی خاندان کی خدمات کے صلہ میں تعلیمی مواقع سے مستفید ہونے کا حق حاصل تھا اگر [illegible]ات پیشہ لوگ تھے جنہیں سوائے ان پرائمری اسکولوں کے جو تین صدی میں

چہارم درجہ پر صناع ودست کار تھے۔ تجار اس نظام کی آخری کڑی شمار ہوتے تھے۔ ان کی اقتصادی حالت حالت قدرے بہتر تھی جس کے بل بوتے پر وہ ضروری علوم کے حصول میں دقت محسوس نہیں کرتے تھے۔

ابتدائی تعلیم نونہالوں کے دل ودماغ پر برسر اقتدار طبقہ کی منافقت کا سکہ بٹھا دیتی تھی۔ سکولوں میں شنتو مذہب کی تعلیم لازمی تھی، ابتدا میں اس مذہب کی بنیاد فطرت پرستی یا پاکیزہ قسم کی الہیت پر رکھی گئی لیکن بعد میں نہنگانِ میدانِ دغا نے اسے اپنے عسکری مقاصد کے پیشِ نظر اسے زہریلے پراپیگنڈے کے طور پر استعمال کیا اور دنیا کو یہ بتایا کہ اس اقدام سے ان کا مقصود ملک وقوم اور شہنشاہ کی خدمات سرانجام دینا ہے۔

طریقِ تدریس بھی کچھ ایسا ہی فرسودہ تھا جیسا کہ نظامِ تعلیم۔ سارے درس وتدریس کا مقصدِ واحد امتحان پاس کرنا تھا۔ طلبا کی ذہنی تربیت کا قطعاً خیال نہیں رکھا جاتا تھا، ڈاکٹر ایڈون اندرسیشلر نے اپنی کتاب موسومہ جاپان ماضی وحال میں قبل از جنگ کے فلسفہ تعلیم پر یوں روشنی ڈالی ہے "تعلیمی نظام گورنمنٹ کا ایک ہتھکنڈا تھا جس سے جمہور کو مطیع وفرماں بردار اور قابلِ اعتماد رعایا بنانا مقصود تھا اور انہیں جدید سیاسی تقاضوں سے ہم کنار ہونے کے لیے مفید مطلب شہری بنایا جاتا تھا۔

تمام تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز محکمہ تعلیم تھا جس کا افسر اعلیٰ حکومت کا ایک وزیر ہوتا تھا۔ حکومت کے چنگل کو مضبوط رکھنے کے لیے محکمہ تعلیم پر کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی، یہ محکمہ مختلف شعبوں پر مشتمل تھا مثلاً علمی وفنی، سماجی اور معاشرتی تعلیم کا شعبہ، درسی کتب کی تیاری کا شعبہ، مذہبی تربیت اور تدریسی اقدامات کا شعبہ وغیرہ وغیرہ۔ ہر شعبہ کی کارروائی پر حکومت کی عقابی نگاہ کارفرما تھی۔

جاپان کے اس نظامِ تعلیم کو جس پر مرکز کا پورا تسلط تھا عسکری مقاصد کے تحت مرتب کیا گیا تھا۔ اسی کی بدولت اہلِ جاپان کو اہلِ چین کے ساتھ نبرد آزما ہونا پڑا اور بعد میں دوسری عالمگیر جنگ میں شریک ہونے پر مجبور ہوئے، جاپانی بہادروں کو اس جنگ میں شریک ہوتے ہوئے

یقین کامل تھا کہ عالمی حکومت کے حصول میں تائید غیبی ان کے شامل حال ہے۔ لیکن جوں ہی امریکی فوجیں ساحل جاپان پر گامزن ہوئیں ان کا سب خواب پریشان ہو کر رہ گئے۔ شاہی مطلق العنانی کا خاتمہ ہو گیا اور باقاعدہ نظام تعلیم کا آغاز ہوا جس کی بنیادیں مسلمہ قوانین پر رکھی گئیں۔ پبلک اسکولوں میں شنتو مذہب یا دیگر مذاہب کی تعلیم ممنوع قرار دی گئی، مرد وزن کے لیے مساوی تعلیم مواقع مہیا کر کے غلط قسم کی تفاوت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ نو سالہ لازمی تعلیم کا اجراء ہوا اور ماضی کے گورکھ دھندا کو ختم کر کے ۶ ۔ ۳ ۔ ۳ ۔ ۴ سالہ نظام پر عمل درآمد ہوا۔ شہری اور قصباتی تعلیمی کمیٹی بذریعہ انتخاب معرض وجود میں آئے۔ محکمہ تعلیم بجائے حکومت کے ایک محکمہ کے بحیثیت ایک مشاورتی بورڈ کے قائم رکھا گیا۔ دقیانوسی طریق تعلیم کی بجائے جدید طریق تدریس کا آغاز ہوا۔ سمعی اور بصری اعانات کا موثر نفاذ ہوا۔

اساتذہ نے روائتی اور فرسودہ طریق تدریس کو جو شہنشاہی دور کا ایک حصہ پارینہ تھا خیر باد کہہ کر چین کا دم لیا، اس وقت جاپان کی تعلیمی ترقی اور اس کے اثرات کا جائزہ لینا مشکل ہے۔ کیوں کہ موجودہ ہفت سالہ تسلط کا دور جاپانی قوم کی ہزار ہا سالہ ثقافتی زندگی کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ اب پھر پرانے طور و اطوار کی جانب میلان کی علامات نمایاں ہیں۔ جدید افکار و نظریات جو مقامی ماحول کے لیے سازگار ثابت نہیں ہوئے ترک کیے جا رہے ہیں۔ اور روایات ماضی میں نئی روح پھونک کر ان کا احیاء کیا جا رہا ہے۔

ابھی ابھی محکمہ تعلیم نے ایک پنج سالہ منصوبہ تیار کیا ہے جو ایک طویل المدت پروگرام کا اولین قدم ہے۔ اس کا مقصد پورے نظام کو زمانہ ماضی کی بنیادوں پر از سر نو استوار کرنا ہے اس پروگرام پر جس کے مصارف کا تخمینا نو کروڑ ین (Yen) کا اندازہ کیا گیا ہے عمل پیرا ہونے سے تکنیکی اور صنعتی تعلیم کی توسیع کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اس نئی منصوبہ بندی میں تاریخ جغرافیہ اور اخلاقی تعلیم پر خاص زور دیا گیا ہے۔

اس وقت یا وثوق طریق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اہل جاپان اپنی تہذیب و ثقافت کے

تحفظ کے پیشِ نظر مغربی رجحانات کو تعلیمی پروگرام میں کیا جگہ دیں گے، ان کی کیا شکل ہوگی۔ کونسی راہیں اختیار کریں گے اور کونسی ایسی ہیں جنہیں ضرر رساں گردانتے ہوئے کالعدم قرار دیں گے آخری فیصلہ جاپانی شہریوں کے ہاتھ میں ہے۔

بادی النظر دکھائی یوں دیتا ہے کہ ان اساتذہ، طلبا اور والدین کو جو مغربی مفکرین کی رائج کردہ اصطلاحات سے روشناس ہوئے ہیں پورا یقین ہو چکا ہے کہ نظامِ جدید مطلق العنانی کے دور کی قید و بند سے بالکل آزاد ہے اور ان کے لیے اس آزادی اور شخصیت کی ارتقا کے امکانات کا علم بردار ہے جو مغربی جمہوری نظام کا ایک نمایاں وصف ہے۔

ترجمہ۔ کارل ایم گونرد

لڑکیوں کی تعلیم

زبیدہ بانو

اسلام نے عورت اور مرد دونوں کے لیے علم کا حاصل کرنا ایک سا ضروری قرار دیا ہے تعلیم کی یہ برابری صرف لکھنا پڑھنا سیکھنے تک محدود نہیں بلکہ جسمانی تربیت کے معاملے میں بھی اسلام نے لڑکے اور لڑکی کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا۔ چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے ""والدین پر یہ فرض ہے کہ اپنے بچوں کو لکھنا، تیرنا اور تیر چلانا سکھائیں،، اس حکم میں کتابی علم کے علاوہ علمی جسمانی تربیت کو بھی والدین کا فرض قرار دیا گیا ہے اور یہ تربیت لڑکے لڑکیوں کے لیے ایک سی ضروری بتائی گئی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد اس عظیم الشان اسلامی ملک میں لڑکیوں کی تعلیم نے جس رفتار سے ترقی کی ہے وہ بظاہر تسلی بخش ہے، لڑکیوں کے مدرسوں اور کالجوں میں بہت اضافہ ہوا ہے کم کم قصباتی آبادیوں میں ہر ماں اور باپ یہ چاہتا ہے کہ اس کی لڑکی زیادہ نہیں تو مڈل پاس ضرور کرلے۔ اکثر والدین اپنی لڑکیوں کو میٹرک تک تعلیم دلانا ضروری خیال کرتے ہیں۔ دیہات میں بھی لڑکیوں کی تعلیم کا چرچا دن بدن بڑھ رہا ہے۔ زنانہ تعلیم کی اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کے اسباب کیا ہیں؟ کیا ماں باپ اپنے اسلامی فریضہ سے سبکدوش ہونے کے لیے لڑکیوں کو تعلیم دلانا ضروری خیال کرتے ہیں؟ بے شک کئی والدین ایسے ہوں گے جو محض مذہبی احساس کے زیر اثر بچیوں کو مدرسوں میں بھیجتے ہیں۔ لیکن والدین کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو لڑکیوں کو اس لیے تعلیم دلاتے ہیں کہ اس طرح انہیں اچھا رشتہ تلاش کرنے میں مدد ملتی ہے۔

تعلیم نسواں کے مقاصد زنانہ تعلیم کے موجودہ چرچے کے اسباب کچھ بھی ہوں اس بات سے انکار مشکل ہے کہ اس تعلیم کو بعض بلند مقاصد پورے کرنے چاہییں

عورتیں کل آبادی کا نصف ہیں، اگر یہ آدھی آبادی شہریت کے صحت مند شعور سے عاری رہے۔ تو ملک کا سیاسی مستقبل روشن نہیں ہو سکتا۔ قومی ترقی کا سارا دارومدار شہریوں کی مناسب ذہنی اور جسمانی تربیت پر ہے۔ پس زمانہ تعلیم کی ساری توجہ اس بات پر صرف ہونی چاہیے کہ مستقبل کی مائیں ان تمام ذمہ داریوں کو خوبی کے ساتھ پورا کرنے کے قابل ہو جائیں جو ایک آزاد جمہوری زندگی میں ان پر عاید ہوں گی، یہ ذمہ داریاں کیا ہیں؟ اختصار کے ساتھ ان کو مندرجہ ذیل صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایک جدید ریاست میں ہر شہری کے لیے ضروری ہے کہ وہ لکھنا، پڑھنا اور معمولی حساب کتاب جانتا ہو اور تاریخ، جغرافیہ، شہریت اور سائنس کے بنیادی حقائق سے واقف ہو۔

(۲) ایک لڑکی کے لیے ضروری ہے کہ وہ خانہ داری کی بڑی بڑی ضرورتوں کو ہوش مندی کے ساتھ پورا کر سکے یعنی وہ خوراک، کپڑوں، گھر کی آرائش اور گھریلو اخراجات سے متعلق تمام امور کو خوبی کے ساتھ انجام دے سکے۔

(۳) ایک لڑکی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بچوں کی دیکھ بھال اور بچوں کی نفسیات سے اچھی طرح باخبر ہو۔

(۴) لڑکیوں کو ذاتی صحت۔ کنبے کی صحت اور عوامی صحت کے اصولوں سے باخبر ہونا چاہیے۔ کیوں کہ قومی صحت کا بڑا دارومدار عورتوں پر ہے۔

(۵) اسلام نے عورت اور مرد دونوں کو برابر درجہ دیا ہے، عورتوں کو شہریت کے وہی حقوق حاصل ہیں جو مردوں کو۔ ان حقوق سے فائدہ اٹھانا اور ان سے متعلقہ فرائض کو پورا کرنا عورتوں کے لیے بھی ایسا ہی ضروری ہے جیسا مردوں کے لیے۔

(۶) کسی قوم کے روحانی اور اخلاقی ترکہ کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے میں عورت مرد سے زیادہ اہم کردار کرتی ہے۔ بچہ گھر میں جن روحانی اور اخلاقی اقدار کی کارفرمائی دیکھتا ہے وہ انہی اقدار کو غیر شعوری طور پر جذب کر لیتا ہے اور یہ اقدار اس کے لیے اٹل قوانین کا درجہ

لڑکیوں کی تعلیم

زبیدہ بانو

اسلام نے عورت اور مرد دونوں کے لیے علم کا حاصل کرنا ایک سا ضروری قرار دیا ہے تعلیم کی یہ برابری صرف لکھنا پڑھنا سیکھنے تک محدود نہیں بلکہ جسمانی تربیت کے معاملے میں بھی اسلام نے لڑکے اور لڑکی کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا۔ چناں چہ ایک حدیث میں آیا ہے "والدین پہ یہ فرض ہے کہ اپنے بچوں کو لکھنا، تیرنا اور تیر چلانا سکھائیں" اس حکم میں کتابی علم کے علاوہ علمی جسمانی تربیت کو بھی والدین کا فرض قرار دیا گیا ہے اور یہ تربیت لڑکے لڑکیوں کے لیے ایک سی ضروری بتائی گئی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد اس عظیم الشان اسلامی ملک میں لڑکیوں کی تعلیم نے جس رفتار سے ترقی کی ہے وہ بظاہر تسلی بخش ہے۔ لڑکیوں کے مدرسوں اور کالجوں میں بہت اضافہ ہوا ہے کم سے کم قصباتی آبادیوں میں ہر ماں اور باپ یہ چاہتا ہے کہ اس کی لڑکی زیادہ نہیں تو مڈل پاس ضرور کرلے۔ اکثر والدین اپنی لڑکیوں کو میٹرک تک تعلیم دلانا ضروری خیال کرتے ہیں۔ دیہات میں بھی لڑکیوں کی تعلیم کا چرچا دن بدن بڑھ رہا ہے۔ زنانہ تعلیم کی اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کے اسباب کیا ہیں؟ کیا ماں باپ اپنے اسلامی فریضہ سے سبکدوش ہونے کے لیے لڑکیوں کو تعلیم دلانا ضروری خیال کرتے ہیں؟ بے شک کئی والدین ایسے ہوں گے جو محض مذہبی احساس کے زیر اثر بچیوں کو مدرسوں میں بھیجتے ہیں۔ لیکن والدین کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو لڑکیوں کو اس لیے تعلیم دلاتے ہیں کہ اس طرح انہیں اچھا رشتہ تلاش کرنے میں مدد ملتی ہے۔

تعلیم نسواں کے مقاصد

زنانہ تعلیم کے موجودہ چرچے کے اسباب کچھ بھی ہوں اس بات سے انکار مشکل ہے کہ اس تعلیم کو بعض بلند مقاصد پورے کرنے چاہییں

عورتیں کل آبادی کا نصف ہیں اگر یہ آدھی آبادی شہریت کے صحت مند شعور سے عاری رہے۔ تو ملک کا سیاسی مستقبل روشن نہیں ہو سکتا۔ قومی ترقی کا سارا دارومدار شہریوں کی مناسب ذہنی اور جسمانی تربیت پر ہے۔ پس زمانہ تعلیم کی ساری توجہ اس بات پر صرف ہونی چاہیے کہ مستقبل کی مائیں ان تمام ذمہ داریوں کو خوبی کے ساتھ پورا کرنے کے قابل ہو جائیں جو ایک آزاد جمہوری زندگی میں ان پر عائد ہوں گی۔ یہ ذمہ داریاں کیا ہیں؟ اختصار کے ساتھ ان کو مندرجہ ذیل صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایک جدید ریاست میں ہر شہری کے لیے ضروری ہے کہ وہ لکھنا، پڑھنا اور معمولی حساب کتاب جانتا ہو اور تاریخ، جغرافیہ، شہریت اور سائنس کے بنیادی حقائق سے واقف ہو۔

(۲) ایک لڑکی کے لیے ضروری ہے کہ وہ خانہ داری کی بڑی ذمہ داریوں کو خوبی کے ساتھ پورا کر سکے یعنی وہ خوراک، کپڑوں، گھریلو آرائش امور کو خوبی کے ساتھ انجام دے سکے۔

(۳) ایک لڑکی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش کی ضروریات سے اچھی طرح باخبر ہو۔

(۴) لڑکیوں کو ذاتی صحت، کنبے کی صحت اور عوامی صحت کے اصولوں سے باخبر ہونا چاہیے۔ کیونکہ قومی صحت کا بڑا دارومدار عورتوں پر ہے۔

(۵) اسلام نے عورت اور مرد دونوں کو برابر درجہ دیا ہے، عورتوں کو شہریت کے وہی حقوق حاصل ہیں جو مردوں کو۔ ان حقوق سے فائدہ اٹھانا اور ان سے متعلقہ فرائض کو پورا کرنا عورتوں کے لیے بھی ایسا ہی ضروری ہے جیسا مردوں کے لیے۔

(۶) کسی قوم کے روحانی اور اخلاقی ترکہ کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے میں عورت مرد سے زیادہ اہم کردار کرتی ہے۔ بچہ گھر میں جن روحانی اور اخلاقی اقدار کی کارفرمائی دیکھتا ہے وہ انہی اقدار کو غیر شعوری طور پر جذب کر لیتا ہے اور یہ اقدار اس کے لیے اٹل قوانین کا درجہ

حاصل کر لیتی ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ امر بے حد اہم ہے کہ تعلیم بچیوں کو قوم کا روحانی اور ثقافتی ترکہ پوری دیانت داری کے ساتھ منتقل کرے۔

(۷) کسی قوم کی عظمت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے افراد علم و ادب اور فنونِ لطیفہ سے لطف اندوز ہونا جانتے ہوں، اس لیے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والی عورتوں کو انسانی ذہن کی ان لطیف تخلیقوں سے باخبر ہونا چاہیے۔

(۸) بعض پیشوں مثلاً تیمارداری، ڈاکٹری، معلمی، کتب خانوں کی نظامت وغیرہ میں عورتوں کی مانگ دن بدن بڑھ رہی ہے۔ تعلیم کو چاہیے کہ موزوں عورتوں کو ان پیشوں کے قابل بنائے۔

اصل صورتِ حال

تعلیم نسواں کے جو آٹھ مقاصد اوپر بیان ہوئے ہیں ترقی یافتہ ملکوں میں عورتیں تعلیم سے یہ سارے فائدے حاصل کر رہی ہیں، لیکن پاکستان میں صورتِ حال کیا ہے؟ یہ درست ہے کہ اب عورتیں کئی اسامیوں کو پُر کیے نظر آنے لگی ہیں۔ مدرسوں اور کالجوں میں پڑھانے والی عورتوں کی کمی نہیں۔ گو یہ شکایت بہت عام ہے کہ ایک اوسط معلّمہ اپنے ہم مرتبہ معلم کے مقابلہ میں گھٹیا درجے کا کام کرتی ہے۔ تیمارداری (نرسنگ) کی تربیت لینے والی لڑکیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، اسی طرح عورتیں دوسرے علمی شعبوں میں بھی قدم آگے بڑھا رہی ہیں۔

یہ سب کچھ ہے لیکن کیا پاکستانی لڑکیاں گھر اور معاشرے کی ان ذمہ داریوں کو بھی بہتر طور پر انجام دے رہی ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے؟ کیا ہماری پڑھی لکھی لڑکیاں ایسی بیویاں ثابت ہو رہی ہیں جو گھر کنبے اور معاشرے کی صحت اور تندرستی کو بہتر بنائیں؟ کیا وہ کنبے کے اخراجات کو اس طور پر منضبط کرنا جانتی ہیں کہ ہر پارٹی سے زیادہ سے زیادہ تندرستی اور خوشی حاصل ہو؟ تعلیم انھیں ایسی روحانی اور اخلاقی اقدار کا حامل بناتی ہے جو اسلامی تہذیب و ثقافت کی ترقی و سربلندی کی ضامن ہوں؟ ان تمام سوالوں کے جواب عام طور پر نفی ہی میں ملیں گے۔ ایک میٹرک پاس لڑکی انگریزی کے چند غلط سلط جملے بولنے لگ جائے گی اور امتحان پاس کرنے کے

کچھ عرصہ بعد تک ریاضی اور سائنس کے چند کلمات اور تاریخ و جغرافیہ کی بعض معلومات بھی اس کے ذہن میں محفوظ رہیں گی۔ لیکن کیا یہ لسانی مہارت اور ذہنی بوجھ اسے ایک بہتر بیوی، ایک بہتر ماں اور ایک بہتر شہری بھی بنا دیتا ہے؟ اس کا جواب صریحاً نفی میں ہے۔ اکثر مائیں یہ شکایت کرتی سنی جائیں گی کہ لڑکی کو مدرسے میں کیا داخل کرایا اپنے لیے مصیبت مول لے لی۔ اب نہ وہ گھر کے کام کاج کو ہاتھ لگاتی ہے اور نہ چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتی ہے۔ اسی طرح کئی شوہر یہ شکایت کرتے سنائی دیں گے کہ پڑھی ہوئی بیوی سے شادی کر کے ہم مشکل میں پھنس گئے۔ تنخواہ ان کے سوٹوں اور سرخی پوڈر کی نذر ہو جاتی ہے اور ہم اپنے فرزندوں سے محروم رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

نصابِ تعلیم کی ذمہ داری

تعلیم بہت بڑی برکت ہے بشرطیکہ ... پر موقوف ہے۔ اگر ہم زمانہ تعلیم ... تو کیا کیفیت نظر آتی ہے؟ پرائمری جماعت میں بے شک نصاب تاریخ، جغرافیہ، سائنس، شہریت وغیرہ کے بنیادی حقائق و معلومات ہی پر مشتمل ہونا چاہیے۔ یہ وہ اوزار ہیں جن کی مدد سے پسندیدہ اقدار اور مفید مطلب واقفیت اور مہارتوں کا اکتساب کیا جائے گا۔ ہمارے زنانہ پرائمری مدرسے بے شک ان علمی اوزاروں کے عطا کرنے اور ان کے استعمال کی مہارت پیدا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ لیکن کئی حالتوں میں طالبات کی بے تحاشا بھیڑ اور استانی جی کا پھوہڑ پن اس بنیادی منزل کو بھی پوری طرح طے کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور کئی طالبات مدرسے میں ایک آدھ سال گزار کر ہی اسے ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیتی ہیں۔ خیر یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس پر مستقل بحث ہونی چاہیے۔

اب اگر ہم ثانوی مدرسہ کے نصاب پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ زنانہ تعلیم میں بڑے بڑے نقص کیا ہیں۔ مڈل جماعتوں میں لڑکیوں کو کم از کم تین زبانیں پڑھنی پڑتی ہیں۔ اردو پرائمری سے ذمی چلی آتی ہے۔ اس کے ساتھ انگریزی بطور ایک جدید غیر ملکی زبان کے طور پر پڑھنی پڑتی

اور عربی فارسی میں سے ایک زبان لینی پڑتی ہے۔ بطور قومی زبان کے اردو کا پڑھنا بے شک ناگزیر ہے لیکن دوسری دو زبانوں کا بوجھ بیک وقت طالبات پر ٹھونس دینا تعلیمی طور پر غیر موزوں ہے۔ ریاضی اور سائنس کا نصاب سراسر فطری اصولوں اور کلیات سے بھرپور ہے جن حساب کی ضرورت عام کاروباری زندگی یا گھریلو لین دین میں پڑتی ہے اس کی طرف بہت کم توجہ ہے۔ گھریلو زندگی میں داخل ہونے کے بعد عورت کو ریاضی کے کسی کلیے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ خالی جمع تفریق اور ضرب تقسیم بھی بہت زیادہ سودمند ثابت نہ ہوں گی۔ اسے صرف خاوند کی آمدنی کا حساب ہی رکھنا نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اس آمدنی سے کنبہ کی تندرستی اور خوشی کو زیادہ سے زیادہ کیوں کر بڑھایا جا سکتا ہے۔ کئی ہوئی آمدنی سے کیا کیا خریدا جائے کہ یہ مقصد پورا ہو؛ بالکل یہی حال سائنس کے کلیات کا ہے۔ گھریلو زندگی میں یہ نظری قانون نہیں بلکہ عملی کارفرمائی کام دے گی۔ عورت کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کس قسم کی غذا، کس قسم کا لباس اور کس قسم کی مکانیت صحت اور تندرستی کے لیے ضروری ہے۔ یہ غذا اور لباس کس طرح تیار ہونے چاہئیں۔ اور مکان کو صحت بخش رکھنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہییں۔

ہمارے زنانہ مدرسوں میں وسطانی اور ثانوی درجوں پر جو نصاب رائج ہے وہ اس عملی تعلیم کا کچھ اہتمام نہیں کرتا۔ نام کو خانہ داری کا مضمون موجود ہے لیکن لڑکیوں کو نہ مختلف اشیائے خوردنی کی غذائی قدر و قیمت کے متعلق کچھ بتایا جاتا ہے اور نہ یہ بتایا جاتا ہے کہ روزمرہ کی غذا میں کم از کم خرچ سے توازن کیوں کر پیدا کیا جا سکتا ہے اور عام باورچی خانہ کی سہولتوں سے فائدہ اٹھا کر خوراک کی غذائیت کو کس طرح بڑھایا جا سکتا ہے۔ سلائی اور دھلائی کا حال اس سے بھی بدتر ہے دھلائی مدرسے میں نہیں کرائی جاتی بلکہ یہ کام گھر سے کرنے کو دیا جاتا ہے۔ اکثر لڑکیاں دھوبی کے دھلے ہوئے کپڑوں کو مسل کر مدرسہ میں لے جاتی ہیں اور وہاں استری کر کے اپنی کارگزاری کی داد لیتی ہیں۔ یہی کیفیت سلائی اور بنائی کی ہے۔ لڑکیاں اپنی ماؤں بہنوں یا پڑوسنوں سے کپڑے سلا کر یا جرابیں اور سویٹر تیار کرا کر لے جاتی ہیں۔

ذاتی صحت۔ کنبے کی صحت اور بچے کی دیکھ بھال کے متعلق مدرسے کا نصاب تقریباً کچھ نہیں سکھاتا اور نہ ہی بننے والی ماؤں کو بچوں کی نفسیات کے متعلق ایک لفظ بتایا جاتا ہے۔ بچے کو موزوں اوقات پر دودھ پلانے۔ سلانے۔ نہلانے اور کپڑے پہنانے کی عملی تربیت کا ہرگز کوئی اہتمام نہیں۔ مدرسے میں نوکروں یا استانیوں کے بچوں کی دیکھ بھال کی جا سکتی ہے اور اس طرح لڑکیوں کو ایک بے حد مفید عملی تربیت دی جا سکتی ہے۔

غرض ہمارے زنانہ مدرسوں کا موجودہ نصاب بے حد علمی اور نظریاتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ زنانہ مدرسے ایسی عملی سرگرمیوں کے مرکز بن جائیں جو اسلامی اقدار اور جدید زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہوں۔ اس قسم کی عملی تربیت پر موجودہ تعلیم سے زیادہ خرچ نہیں آئے گا۔ اور اگر کچھ تھوڑا زیادہ خرچ بھی کرنا پڑے تو یہ خرچ سراسر حق بجانب ہوگا

تعلیم میں کنبے کا مقام

فضل الرحمٰن ناصر

عام والدین تعلیم کی ساری ذمہ داری مدرسہ ہی پر ڈال دیتے ہیں۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ خود ان پر مدرسے سے بھی زیادہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے، برطانیہ کا مشہور قانون تعلیم ۱۹۴۴ء اس بات کی ضمانت چاہتا ہے کہ ملک کے تمام بچوں کو ایک سی تعلیمی سہولتیں میسر ہوں، اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے برطانوی حکومت ان تمام بچوں کو وظیفے دیتی ہے جن کے والدین کی آمدنی ایک مقررہ حد سے کم ہو۔ لیکن حال ہی میں ایک مشہور برطانوی ماہر تعلیم نے کہا ہے کہ اس مالی مدد سے سب بچوں کو ایک سی تعلیمی سہولتیں نہیں مل جاتیں، اس نے بجا طور پر یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ اگر بفرض محال سب لڑکوں کے مالی ذرائع بالکل ایک سے ہو جائیں تو بھی جب تک ان سب کا گھریلو ماحول یکساں نہ ہو، اس وقت تک یہ کہنا خود فریبی ہے، کہ انہیں ایک سی تعلیمی سہولتیں حاصل ہیں۔ مثلاً ایک بچے کے والدین بڑے شستہ اور علم دوست ہیں وہ لکھنے پڑھنے کے معاملہ میں بچے کو ہر ممکن آسانی بہم پہونچاتے ہیں۔ مدرسہ کی طرف سے جو مشورہ یا ہدایت دی جائے وہ اس کا سرگرمی سے خیر مقدم کرتے ہیں، وہ استادوں کا ہاتھ بٹانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں، اس کے مقابلے میں ایک اور بچہ ہے، اس کے والدین کو تعلیم کے ساتھ کچھ لگاؤ نہیں وہ بچے کو محض اس لیے مدرسے میں بھیجتے ہیں کہ قانوناً ایسا کرنا لازمی ہے، وہ گھر پر بچے کو ایسے کاموں میں لگائے رکھتے ہیں جو تعلیم کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔ استادوں کی طرف سے اگر کبھی بلاوا آئے تو وہ مدرسے میں جانا وقت کا ضائع کرنا سمجھتے ہیں، انہیں مدرسے کی کوئی بات پسند نہیں آتی، وہ ہر وقت اسے برا بھلا کہتے رہتے ہیں، اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ان دونوں بچوں کے ماں باپ ایک سے مالدار ہیں تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں بچوں کو ایک سی تعلیمی سہولتیں حاصل ہیں؟

ظاہر ہے کہ تعلیمی سہولتوں کے معاملے میں پہلا بچہ دوسرے کی نسبت بہت زیادہ خوش نصیب ہے اس مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مالی حالت اگرچہ ایک اہم عنصر ہے لیکن اس کے علاوہ تعلیم کا انحصار بعض دوسرے اہم عناصر پر بھی ہے جن میں گھر اور کنبہ ایک فیصلہ کن عنصر ہے۔

والدین کی بے بسی

کوئی دو تین سال ہوئے لیڈز یونی ورسٹی کے وائس چانسلر سر چارلس مارسن نے یہ کہہ کر ایک تہلکہ مچا دیا تھا کہ والدین نے اپنے فرائض سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے، اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ پہلے جو فرائض ماں باپ۔ مذہبی علما اور ڈاکٹر انجام دیا کرتے تھے وہ اب زیادہ تر اساتذہ کی ذمہ داری قرار پا چکے ہیں، اور تمام بچوں کی تربیت کے معاملے میں والدین کی حیثیت ایک تماشائی کی سی رہ گئی ہے۔

مغرب میں یہ صورت حال ان دور رس اقتصادی اور سائنسی تہذیب کے جلو میں آئی ہیں۔ جدید تہذیب کا سارا نظام انسان یہ سمجھتا ہے کہ علم اور عمل کی ہر شاخ مخصوص ماہروں ہی کی خصوصی مہارت حاصل نہ کی ہو وہ کسی کام کو خوبی کے ساتھ انجام نہیں دے سکتا، بچوں کی صحت مند پرورش بھی ایک مشکل اور پیچیدہ کام ہے جو خصوصی علم کے بغیر پورا نہیں کیا جا سکتا، یہ کام وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جنہوں نے خصوصی تعلیم اور مہارت حاصل کی ہوتی ہے۔

یہ خیال ایک فلسفیانہ غلط فہمی کا نتیجہ ہے، وہ غلطی یہ ہے کہ بے شک بچوں کی فطرت کے متعلق حقائق کا معلوم کرنا نفسیات کے ماہروں کا کام ہے لیکن اس علم سے کام لینا صرف ان کی اجارہ داری نہیں، اس علم سے ہر ہوش مند باپ کام لے سکتا ہے نفسیاتی تجربے کرنا اور بچوں کی تربیت کے لیے موثر اور صحیح راستے تجویز کرنا بے شک ماہروں کا کام ہے، لیکن ان سائنسی معلومات سے فائدہ اٹھانے کے لیے کسی مخصوص مہارت کی ضرورت نہیں، پس یہ کہنا سراسر خود فریبی ہے کہ خصوصی مہارت کے جدید دور نے والدین کو بے بس کر دیا ہے، والدین آج بھی بالکل اسی طرح فیصلہ کن اثرات کے مالک ہیں جس طرح پہلے تھے، ہاں انہیں موثر ہونے کے لیے باخبر اور باشعور

ضرور ہونا چاہیے ۔

پہلے پانچ سال علمی تحقیق نے اب یہ بات ثابت کر دی ہے کہ افراد کے بہت سے خصائص جنہیں پہلے موروثی خیال کیا جاتا تھا وہ دراصل ماحول کی پیداوار ہیں ، بچہ اپنی زندگی کے پہلے چند سال جس ماحول میں گذارتا ہے وہ ماحول اس کے مزاج اور اس کی طبیعت پر ان مٹ اثر ڈالتا ہے ، یہ ماحول لامحالہ گھر کا ماحول ہے ، اس لحاظ سے گھر اور کنبے کو بچے کی تعلیم و تربیت میں کلیدی حیثیت حاصل ہے معلموں کو یہ نکتہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ پانچ سال کی عمر تک بچہ جو اثرات قبول کر لیتا ہے انہیں زائل کرنا ان کے بس کی بات نہیں ۔

اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ استاد کچھ نہیں کر سکتا ، ہر استاد اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے زیرتعلیم بچوں میں کتنی حیرت انگیز تبدیلیاں ہوئی ہیں تعلیم کی یہ تاثیر یونی ورسٹی کے درجہ تک جاری رہتی ہے کئی ممتاز عالموں نے اپنی اس اثر پذیری کا ذاتی تجربا بیان کیا ہے ، بعض لوگ یونیورسٹی تعلیم کی تاثیر کے زیادہ قائل نہیں ، لیکن سچ یہ ہے کہ یہ تعلیم بھی جس قدر اثر ڈال سکتی ہے بہت کم کنبے اتنے مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں ، ایک اوسط گھر ذہنی اور جمالیاتی تعلیم کا کچھ سامان نہیں کر سکتا ، اگرچہ جدید سائنس نے گھر کو ریڈیو اور ٹیلی وژن سے لیس کر دیا ہے ، پھر بھی وہ ذہنی اور جمالیاتی تعلیم کے معاملے میں یونی ورسٹی کا مقابلہ نہیں کر سکتا ، کیوں کہ یونی ورسٹی میں طلبہ کو ہم عمروں کے ساتھ بحث و تمحیص کے مواقع ملتے ہیں ، یہ مواقع گھر پر میسر نہیں آ سکتے کردار کی تشکیل اور "مرد مومن" کا صحیح تصور پیدا کرنے کے لیے بھی ایک اچھا رہائشی مدرسہ ایک اوسط گھر کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے ۔

وقتی چیز بچوں کو گھر پر پرورش کرنے کی بجائے انہیں ماہرین کی نگرانی کے حوالے کر دینا ایک وقتی شوق کے سوا کچھ نہیں ، بات اصل میں یہ ہے کہ پہلی عالمی جنگ کے بعد جو انقلاب آفرین نفسیاتی حقائق منظر عام پر آئے انہوں نے اکثر والدین کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا کہ ماں کی جذباتی محبت اور باپ کی تحکمانہ سخت گیری بچوں پر بہت برے اثرات ڈالتے ہیں ، اس لیے ان کی بہترین تربیت کے لیے ضروری ہے کہ انہیں گھر سے دور کسی ایسے ادارے

حوالے کر دیا جائے جو خصوصی ماہروں کے ہاتھ میں ہو، کوئی پندرہ بیس برس تک یہ طریق کار زوروں پر رہا پھر آہستہ آہستہ ردِ عمل شروع ہوا۔ آخر دوسری عالمی جنگ کے آخری سالوں میں اس معاملہ کی تحقیق کی گئی جس کے نتائج کرٹس رپورٹ کی شکل میں لوگوں کے سامنے آئے۔ اس رپورٹ نے کھلے لفظوں میں یہ فتویٰ دیا کہ برے سے برا گھر بھی اچھی سے اچھی تربیت گاہ سے بہتر ہے۔ اس رپورٹ نے لوگوں کو چونکا دیا، بہت سے والدین یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ وہ اولاد کی تربیت سے دست کش ہو کر کوئی اچھا کام نہیں کر رہے۔ وہ اگر نفسیاتی حقائق سے بے خبر ہیں تو بعض نام نہاد ماہرین بھی ان سے کم بے خبر نہیں، پس انہیں اولاد کی تربیت کی ذمہ داری دوسروں کو سونپنے کی بجائے خود سنبھالنی چاہیے، انہیں اپنے معتقدات اور خیالات کا دلیری سے اظہار کرنا چاہیے۔

ترقی پسند ملکوں میں آج والدین کی ذمہ داری پر زیادہ زور

خرچ کر کے یہ ذمہ داری دوسروں کے کندھوں پر نہیں ڈال

کا کام کبھی اس خوبی سے پورا نہیں کر سکتے جس طرح خود والد

پیش آئے وہاں انہیں ماہروں سے مشورہ طلب کرنا چاہیے، اس مطلب کے لیے عسبانی علاج گاہیں کھولی جا رہی ہیں، یہ وہ مرکز ہیں جہاں نفسیات کے ماہروں کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں، نفسیاتی علاج گاہیں والدین اور ماہرین کے درمیان تعاون کا نہایت اچھا ذریعہ ہیں، اس تعاون کو زیادہ سے ترقی ملنی چاہیے۔

بچوں کی صحیح تربیت میں والدین پر جو بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کے یہ طریق احسن پورا ہونے کی سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ والدین خوب باخبر اور روشن خیال ہوں، مستقبل کے والدین کو زمانہ طالب علمی ہی میں ان ذمہ داریوں سے آگاہ کر دینا چاہیے، تعلیم کا صرف یہی کام نہیں وہ ماہر سائنس دان، نقاد، عالم اور تکنالوجسٹ پیدا کرے، اسے اس بات کا یقین بھی کر لینا چاہیے کہ یہ لوگ اپنی مخصوص علمی اور فنی مہارت کے ساتھ ساتھ اچھے والدین بھی بن سکیں۔

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

مونٹی واڈیو میں یونیسکو جنرل کانفرنس کا اجلاس

یونیسکو کی جنرل کانفرنس کا آٹھواں اجلاس جو اُروگوئے کے صدر مقام مونٹی واڈیو میں منعقد ہوا تھا، اپنی چار ہفتے کی کارروائی کے بعد متعدد مثالی فیصلے کرنے کے بعد ختم ہو گیا، اس نے ادارے کی تاریخ میں سب سے زیادہ رقم کا بجٹ منظور کیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک ایسا نیا پروگرام پیش کیا جس میں دُنیا کے عہدِ جدید کے بنیادی مسائل کو حل کرنے پر زور دیا گیا۔

جنرل کانفرنس کا یہ پہلا اجلاس تھا جس میں بائیلو رشیا، یوکرین اور روس کے وفد شریک ہوئے انہی نئے ممبروں کے چندوں کی بناء پر کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ ۱۹۵۶-۵۷ء کا بجٹ بڑھا کر دو کروڑ ۱۴ لاکھ ۷۱ ہزار ڈالر کر دیا جائے گویا ۱۹۵۳-۵۴ء کے بجٹ پر جو ایک کروڑ ۸ لاکھ ۵۲ ہزار ڈالر کا تھا ۱۵ فی صدی کا اضافہ کیا گیا، اس اضافے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر ممبر ملک سے زیادہ چندہ لیا جائے، کانفرنس نے ریاستہائے متحدہ کا چندہ ۳۳ء۳۳ فی صد سے گھٹا کر ۳۰ فی صد کر دیا۔ کانفرنس نے چار ملکوں یعنی قوم پرست چین، چیکوسلواکیہ، ہنگری اور پولینڈ کو کانفرنس کے اجلاس میں رائے دینے کا حق دیا، حالانکہ ان ملکوں کے چندے وصول نہیں ہوئے ہیں۔

اُروگوئے کے وزیر تعلیمات و معاشری فلاح و بہبود ڈون جسٹینوز دالاموزر کی صدارت میں کانفرنس نے اور بہت سے انتظامی فیصلے کیے جن میں یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کی تنظیم نو بھی شامل ہے، اس بورڈ کے اراکین، جو کانفرنس کے اجلاسوں کے درمیان یونیسکو کی پالیسی مرتب کرتے ہیں، آئندہ اپنی حکومتوں کی نمائندگی کریں گے، اس سے قبل وہ ذاتی حیثیت سے شریک ہوتے تھے۔

کانفرنس نے ایگزیکٹو بورڈ کے حسب ذیل نئے ۲۲ اراکین منتخب کیے (۱) مصر کے ڈاکٹر محمد عواد

(۲) نیدرلینڈز کے ڈاکٹر وانز بنڈر (۳) برازیل کے پروفیسر پاؤلو دا برٹیڈا کارنیرو (۴)، اسپین کے ڈاکٹر جوان ای وانی آرتگر (۵) کیوبا کے ڈاکٹر اوریسٹس فرار سرنیو (۶) جاپان کے مسٹر ٹورو ہاگوئیوارا (۷) انڈونیشیا کے پروفیسر ارمن جوہانیز (۸) فرانس کے پروفیسر ہنری لوگیر (۹) تھائی لینڈ کے مسٹر ایم ایل پن مالاکل (۱۰) پاکستان کے ایم جبین ماروان (۱۱) ایکویڈور کے ڈاکٹر جوس آرمارٹینز کویدو (۱۲) لائبیریا کے پروفیسر نتھانیل ساتولی (۱۳) بھارت کے ڈاکٹر ارکٹ ایل مدالیار (۱۴) ڈنمارک کے پروفیسر جیکب نیلسن (۱۵) ایران کے ڈاکٹر جی اے راضی (۱۶) جمہوریت جرمنی کی ڈاکٹر ریاشلسٹر ہرکمس (۱۷) اروگوئے کے پروفیسر او۔ ایس ایلاوری (۱۸) پاکستان کے مسٹر ایس ایم شریف (۱۹) روس کے مسٹر اے وی سولو دوف تیکوف (۲۰) ریاست ہائے متحدہ کے ڈاکٹر اینجلسٹان اسپلہوس (۲۱) برطانیہ کے سرین بوران تھامس (۲۲) اٹلی کے ڈاکٹر وٹوریو ویرونیز۔

تین اہم اقدامات

یونیسکو کے پروگرام میں جو کانفرنس نے منظور کیا ہے۔ تین اہم رکھتی ہیں۔ پہلی تجویز جو فرانس، بھارت اور جاپان نے پیش کی تھی اس میں کہا گیا کہ اقوام متحدہ اور اس کے مخصوص اداروں کی زبانوں سے یونیسکو استعمال کرنے کا جائزہ لے اور ایٹمی طاقت کے خطرات اور عملی طور پر اس سے فائدہ اٹھانے کے ضمن میں صحیح قسم کی معلومات جمع کرے، اس کے علاوہ یونیسکو تحقیقات اور صنعت و حرفت کے کاموں میں ریڈیائی لہروں کے استعمال کی سہولتیں فراہم کرنے کے طریقوں کا جائزہ لینا۔

دوسری تجویز کے مطابق کانفرنس میں ادارے کے اس یقین محکم کو قلم بند کیا گیا کہ دنیا سے اضطراب اور بے چینی کی موجودہ فضا کو پرامن ذرائع سے دور کرنے کی صورت ممکن ہے اور اس لیے یونیسکو کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ادارے کے دستور العمل میں درج شدہ اغراض و مقاصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے پرامن تعاون کو فروغ دینے کے طریقوں پر اچھی طرح غور و خوض کرے، یہ تجویز بھارت چیکوسلواکیہ اور ریاستہائے متحدہ نے پیش کی تھی۔

تیسری تجویز میں اخبارات۔ ریڈیو یا فلموں کے ذریعے نشر و اشاعت پانے والے ایسے خیالات کی

مذمت کی جن سے امن کا اندیشہ لاحق ہو سکتا ہو، چنانچہ یونیسکو کے تمام ممبر ملکوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اظہار
خیالات کی آزادی کا یقین دلانے کے لیے مناسب اقدامات سے کام لیں اور ان رکاوٹوں کو دور کر دیں جن کے
باعث ممبر ملکوں کے مابین ترسیل اطلاعات آزادی کے ساتھ یا کانٹ چھانٹ کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی
یہ تجویز بھی اتفاق رائے سے منظور ہوئی جسے کنیڈا، کولمبیا، چیکوسلواکیہ، ایکویڈور، فرانس، بھارت، لبنان
میکسیکو، برطانیہ، ریاست ہائے متحدہ اور روس نے مشترکہ طور پر پیش کیا تھا۔

یونیسکو کے نئے پروگرام میں یہ اہم نکات ہیں، کیوں کہ یہ تعلیم سائنس اور ثقافت کے میدانِ عمل پر
اثر انداز ہوتے ہیں۔

۲

تعلیم

مدرسوں کے نظام کو ترقی دینے اور بہتر بنانے کے لیے سب سے زیادہ توجہ دینے کی کوشش
کی جائے گی، اس لحاظ سے جن ملکوں کو مالی دشواریوں کا سامنا ہو ان کی مدد کرنے کے لیے ایک
بین الاقوامی فنڈ کے قیام کا منصوبہ تیار کیا گیا ہے، اس فنڈ کا روپیہ زیادہ تر مدرسوں کی عمارتیں بنانے
اور سامان خریدنے میں صرف ہوگا، مفت اور لازمی تعلیم سے متعلق تیسری طبقاتی کانفرنس ۱۹۵۶ء کے
دوران میں جنوبی امریکہ میں منعقد ہوگی، بچوں کی نفسیات سے متعلق بین الاقوامی ادارہ اس سال
بنکوک کی کانفرنس میں قائم کیا گیا ہے، وہ ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء میں کام کرتا رہے گا، اس سال ایک
کانفرنس ہوگی جو عرب ملکوں کو فنی اور ہنرمندانہ تعلیم کے مسائل پر غور کرے گی۔

دیہاتی مدارس کے اساتذہ کی تربیت کو بہتر بنانے کی خاطر ایک اور تربیتی مدرسے کا اضافہ کیا جائے گا
یونیسکو کے زیر اہتمام ایسے کئی مدرسے اب بھی قائم ہیں، علاوہ ازیں دو کانفرنسیں ایک اس سال
مغربی یورپ میں اور دوسری اگلے سال ایشیا میں طلب کی جائیں گی جو کتب نصاب کو بہتر بنانے کے
طریقوں پر غور کریں گی تاکہ ان دو طبقات میں رہنے والے لوگوں کے درمیان اعلیٰ مفاہمت کی صورت
پیدا ہو جائے۔

علوم طبیعی | ایٹمی طاقت سے متعلق کانفرنس کی قرارداد کو مدنظر رکھتے ہوئے یونیسکو کے شعبہ علوم طبیعی کو

ایک معقول رقم دے دی گئی ہے تاکہ اس سال اگست میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام ایٹمی طاقت کے پرامن استعمال سے متعلق جو کانفرنس منعقد ہوگی اس کے انتظامات میں یونیسکو امداد دے سکے، یہ امداد مدرسوں میں طلبا کو ایٹمی طاقت کی حقیقت سمجھانے میں بھی مدد دے گا، اور اگلے سال ایک کانفرنس اس مقصد سے طلب کرے گا کہ عوام کو سائنسی باتیں سمجھائی جائیں۔

اس قسم کے بین الاقوامی سائنسی اداروں کو جو مالی امداد دی جاتی ہے اس کا سلسلہ جاری رہے گا اس ضمن میں علم ریاضی سے متعلق انٹرنیشنل کمیٹی کو مدد دی جائے گی تاکہ جنوب مشرقی ایشیا میں ریاضی کی تعلیم کے موضوع پر ایک کانفرنس بلائی جا سکے۔ یونیسکو کی طرف سے براہ راست اقدامات کے ضمن میں ایک خاص پروگرام بنایا گیا ہے جس کے مطابق سمندروں کے طبقات اور سمندروں میں رہنے والی مخلوق کے بارے میں مشترکہ طور پر تحقیقات کی جائے گی، بہت سے ممبر ملک... دی جائے گی، مثلاً کائناتی شعاعوں کی تحقیقات اور علم ہیئت میں بھیجے جائیں گے تاکہ وہاں ان موضوعات کی تعلیم دے سکیں۔

معاشرتی علوم

اس سال کے آخر میں ایک بین الاقوامی کانفرنس طلب کی جائے گی تاکہ پرامن تعاون سے متعلق قراردادوں کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ نیز ان بین الاقوامی انجمنوں سے جو اس قرارداد کے دائرے میں آتی ہوں کہا جائے گا کہ وہ اپنے اجلاس میں ایسے مسائل پر غور و خوض کریں، یونیسکو کی انتہائی کوشش ہوگی کہ عوام میں غیر ملکوں کی معلومات بڑھانے کے طریقوں کو فروغ دے اور ان ملکوں کا حال اخبارات میں شائع ہو۔

یونیسکو نسلی تعصبات کو دور کرنے اقلیتوں کی حفاظت کرنے اور مہاجرین کی سالمیت برقرار رکھنے کے ضمن میں اپنے اقدامات کا سلسلہ جاری رکھے گا، وہ ان معاشرتی تاثرات کا بھی عمیق مطالعہ کرتا رہے گا جو فنی تبدیلیوں سے رونما ہوتے ہیں، علاوہ ازیں جنوبی ایشیا میں فروغ صنعت سے متعلق معاشرتی مسائل کی جانچ پڑتال کے لیے ایک بین الاقوامی مرکز قائم کیا جائے گا، دیہات سدھار سے متعلق معاشرتی

اثرات کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔

ثقافتی کارگذاریاں

ممبر ملکوں کو براہ راست امداد دینے کو خاص اہمیت دی جائے گی اور ان کے ہاں بہت سے وفد بھیجے جائیں گے تاکہ وہ کتب خانوں اور عجائب گھروں کی تنظیم، ثقافتی نوادر کی حفاظت اور فنون کے ذریعے تعلیم دینے کے رواج میں تعاون کرسکیں۔ علاوہ ازیں یونیسکو نئے پڑھنے والوں کے لیے درسی سامان کی فراہمی میں حصہ لے گا، اور تعلیمی اور ثقافتی نقطہ نظر سے عمدہ کتابیں چھپوائے گا جو بین الاقوامی مفاہمت کی ترقی میں مدد و معاون ہو۔ بین الاقوامی مفاہمت کا یہ جذبہ اس کی دوسری کارگذاریوں میں بھی اپنا نقش جمائے گا، مثلاً نوع انسان کی سائنسی اور ثقافتی تاریخ اور جنوب مشرقی ایشیا کی روایتی تہذیبوں کا جائزہ مرتب کرائے گا۔

ادارہ پیشہ ور فن کاروں اور ادیبوں اور ماہرین فلسفہ سے ربط و تعاون جاری رکھے گا۔ لیکن یہ واضح رہے کہ کانفرنس نے اس امر پر زور دیا ہے کہ ممبر ملکوں میں قومی یا فیتاتی اعتبار سے خدمات انجام دی جائیں اور اس طرح ثقافتی امداد کی جو صورت پیدا ہو وہ اقتصادی ترقی کے ضمن میں اقوام متحدہ کی فنی امداد کا جز ثابت ہو جس میں حصہ لینا یونیسکو کے فرائض میں شامل ہے۔

فنی امداد

کانفرنس میں فنی امداد سے متعلق جو رپورٹ پیش ہوئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یونیسکو نے ایک سو چالیس ماہرین کی خدمات حاصل کیں اور اب وہ ۴۷ ملکوں میں کام کر رہے ہیں، اس سال یونیسکو ان چھے اہم کاموں میں فنی امداد کا سلسلہ جاری رکھے گا ۱۹ ملکوں کے سرکاری مدرسوں میں تعلیمی فروغ ۱۰ ملکوں میں بنیادی تعلیم اور ۸ ملکوں میں فنی تعلیم کا رواج۔ سائنسی معلومات جمع کرنے کے مرکزوں کا قیام (اس سال کے آخر تک ایسے پانچ مرکز میکسیکو، مصر، بھارت، یوگوسلاویہ اور یوروگوئے میں کھل جائیں گے) سائنسی تحقیقات کا سلسلہ خصوصاً جامعات۔ اسرائیل، ترکی، مصر اور پاکستان میں اور ۱۷ ملکوں میں یونیورسٹی کے معیار تک سائنس کی تعلیم پر توجہ دی جائے گی۔

اجتماعی تفہیمات

جنرل کان فرنس نے اجتماعی تفہیمات کے ضمن میں دو بڑے اصول بیان کیے ہیں، پہلا اصول جو اطلاعات عامہ سے تعلق رکھتا ہے، یہ ہے کہ اقوام متحدہ اور اس کے مخصوص اداروں کی کارگذاریوں کی نشر و اشاعت کی جائے، بین الاقوامی مفاہمت کو ترقی دی جائے اور بعض بنیادی نظریوں مثلاً انسانی حقوق کے عالمی تشہیر اور نسلی تعصبات کے خلاف جدوجہد کو فروغ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ آزادیٔ اطلاعات کے نفاذ پر زور دیا جائے اور اطلاعات کے طریقوں کو ترقی دینے میں ممبر ملکوں کی مدد کی جائے۔

علاوہ ازیں کان فرنس نے ادارہ کے ملازمین سے متعلق بعض اہم فیصلے کیے ہیں اور ڈائرکٹر جنرل کی درخواست پر عملے کے قواعد و ضوابط میں تبدیلیاں کی ہیں، ان کی رو سے ڈائرکٹر جنرل کو اختیار ہوگا کہ وہ عملے کے کسی رکن کو برخاست کردیں لیکن برخاست کرنے سے پہلے [illegible]

کرلیا کریں گے، اس بورڈ کے صدر کی نامزدگی عالمی عدالت

اراکین کے ناموں کا فیصلہ یونیسکو کے عملے کی انجمن سے مشورہ کر [illegible]

یونیسکو میں جمہوریت چین کے داخلے کے سوال پر غور و خوض کرنے کی کارروائی کو کان فرنس نے ملتوی کردیا ہے اور قوم پرست چین کے وفد کی رکنیت تسلیم کرتا ہے۔ یونیسکو میں رومانیہ اور بلغاریہ کے داخلے کا سوال بھی ملتوی ہوگیا ہے۔

فیصلہ کیا گیا ہے کہ ادارے کے اگیزیکٹو بورڈ کی کارروائی روسی اور ہسپانوی زبانوں میں بھی ہوا کرے گی۔ نیز طے پایا ہے کہ ۱۹۵۶ء میں جنرل کان فرنس کا نواں اجلاس دہلی میں منعقد ہوگا۔

پست اخلاقی معیار

برطانوی ہوم سیکرٹری سر ڈیوڈ میکسن ویل فائف نے اپنی ایک حالیہ تقریر میں کہا کہ [illegible]
پیش ہونے والے مجرموں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ زمانہ قبل از جنگ کے [illegible]
کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ عدالتوں میں مجرم ثابت ہونے والے لوگوں کی تعداد [illegible]
[illegible]

بڑھ چکی تھی لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد یہ اضافہ رکا نہیں ۵۲-۱۹۵۱ء میں زمانہ قبل از جنگ کے مقابلہ میں یہ اضافہ ستر فی صد کو پہونچ چکا تھا۔ جرمنوں کا یہ اضافہ ہر عمر کے مردوں اور عورتوں میں ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ جرموں کا یہ اضافہ اب انتہائی بلندی کو چھو چکا ہے کیوں کہ ۱۹۵۳ء کے اعداد و شمار اس میں تھوڑی سی کمی ظاہر کرتے ہیں، بچوں اور کم عمر لوگوں کے جرموں کی شرح میں پچھلے سال کی نسبت چودہ فی صد کمی ہو گئی ہے، اس کے باوجود آج حالت یہ ہے کہ ۱۸۹۵ء کے مقابلہ میں تین گنا لوگوں کو عدالتوں کی سزا ملتی ہے، ہوم سیکرٹری نے کہا کہ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم اخلاقی کردار کی عام پستی سے دوچار تو نہیں ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے لوگ اس بات کو برائی خیال نہیں کرتے کہ اپنے کارخانہ دار یا کسی بڑی انجمن یا اپنی حکومت کی جائداد پر قبضہ کرے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے انہیں کسی فرد کو نقصان پہونچتا نظر نہیں آتا، جب بالغ لوگ اس طرح کے خیالات رکھیں تو ان کا اثر خواہ مخواہ بچوں پر بھی ہوتا ہے۔

کنبے کا مقام

اس سوال پر مزید بحث کرتے ہوئے ہوم سیکرٹری نے کہا کہ ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ لوگوں کو کلی طور پر رائے عامہ کا سہارا لینے سے کس طرح بچایا جائے، مرد اور عورتیں نیک پیدا نہیں ہوتے بلکہ انہیں نیکی حاصل کرنا پڑتی ہے۔ نیکی، علم اور عادت سے پیدا ہوتی ہے۔ نیک طبیعت پیدا کرنے کے لیے ان دونوں چیزوں کی ضرورت ہے اور کنبے، مدرسے اور گرجے اور حکومت ہر چار کو اس کام میں حصہ لینا چاہیے۔ تمام انسانی ترقی کی آخری منزل اچھی زندگی ہے ہمیں دوسروں کی بھلائی کی خاطر اپنی خود غرضیوں پر قابو پانا سیکھنا چاہیئے۔ اگرچہ آج ایسی معاشرتی تبدیلیاں جاری ہیں جو کنبے کی حیثیت اور اس کے مقام کو متاثر کر رہی ہیں۔ پھر بھی یہ امید ہے کہ کنبہ اپنی سالمیت اور صحت کو باقی رکھے گا بچوں کی موزوں تربیت کے لیے اس جیسا اور تبادل ادارہ نہیں اور نہ ہی مردوں اور عورتوں کی تربیت کردار کے لیے اس جیسا کوئی مدرسہ ہے۔ اشتراک عمل اہم دردی۔ افہام و تفہیم اور متلازم عہد کے قیمتی اصول کنبے ہی میں سیکھے جاتے ہیں۔ کنبہ اور ریاست ایک دوسرے کی پشت پناہ ہیں۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

اموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ہی تعلیمی رسالے ہیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں [illegible] دو تعلیمی رسالے [illegible] ہو [illegible] اور صوبائی درسگاہوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ہیں

۳ - ان رسالوں کے متعلق اداری خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ہر مہینے کے دوسرے ہفتہ میں چھپتے ہیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) [illegible] منیجر کو بھیجنا چاہئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی [illegible] مقبول ہونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت [illegible] سے کریں -

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل
اموزش
۲ کچہری روڈ - لاہور (پاکستان)

شمارہ ۱] لاهور [اپریل ۱۹۵۵

اس شمارہ میں

مدیر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی }

معاونین { عبدالغفور چودھری
افضل احمد }

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

اپریل سنہ ۱۹۵۵ء

جلد ـــــــ ۸

شمارہ ـــــــ ۱

سالانہ چندہ

پاکستان

غیر ممالک

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی۔ لاہور

ایچ. ڈی۔ خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

اداریہ

ایم۔ اے۔ مخدومی

اعلیٰ تعلیمی اداروں کی کارکردگی کے متعلق ملک کے ممتاز ماہرین تعلیم جو تشویش ظاہر کر رہے ہیں وہ اپنی جگہ بجا ہے۔ ہمیں ان اداروں سے یہ توقع ہے کہ وہ مستقبل کے [illegible] مہیا کریں گے اگر

ان اداروں میں تربیت پانے والے طلبہ اور طالبات خوبی

ہوں ——— اور اس امر کی شہادت موجود ہے کہ یہ

مؤثر ذرائع کی تلاش ضروری ہے جو اس قیمتی قومی دولت

اس صورت حال کا جو علاج تجویز کیا گیا ہے وہ یہ [illegible]

ایک سال بڑھا دی جائے تاکہ یہ نصاب دو سالہ ہونے کی بجائے سہ سالہ ہو جائے، اس کے جواز میں دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ وقت بڑھ جانے سے طلبہ اپنے مضامین پر بہتر طور سے حاوی ہو سکیں گے اور نصاب میں ضروری توسیع ہو سکے گی، ایک سال بڑھانے کے جواز میں دوسری دلیل یہ دی گئی ہے کہ غیر ملکی یونیورسٹیوں میں ڈگری کا نصاب سہ سالہ ہے۔

ہمیں ان دلائل کی منطق کا احترام ہے لیکن تعلیم کے لیے لازمی ہے کہ اپنے معاشی معاشرتی ماحول کا پورا پورا لحاظ رکھے۔ ہر تعلیمی تبدیلی کی کامیابی کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ ان معاشی اور معاشرتی قوتوں کے ساتھ فہمیدہ ارتباط قائم کیا جائے جن کا رخ تبدیل کرنا مقصود ہے۔ ایسا ارتباط قائم کیے بغیر کوئی دیرپا کامیابی ممکن نہیں، پس ہم اپنے ملک کے تعلیمی دکھوں کا جو علاج بھی تجویز کریں

وہ اس ملک کے مخصوص معاشی اور سماجی حالات کے حسب حال ہونا چاہیے۔

معاشی بدحالی اور زندگی کی مختصر مہلت، مشرقی زندگی کی دو نمایاں خصوصیات ہیں، پاکستان جیسے ملک کے لیے جہاں اوسط آمدنی صرف -/۲۳۶ روپے ہو اور اوسط عمر ۲۷ سال سے زیادہ نہ ہو، یہ امر بے حد ضروری ہے کہ قومی دولت کی ہر پائی اور شہریوں کی زندگی کے ہر لمحہ کو بڑی کفایت سے استعمال کیا جائے۔ جب ہم معاملے پر اس پس منظر میں نگاہ ڈالتے ہیں تو ناگزیر نتیجہ یہی دکھائی دیتا ہے کہ ڈگری کے نصاب میں ایک سال کی توسیع ایک اوسط طالب علم اور ایک اوسط والد کے لیے ایک بھاری بوجھ ثابت ہوگی، یہ درست ہے کہ ہر قابل قدر چیز کے لیے قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ اس لیے اگر ہم کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بلند تر معیار دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں وقت اور روپے کی لاگت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ لیکن اس ضمن میں فیصلہ کن سوال یہ ہونا چاہیے کہ کیا ہماری مشکل کا فی الواقعہ اور کوئی حل نہیں؛ کیا ہم نصاب کی دو سالہ میعاد کے سارے امکانات سے کام لے چکے ہیں جو ہم ایک اور سال بڑھانے کے درپے ہیں؟

یہ یقین کرنے کے لیے معقول وجوہ موجود ہیں کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے، اگر پچھلی آدھی صدی میں ڈگری کا دو سالہ نصاب کامیاب رہا ہے تو اسے آج بھی ہماری ضرورت بخوبی پوری کرنی چاہیے، اگر یہ ایسا کرنے سے قاصر ہے تو ناکامی کے اسباب کو اس کی میعاد میں نہیں بلکہ کسی اور جگہ تلاش کرنا چاہیے۔ تغیر پذیر سماجی پس منظر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے طریقہ ہائے تدریس پر نظر ثانی ہوتی رہے۔ یونیورسٹی تعلیم کے نصاب اور اس کے طریقہ ہائے تدریس کو ملک کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے ساتھ ہم آہنگ بنانے کے لیے ہم نے تقریباً کچھ بھی نہیں کیا۔ بہت اغلب ہے کہ ہم اپنی مشکل کا علاج ان خطوط پر تلاش کر سکیں۔ نصاب کی مدت میں توسیع شاید ایک اچھا حل ہو لیکن ایک غیر متوازن معاشی نظام میں اس قسم کے قیمتی حل کو اسی وقت آزمانا چاہیے جب دوسرے علاج ناکام ثابت ہو جائیں۔

پاکستان کے ماہرین تعلیم کو یہ بات لحظہ بھر کے لیے نہ بھولنی چاہیے کہ ہماری بے حد

ضرورتوں میں سے بعض ابھی ادھوری پڑی ہیں۔ ملک میں بیسیوں مدرسے ایسے ہیں جو ضروری
عمارت اور ساز و سامان کی کمی کے باعث ناقص قسم کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اگر تعلیم پر صرف کرنے کے لیے
روپیہ اور وسائل مہیا ہو سکیں تو یہ صرف ایسی جگہ ہونے چاہئیں جہاں فائدہ یقینی ہو نہ کہ ایسی جگہ
جہاں فائدہ مبہم ہو۔ جب تک زیادہ اہم ضرورتیں پوری ہونا باقی ہیں اس وقت تک ایسے تعلیمی
تجربے ہماری استطاعت سے باہر ہیں جن کی قدر و قیمت غیر یقینی ہو۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ امر واقعہ ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم اصلاح طلب ہے۔ اس امر میں
اختلاف رائے ہو سکتا ہے کہ آیا یہ اصلاح چوٹی سے شروع ہونی چاہیے یا بنیاد سے۔ ہمیں
ان لوگوں کے حسن نیت کا یقین ہے۔ جن کی رائے یہ ہے کہ آغاز کار چوٹی سے ہونا چاہیے: تاہم ان کا
فرض ہے کہ اس بات کا اچھی طرح یقین کر لیں کہ سہ سالہ نصاب کی جو قیمت ادا کی جائے گی۔ نتائج
قدر و قیمت میں اس کے برابر ہوں گے، ہر شخص جانتا ہے کہ موجو...

اساتذہ پورا پورا فائدہ نہیں اٹھاتے۔ عام طور پر یوں ہوتا
پرواہ نہیں کی جاتی۔ امتحان سے پہلے چھے مہینوں میں سنجیدگی
جاتا ہے اور آخری چند ہفتوں میں گردن توڑ رفتار سے پڑھائی ہوتی
کو اس امر کا پوری طرح اطمینان کر لینا چاہیے کہ ایک سال کا جو عرصہ بڑھایا جا رہا ہے طلبہ اور
اساتذہ اسے یوں ہی گنوا نہیں دیں گے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ نصاب کو تین حصوں
میں بانٹ دیا جائے اور ہر سال کے خاتمہ پر متعلقہ حصے میں سے امتحان لے لیا جائے۔ غرض
اس بات کی ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے کہ جو زائد وسائل تعلیم پر صرف کیے جائیں ان سے پورا پورا
فائدہ حاصل کیا جائے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

ترکی میں تعلیم

فضل احمد

پاکستان اور ترکی کے درمیان حال ہی میں باہمی امداد کے جو سمجھوتے ہوئے ہیں انہوں نے ان دونوں ملکوں کو قریب تر کر دیا ہے۔ ترکوں کے ساتھ ہمارے مراسم ہمیشہ بڑے مخلصانہ رہے ہیں ہماری تحریک آزادی کا ایک اہم باب ترکی تاریخ کے ساتھ وابستہ ہے۔ لیکن اس وقت ایشیا کی یہ دو اہم قومیں پوری آزادی کے ساتھ باہمی مودت اور تعاون کے رشتے استوار کر رہی ہیں۔ اس پس منظر میں ہمارے لیے ترکی نظام تعلیم کا مطالعہ بڑا دلچسپ اور کارآمد بن جاتا ہے۔

عام خاکہ | پہلی عالمی جنگ کے چند سال بعد جب جدید ترکی نے اپنے آپ کو ہر طرح کی غیر ملکی زنجیروں سے آزاد پایا تو اس کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ ایک بوسیدہ از کار رفتہ اور مفلوج کن معاشرتی، معاشی نظام کے کھنڈروں پر ایک صحت مند اور ترقی پسند معاشرہ کس طرح تعمیر کیا جائے جو مخصوص قومی روح کو پوری طرح محفوظ رکھنے کے ساتھ ہی جدید صنعتی تہذیب کے تقاضوں سے بھی پوری طرح عہدہ برا ہو سکے۔ جدید ترکی کے معماروں نے پہلے دن ہی سے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا کہ یہ مقصد تعلیم ہی کے ذریعہ حاصل ہوگا۔ یہ اسی یقین کا صدقہ ہے کہ آج ترکی میں تعلیم طبقاتی حد بندیوں سے بالکل بالا ہے۔ جو نوجوان طالب علم کسی قسم کی تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس صلاحیت سے فائدہ اٹھانے کا خواہش مند ہو اس کے لیے ہر طرح کی تعلیم کے دروازے کھلے ہیں ترکی میں ابتدائی، ثانوی، فنی اور ٹیکنیکل تعلیم بالکل مفت ہے۔ اعلیٰ تعلیم (کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم) گو مفت نہیں لیکن جو نادار طلبہ غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کا ثبوت دیں اور اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہیں انہیں اعلیٰ تعلیم بھی مفت ملتی ہے۔

ترکی کے سامنے سب سے مشکل سوال ناخواندگی کے ملک بدر کرنے کا تھا۔ ملک کی آدھی سے

یادہ آبادی دیہات میں بستی ہے، یہ گاؤں ایک دوسرے سے بہت فاصلہ پر واقع ہیں۔ اس
بھری ہوئی دیہی آبادی کے لیے تعلیمی سہولتیں بہم پہنچانا آسان کام نہ تھا۔ کوئی تیرہ سال ہوئے
ملک کے مخصوص حالات کے پیش نظر ایک تعلیمی قانون منظور کیا گیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ کافی
مقدار میں دیہاتی استادوں کی بہم رسانی کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ ان استادوں کی تربیت
کے لیے مرکز قائم کیے گئے جن کو دیہی انسٹی ٹیوٹ کا نام دیا گیا۔ ان مرکزوں میں دیہاتی پرائمری
مدرسوں کے فارغ التحصیل چیدہ چیدہ طالب علموں کو پانچ برس تک تربیت دی جاتی ہے جس کے
بعد وہ دیہاتی مدارس میں معلمی کے فرائض انجام دینے لگتے ہیں۔ دو سال ہوئے ملک بھر میں ان تربیتی
مرکزوں کی تعداد اکیس تھی اور ان میں پندرہ ہزار طلبہ زیر تربیت تھے۔ ان مرکزوں کی تعداد اور بڑھائی
جائے گی۔ ان کے فارغ التحصیل دیہاتی اساتذہ ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں
سند یافتہ دیہاتی مدرس بھی موجود ہیں۔

چھدری آبادی والے اضلاع میں خاص طور پر تربیت
سات ہزار کو پہنچتی ہے۔ اس طرح دیہاتی استادوں کی کل
ہر استاد کے ذمے پچاس طالب علم فرض کیے جائیں تو ترکی کے
تعلیم پا رہے ہیں۔

ملک میں تکمیلی اور فنی تعلیم کی مانگ دن بدن زوروں پر ہے جس کا ایک ثبوت یہ ہے
کہ پرائمری پاس کر جانے کے بعد مڈل اسکولوں میں داخل ہونے والوں کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ عالی
تعلیم میں بھی ترکی کا نصب العین ایسے فنی ماہرین، انجینئر اور ٹیکنیشن پیدا کرنا ہے جو ملک کی روز افزوں
صنعتی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ ملک بھر میں تجارتی مدرسوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ یہ مدرسے
پرائمری پاس طلبہ کو داخل کرتے ہیں، ان میں سے بعض کا نصاب سہ سالہ ہے اور بعض کا پنج سالہ
دس برس ہوئے ان کی تعداد صرف چھ تھی لیکن آج ان کی تعداد دس بارہ گنا بڑھ چکی ہے۔ ان
مدرسوں میں جدید مشینی اوزاروں سے کام لینا بھی سکھایا جاتا ہے۔ اور ان کے فارغ التحصیل نوجوان

کارخانوں میں ملازم ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے تربیت یافتہ معماروں، بڑھیوں، لوہاروں اور دوسرے کاریگروں کی ہر جگہ مانگ ہے۔

سینکڑوں ترک نوجوان تجارتی مڈل اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ یہ نوجوان ملک کی تیزی سے ترقی پذیر کاروباری زندگی میں حصہ لینے کے لیے ضروری ہیں۔ دوسری عالمی جنگ میں جب باہر سے آلوں اور اوزاروں کی درآمد بند ہو گئی تو صنعتی اور تجارتی اسکولوں کو بڑی مشکل پیش آنے لگی۔ آخر ان مدرسوں نے یہ آلے اور اوزار خود بنانے شروع کیے اور یہ کام طلبہ کی عملی تربیت کا حصہ قرار پایا۔

تعلیم کے اس عام خاکے کے بعد اب ترکی تعلیم کے مختلف مدارج پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائیگی۔

ابتدائی تعلیم | ابتدائی تعلیم ترکی نظام تعلیم کی بنیاد ہے۔ سات اور بارہ برس کی عمر کے درمیان سب بچوں کے لیے مدرسے میں جانا لازمی ہے۔ اس غرض کے لیے شہروں، قصبوں اور دیہات میں ہزاروں نئے مدرسے کھولے گئے ہیں اور انہیں جدید تعلیمی سازوسامان سے لیس کیا گیا ہے۔ اس کام کی تکمیل میں ایک قدم موزوں استادوں کی فراہمی تھا۔ یہ ضرورت جس طور پر پوری کی گئی ہے، اس کی طرف پیچھے اشارہ گذر چکا ہے۔

تعلیمی منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ دیہاتی عوام میں تعلیمی بیداری پیدا کی جائے تاکہ وہ علم کی روشنی اور اس کی بدولت حاصل ہونے والی مشینی امدادوں کو خوشی خوشی قبول کریں۔ اس مطلب کے لیے ایسے نوجوانوں کے لیے ابتدائی تعلیم کا بندوبست بھی کیا گیا جو بروقت یہ تعلیم حاصل نہ کر سکتے تھے۔ نیز ان بالغوں کے لیے بھی ابتدائی تعلیم مہیا کی گئی جو اس سے بالکل عاری رہے تھے۔

ابتدائی مدرسے دو قسم کے ہیں۔ پہلی قسم کے ابتدائی مدرسے وہ دیہی مدرسے ہیں جہاں دیہی انسٹی ٹیوٹ کے فارغ التحصیل استاد پڑھاتے ہیں، دوسرے ابتدائی مدرسے وہ ہیں جہاں سند یافتہ استاد پڑھاتے ہیں، یہ وہ استاد ہیں جنہوں نے پہلے مڈل کا امتحان پاس کیا اور بعد میں تین سال تک تربیت حاصل کی۔ جن مدرسوں میں سند یافتہ استاد پڑھاتے ہیں وہ یا تو سرکاری مدرسے ہیں۔

بعض انجمنوں کے ماتحت چلنے والے پرائیویٹ مدرسے۔ بہرصورت یہ مدرسے براہ راست صوبائی محکمہ
تعلیم کی زیرنگرانی ہیں ۵۵-۱۹۵۴ء میں ان مدرسوں میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد شہری علاقوں میں کوئی
سوا چار لاکھ تھی اور دیہی علاقوں میں کوئی سوا چھ لاکھ۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے اعتبار سے یہ تعداد حسب ذیل ہے،

	لڑکے	لڑکیاں	کل تعداد
شہری رقبے :-	۲۵۳۳۰۴	۱۶۲۹۵۸	۴۱۶۲۶۲
دیہی رقبے :-	۴۰۰۶۹۲	۲۹۹۴۶۴	۷۰۰۱۵۶
میزان :-	۶۵۳۹۹۶	۴۶۲۴۱۲	۱۰۲۶۴۱۰

ابتدائی تعلیم کے بارے میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ دیہی مدرسوں کے نصاب اور طریقہ ہائے تدریس
شہری مدرسوں سے مختلف ہیں۔ دیہی مدرسوں میں کسی مخصوص وقت نامے کی پابندی
آزادی حاصل ہے کہ گاؤں کی موسمی اور مقامی ضرورتوں کے حسب
در وقت نامے میں ردو بدل کرلیا کریں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر گاؤں
کے مطابق وقت نامے میں عملی تربیت کی گنجائش نکالی جاتی ہے۔ اس کی
شہری مدرسوں میں کمرۂ جماعت کی پڑھائی ۲۶ گھنٹے فی ہفتہ ہے دیہی مدرسوں میں یہ پڑھائی
صرف ۱۸ گھنٹے فی ہفتہ ہے۔

غرض دیہی مدرسوں میں لکھنا پڑھنا سکھانے کے ساتھ ساتھ آبائی پیشوں میں سائنسی
تربیت دی جاتی ہے، تاکہ خواندگی بےکاری کا سبب بننے کی بجائے مقامی معیشت کی ترقی کا سبب بنے،
ہمارے ماہرین تعلیم نے اس منصوبے کے ذریعہ اس خطرے کی پیش بندی کی ہے جس نے ہمارے یہاں
خطرناک صورت اختیار کر رکھی ہے۔ ہمارے ملک میں پڑھا لکھا ہونا اور ہاتھ سے کھیتی باڑی
دست کاری کا کام کرنا دو متضاد چیزیں خیال کی جاتی ہیں۔

شہری اور دیہی مدرسوں میں مختلف مضامین کو ہفتے میں جو وقت دیا جاتا ہے اس کی وضاحت
ذیل کے نقشے سے ہوگی۔ (صفحہ ۱۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

شہری مدرسہ

مضامین	پہلی جماعت	دوسری جماعت	تیسری جماعت	چوتھی جماعت	پانچویں جماعت
ترکی	۱۰ گھنٹے	۷ گھنٹے	۷ گھنٹے	۶ گھنٹے	۶ گھنٹے
جغرافیہ	×	×	×	۲ "	۲ "
تاریخ	×	×	×	۲ "	۲ "
مطالعہ قدرت	×	×	×	۳ "	۳ "
شہریت	×	×	×	۲ "	۱ گھنٹہ
گھریلو سائنس	×	×	×	۲ "	۲ گھنٹے
عام سائنس	۵ "	۶ "	۶ "	×	×
حساب جیومیٹری	۴ "	۴ "	۴ "	۴ "	۵ "
ڈرائنگ و دستکاری	۴ "	۴ "	۴ "	۳ "	۲ "
لکھائی	×	۲ "	۱ گھنٹہ	۱ گھنٹہ	۱ گھنٹہ
موسیقی	۱ "	۱ "	۱ "	۱ "	۱ "
جمناسٹک	۲ گھنٹے	۲ گھنٹے	۲ گھنٹے	۱ "	۱ "
میزان	۲۶ "	۲۶ "	۲۶ "	۲۶ گھنٹے	۲۶ گھنٹے

دیہاتی مدرسہ

ترکی	۱۰ گھنٹے	۹ گھنٹے	۸ گھنٹے	۵ گھنٹے	۵ گھنٹے
عام سائنس	۳ "	۳ "	۴ "	×	×
جغرافیہ	×	×	×	۲ "	۲ "
تاریخ	×	×	×	۱ گھنٹہ	۱ گھنٹہ
شہریت	×	×	×	۱ "	۱ "

مضامین	پہلی جماعت	دوسری جماعت	تیسری جماعت	چوتھی جماعت	پانچویں جماعت
گھریلو سائنس	×	×	×	۱ گھنٹہ	۱ گھنٹہ
حساب جیومیٹری	۴ گھنٹے	۴ گھنٹے	۴ گھنٹے	۳ گھنٹے	۳ گھنٹے
ڈرائنگ	۱ گھنٹہ	۱ گھنٹہ	۱ گھنٹہ	۱ گھنٹہ	۱ گھنٹہ
لکھائی	×	۱ ؍	۱ ؍	۱ ؍	۱ ؍
میزان	۱۸ گھنٹے	۱۸ گھنٹے	۱۸ گھنٹے	۱۸ گھنٹے	۱۸ گھنٹے

ابتدائی تعلیم میں اس بنیادی اصول کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاتا کہ مدرسہ مقامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کھولا گیا ہے، جن مدرسوں میں دیہی تربیتی مرکزوں سے فارغ شدہ استاد کام کرتے ہیں وہاں نصاب میں ترمیم کر دی گئی ہے، ہر جماعت کے لیے فی ہفتہ گئی ہے، اس وقت بیس میں سے پہلی، دوسری اور تیسری جماعتوں تربیت پر صرف ہوتے ہیں، جبکہ چوتھی اور پانچویں جماعتوں میں ... مقرر ہیں۔

مشکل کا حل ترکی میں کی چالیس ہزار گاؤں ہیں جن میں سے بعض کی آبادی چار سو نفوس سے بھی کم ہے۔ ان دور دراز بکھری ہوئی دیہی آبادیوں میں مدرسے کھولنا اور استاد مہیا کرنا آسان کام نہ تھا اس مسئلہ کے حل کے لیے وزارت تعلیم نے بڑی جرأت سے ایک اچھوتا قدم اٹھایا، طے یہ ہوا کہ دیہی آبادی کو پڑھانے کے لیے کسانوں کو تربیت دی جائے، اس غرض کے لیے ایسے کسان چنے گئے جو اپنی مزروعہ زمینوں کے خود مالک تھے، فوجی خدمت انجام دے چکے تھے اور تھوڑے بہت پڑھے لکھے تھے ان لوگوں کو ایک سال تک تربیت دی جاتی ہے۔ تربیتی نصاب کھلے کھیتوں میں منعقد ہوتے ہیں، ہر دس کسانوں کی تربیت کے لیے ایک استاد مقرر ہوتا ہے، صبح کے اوقات نظری اور ثقافتی تعلیم کی نذر ہوتے ہیں۔ اور بعد دوپہر کو تعمیر اور دستکاری کا عملی کام کیا جاتا ہے۔ نصاب کے خاتمہ پر جو کسان امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں انہیں بالعموم اپنے ہی گاؤں میں

معلم مقرر کر دیا جاتا ہے۔

کسانوں کو معلم بنانے کا تجربہ اوّل اوّل ۱۹۳۶ء میں کیا گیا تھا۔ یہ تجربہ توقع سے بڑھ کر کامیاب ثابت ہوا۔ اور اس تحریک نے اس تیزی سے مقبولیت حاصل کی کہ ۱۹۴۵ء تک چھ ہزار سے اوپر مدرسے ایسے تھے جہاں کسان معلم پڑھا رہے تھے اور ان مدرسوں میں تعلیم پانے والوں کی تعداد دو لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی۔ کسان معلم صرف لکھنا پڑھنا۔ شہریت اور عام سائنس ہی نہیں سکھاتے بلکہ یہ سائنسی کاشت کے طریقوں کو عام کرنے میں بھی سابقون الاولون کا کام کرتے ہیں۔ شام کے وقت وہ بالغوں کو پڑھاتے ہیں اور عام قومی دلچسپی کے موضوعوں پر بات چیت کرتے ہیں۔

دیہی مدرسوں کے لیے جو عمارت درکار ہوتی ہے وہ گاؤں والے خود بناتے ہیں، حکومت نے معیاری نقشے تیار کر رکھے ہیں، عمارت اس نقشے کے مطابق ہونی چاہیے، حکومت اس کام کے لیے زر امداد دیتی ہے۔ مدرسوں کے ساتھ زرعی زمین بھی وقف کی جاتی ہے۔ جہاں زرعی تجربات اور عملی تربیت کا سامان کیا جاتا ہے۔ تجرباتی کام میں حکومت کی امداد ترقی یافتہ زرعی آلوں، بیجوں اور مویشیوں کی شکل میں ملتی ہے۔

ان مدرسوں کے انتظام اور نگرانی کے لیے گشتی صدر معلم مقرر کیے جاتے ہیں، یہ لوگ حسن کارکردگی اور نمایاں خوبی کی بنا پر دیہی معلموں ہی میں سے چنے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہیں کسان معلموں کی تربیت کا تجربہ ہونا بھی ضروری ہے۔ ایک صدر معلم کے ذمے ایک ضلع کے کئی مدرسے ہوتے ہیں ہر صدر معلم پانچ سے دس مدرسوں کا نگران مقرر کیا جاتا ہے۔ صدر معلم کا کام صرف اسی قدر نہیں کہ وہ کبھی کبھار مدرسے کا معائنہ کر کے استادوں کے کام میں نقائص نکالے۔ بلکہ اس کے ذمے یہ کام بھی ہے کہ اپنے زیر نگرانی کام کرنے والے استادوں کے لیے تجدیدی نصابوں اور لگاتار ذہنی بالیدگی کا انتظام کرے۔ مدرسوں کی نئی عمارتوں کی تعمیر کے کام کی نگرانی بھی صدر معلم کے فرائض میں شامل ہے۔

دیہی مدرسے نے ترکی کی زندگی کو نئی راہ پر لگانے میں بڑا کام کیا ہے۔ کسان معلموں نے سرگرمی اور ہوشمندی سے کام کیا ہے۔ اس نے اس تعلیمی تجربے کو بے حد کامیاب بنایا ہے۔

پیشہ ورانہ تعلیم | ایسے دیہی مدارس ہیں جہاں تربیت یافتہ استادوں کی تعداد سازو سامان کی بہم رسانی اجازت دے، پیشہ ورانہ تعلیم کا بندوبست بھی کیا جاتا ہے۔ ایسے پیشوں کی تعلیم دی جاتی ہے جو اس علاقے کے ساتھ مخصوص ہوں۔ ان نصابوں کی بڑی غایت یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم پانے والے طلبہ کو مقامی پیشوں کے متعلقہ سائنسی تربیت دی جائے تاکہ یہ ان پیشوں میں داخل ہو کر ان کے معیاروں کو اونچا کریں اور پیدائش و کارکردگی کے نئے معیار قائم کریں اور اس طرح گاؤں کی ساری معیشت کے لیے ترقی اور پیش قدمی کا سبب ثابت ہوں۔ ان نصابوں کے متعلق یہ خاص احتیاط برتی جاتی ہے کہ ان کا انعقاد ایسے وقت پر ہو جب طلبہ ان میں سہولت کے ساتھ شامل ہو سکیں۔ تدریس کا کام ہفتے میں زیادہ سے زیادہ تین دن کیا جاتا ہے۔ روزانہ کام کی طوالت ... سے آٹھ گھنٹے تک ہوتی ہے۔

پیشہ ورانہ نصاب دو قسم کے ہیں (۱) مستقل (۲) ...
پیشے کے متعلق تعلیم دیتے ہیں، اور ثانی الذکر مختصر ...
متعلق تعلیم دیتے ہیں غرض یہ نصاب جو ملک میں جگہ جگہ جاری ہیں تاہم ... بہترین اہتمام کرتے ہیں۔ یہ سیکھنے والوں کو نہ صرف اعلیٰ قسم کی فنی مہارت عطا کرتے ہیں بلکہ انہیں تازہ ترین سائنسی معلومات بھی بہم پہونچاتے ہیں۔ یہ مدرسے فی الحقیقت چھوٹے پیمانے پر ٹیکنیکل مدرسے ہیں ۱۹۴۵ء میں ان کی تعداد ۲۵۸ تھی۔ اب تک ان کی تعداد بہت بڑھ چکی ہے۔

دیہی انسٹی ٹیوٹ | ان چھوٹے ٹیکنیکل مدرسوں کے علاوہ ترکی میں دو درجن سے زیادہ دیہی تربیتی مرکز ہیں، یہ وہ ادارے ہیں جو چیدہ چیدہ پرائمری پاس طلبہ اور طالبات کو پانچ سال تک عملی تربیت دیتے ہیں۔ ہر تربیت پانے والے کو اپنے علاقہ کی مخصوص صنعت اور دستکاری میں خاص تربیت دی جاتی ہے۔ یہ لوگ فارغ التحصیل ہو کر اپنے اپنے گاؤں میں واپس آتے ہیں اور زراعت اور دستکاری کے مقامی میدان میں رہنما کا کام سنبھالتے ہیں۔ لڑکوں کو کھیتی باڑی، تعمیر، لکڑی اور دھاتوں کا کام سکھایا جاتا ہے، جبکہ لڑکیوں کو بچوں کی دیکھ بھا

سینا۔ پرونا۔ خانہ داری اور تیاری داری سکھائی جاتی ہے، اس تربیت کے آخری دو سالوں میں نمایاں قابلیت کے طلبہ اور طالبات کو طبی تربیت دی جاتی ہے۔ تاکہ وہ ہیلتھ آفیسر بن سکیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کچھ طلبہ دیہی معلم بن جاتے ہیں اور کچھ اپنے اپنے مخصوص پیشوں میں لگ جاتے ہیں اور اس طرح مقامی معاشی زندگی کا معیار بلند کرتے رہیں۔

بالغوں کے مدارس ۱۹۲۸ء کا سال ترکی تعلیم میں انقلابی موڑ کا درجہ رکھتا ہے۔ اس سال صدیوں سے مروجہ عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی رسم الخط کو اختیار کیا گیا، وجہ یہ تھی کہ آخر الذکر کا سیکھنا نسبتاً سہل تھا۔ اس قانونی تبدیلی نے یہ ضرورت پیدا کردی کہ ملک کے لاکھوں بالغوں کو نئے رسم الخط میں پڑھنا لکھنا سکھایا جائے، چنانچہ جگہ جگہ تعلیم بالغاں کے مرکز کھولے گئے۔ ان مدرسوں کے نصاب میں لکھائی پڑھائی کے علاوہ حساب۔ شہریت اور حفظان صحت کے مضامین بھی شامل کیے گئے۔ تعلیم بالغاں کے اس قومی منصوبے نے جو کامیابی حاصل کی اس کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۴۴ء تک بیس لاکھ شہریوں نے ان مدرسوں میں تعلیم پائی۔ اب ان عوامی مدرسوں کی اہمیت گھٹتی جا رہی ہے۔ کیونکہ نئی پود بلوغت کو پہنچنے سے پہلے پہلے تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو کر زندگی میں قدم رکھ رہی ہے۔

ثانوی تعلیم ترکی میں ثانوی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کے فارغ التحصیل طلبہ کو اعلیٰ فنی تعلیم کے اداروں کے لیے تیار کیا جائے تاکہ اعلیٰ تعلیم اپنے معیار کے اعتبار سے غیر ملکی معیاروں کا مقابلہ کر سکے۔

ثانوی نصاب کی میعاد چھے سال ہے۔ اس چھے سالہ نصاب کی دو منزلیں ہیں:۔

(۱) وسطانی (۲) لیسے یعنی ثانوی۔ جو طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں انہیں ان دونوں منزلوں کو عبور کرنا پڑتا ہے، یہ دونوں منزلیں تین تین سال کی ہیں اور دونوں مل کر اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک منضبط تیاری کا درجہ رکھتی ہیں۔

اگرچہ مڈل اسکول لیسے کے لیے پہلا قدم ہے، تاہم اس کا نصاب اس طرح تیار کیا گیا ہے

کہ یہ بذاتِ خود ایسے طلبہ کے لیے انتہائی منزل ثابت ہو سکے جو اعلیٰ تعلیم کی بجائے کسی کام کو اختیار کرنا چاہیں۔ مڈل پاس طلبہ غیر فنی کاروبار بھی اختیار کر سکتے ہیں یا کسی ٹیکنیکل کالج میں داخل ہو سکتے ہیں۔

لیسے (ہائی اسکول) کا نصاب ختم کرنے پر ہر طالب علم کو ایک سرٹیفکیٹ ملتا ہے لیکن جو طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل ہونا چاہیں ان کے لیے حکومت کے امتحان میٹرکولیشن میں کامیاب ہونا ضروری ہے۔ جو طالب علم لیسے کا نصاب ختم کرنے سے پہلے مدرسہ چھوڑ کر کاروباری زندگی میں داخل ہو جائیں انہیں یہ حق حاصل ہے کہ اگر چاہیں تو دوبارہ مدرسے میں داخل ہو جائیں اور لیسے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیں یا حکومت کا امتحان میٹرکولیشن پاس کر لیں۔ تاہم ایسے طلبہ کو اپنے پرانے [illegible] جاتا ہے۔

تدریجی ترقی ترکی میں ثانوی تعلیم کی تنظیم نو کا کام اس وقت میں معروف تھی۔ اس تنظیم نو سے پہلے ثانوی مدرسے دو قسموں [illegible]

(ا) سرکاری مدرسے جن کے تمام اخراجات مرکزی حکومت کے خزانے سے ادا ہوتے تھے ان میں سے بعض کا نصاب موجودہ مڈل اسکولوں کا ہم پلہ تھا اور بعض کا نصاب دو منزلوں میں بٹا تھا جو قریباً موجودہ مڈل اسکول اور لیسے کے متوازی تھا۔

(ب) مقامی مدرسے جن کے اخراجات مقامی حکومت کے ذمے تھے۔ یہ مدرسے سب کے سب مڈل اسکول تھے۔

سرکاری مدرسے تعداد میں کل ۲۱ تھے، ان میں سے صرف چار رہائشی مدرسے تھے باقی سترہ دن کے وقت تعلیم کا بندوبست کرتے تھے۔ مقامی مدرسے سب کے سب مڈل اسکول تھے ان کی کل تعداد تیس تھی اور ان میں سے کوئی بھی رہائشی مدرسہ نہ تھا۔

ثانوی تعلیم کی اصلاح کے لیے سب سے پہلا قدم یہ تھا کہ ان کی تعداد جلد از جلد

بڑھا دی جائے اور اس کے لیے ہر ممکن کوشش کی گئی، جنگ آزادی کے دوران میں سرکاری مدرسوں کی تعداد ۲۱ سے ۳۲ کو جا پہونچی اور ابتدائی مدرسوں کی تعداد ۲۳۴ ہو گئی۔ ان مدرسوں میں پڑھنے والوں کی تعداد صرف ۵۳۵۰۱ تھی۔ ترقی کی رفتار کا کچھ اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جب ترکی جمہوریت کا اعلان کیا گیا اس وقت مڈل اسکولوں کی تعداد ۲۸۲ کو جا پہونچی تھی۔ اور لیسے (ہائی اسکول) تعداد میں ۳۲ تھے۔ ان میں پڑھنے والے طلبہ اور طالبات کی تعداد ۶۴۱۷ ہو چکی تھی۔

۴۵-۱۹۴۴ء میں سرکاری مڈل اسکول تعداد میں ۹۵۱ تھے اور سرکاری لیسے تعداد میں ۴۷ - اگر اس تعداد میں پرائیویٹ اور غیر ملکی مدرسے بھی شامل کر لیے جائیں تو مڈل اسکول کی تعداد ۸۱۷ ہو جاتی ہے اور لیسیوں کی تعداد ۷۵ ۔ ان مدرسوں میں تعداد طلبہ حسب ذیل تھی۔

	مڈل اسکول	لیسے	میزان
تعداد طلبہ	۶۸۵۵۷	۲۵۰۷۶	۹۳۶۳۳

یہ تعداد صرف سرکاری مدرسوں میں پڑھنے والوں کی ہے۔ اگر اس میں غیر سرکاری اداروں کے طلبہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل تعداد ۱۰۴۵۹۲ ہو جائے گی۔

نظام تعلیم میں ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کرنے کے لیے تعلیم کو غیر مذہبی (سیکولر) بنا دیا گیا۔ ۱۹۲۴ء کے ایک قانون کی رو سے تمام مدرسے سرکاری نگرانی میں آ گئے۔ مذہبی تعلیم دینے والے ثانوی مدرسے بند کر دیے گئے اور انہیں مذہبی دار العلوموں میں تبدیل کر دیا گیا۔

اب تک لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ مدرسے قائم تھے۔ وسائل کی کمی کے باعث لڑکیوں کے لیے ہر جگہ الگ مدرسے کھولنا ممکن نہ تھا اور یہ چیز تعلیم نسواں کے راستے میں رکاوٹ بن رہی تھی، چناں چہ ۱۹۲۶ء میں ایک قانون منظور کیا گیا جس کی رو سے غیر رہائشی مڈل اسکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم مخلوط کر دی گئی۔ اسی سال ایک اور قانون کی رو سے ثانوی تعلیم مفت کر دی گئی۔

اس وسیع تعلیمی منصوبے کی کامیابی کے لیے ملک بھر میں مدرسوں کے لیے نئی عمارتیں
بنانا ضروری تھا، ترک قوم نے اسے اپنی پہلی ضرورت سمجھا اور دیکھتے دیکھتے جگہ جگہ جدید
وضع کے مدرسوں کی عمارتوں نے سر اٹھایا۔ پرانی عمارتوں میں ترمیم کرکے انہیں نئی تعلیمی ضرورتوں
کے حسب حال بنایا گیا اور ایسی نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں جو ترقی یافتہ ملکوں کے مدرسوں سے ٹکا
دکھاتی تھیں۔ اس کام میں عوام نے حکومت کی دل کھول کر مدد کی۔ کئی عمارتیں صاحب ثروت افراد
یا نجی انجمنوں نے تعمیر کرکے وزارت تعلیم کو پیش کیں

ان تمام کوششوں کے باوجود ابھی عوام کی تعلیمی مانگ پوری نہیں ہوئی۔ اس وقت بعض مدرسے
دن میں دو دفعہ لگتے ہیں، طلبہ کا ایک گروہ صبح کے اوقات میں مدرسے آتا ہے اور دوسرا بعد از
دوپہر۔ ۱۹۴۵ء میں ایسے مدرسوں کی تعداد ... تھی جو کثرت ط
دن میں دو مرتبہ لگتے تھے۔

اساتذہ | ثانوی تعلیم کی تجدید میں دوسرا اہم قدم موزوں

نئی جمہوریت کے قیام سے پہلے ثانوی استادوں کی کوئی پیشہ ورانہ حیثیت ...
ایک قانون کی رو سے ثانوی استادوں کی تعلیمی اور فنی قابلیت کے معیار مقرر کر دیے گئے اور ان کی
تقرری ترقی اور معزولی کے لیے واضح اصول مقرر ہو گئے۔ اس طرح ثانوی استادوں کو ایک خاص
فنی درجہ حاصل ہو گیا۔

نصاب | ثانوی تعلیم کا نصاب وضع کرنے میں وزارت تعلیم نے کافی سوچ بچار سے کام لیا ہے۔
یہ نصاب جمہوریت کی مخصوص ضرورتیں پوری کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ نصاب کی بڑی غایت ترکی
ثقافت کو تقویت دینا ہے، اس لیے ترکی زبان اور ترکی تاریخ کو خاص توجہ دی گئی ہے۔ طریقۂ
تدریس کے متعلق بنیادی مقصد یہ ہے کہ طلبہ جو واقفیت یا مہارت حاصل کریں وہ انہیں زندگی میں
کامیابی حاصل کرنے میں مدد دیں۔ نصاب کی بڑی کوشش یہ ہے کہ طلبہ بنیادی واقفیتیں سیکھ
جائیں اور ان سے عملی کام لے سکیں۔ اکثر مدرسوں میں سائنس کی تجربہ گاہیں اور کتب خانے موجود ہیں۔

ر ان کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے ۔

ترکی زبان کے علاوہ ایک جدید غیر ملکی زبان کا سیکھنا ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے ۔ ڈل سکول اور لیسے کے ہر طالب علم کو انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں سے ایک زبان سیکھنا پڑتی ہے، دوسری عالمی جنگ کے بعد سے عام طالب علموں کا انتخاب انگریزی زبان ہی ہو گیا ہے، اس لیے اکثر مدرسے صرف اسی ایک زبان کی تدریس کا اہتمام کرنے لگے ہیں ۔

نظام نامہ میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ صبح کے اوقات تدریسی کام کے لیے مخصوص رہیں اور بعد از دوپہر اوقات ایسے انفرادی اور گروہی مشاغل کے لیے وقف ہوں جو طلبہ اساتذہ کی نگرانی میں انجام دیں ۔ ترکی میں جاڑا بہت شدید پڑتا ہے اس لیے طلبہ کو مدرسے کی آرام دہ گرم فضا میں انفرادی کام کا موقع ملنا بہت غنیمت ہے، اکثر طلبہ کو گھر پر ایسی سہولت نہیں مل سکتی ۔

ضبط | آغاز بلوغت میں طلبہ جب جسمانی اور ذہنی انقلاب میں سے گزرتے ہیں، تو ثانوی تعلیم کے لیے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں وزارت تعلیم نے نوخیز نوجوانوں کی زندگی کے ان فیصلہ کن سالوں کی رہنمائی کے لیے اپنا مجموعۂ ضوابط شائع کیا تھا جس کا مقصد قومی کردار کی صحت مند تعمیر تھی، یہ ضوابط مجموعۂ تعزیرات نہیں بلکہ نوجوانوں کو اس امر کی ترغیب دیتے ہیں کہ اپنی بدنی اور دماغی قوتوں کو قوم اور نوع انسان کی خدمت کے لیے وقف کریں ۔ یہ ضوابط اس امر کا اہتمام کرتے ہیں کہ جو طلبہ اخلاقی اور ذہنی میدانوں میں نمایاں کارکردگی دکھائیں ان کا ذکر اعزازی فہرست میں کیا جائے ۔ اس طریق کار نے مدرسے کے ضبط کو بہت بہتر بنا دیا ہے طلبہ نے سزا کے خوف کی بجائے بطیب خاطر ضبط نفس محنت اور خدمت کے اصولوں کو اپنانا شروع کیا ہے ۔

مدرسوں میں ایسی تنظیمیں موجود ہیں جو عوامی خدمت کے کاموں میں حصہ لیتی ہیں ۔ ان کی وساطت سے نوجوان طلبہ آزادی اور ذمہ داری کے ساتھ قومی کاموں میں حصہ لینا سیکھ جاتے ہیں ۔ طلبہ کی بڑی بڑی تنظیمیں یہ ہیں :۔

(ا) ہلال احمر کی تنظیم جس کا مقصد یہ ہے کہ اخوت اور شفقت کے جذبات کی پرورش کی جائے یہ تنظیم جو روپیہ جمع کرتی ہے اس میں سے نصف انجمن ہلال احمر کو بھیج دیا جاتا ہے۔ اور نصف مدرسہ کے نادار طلبہ پر خرچ کیا جاتا ہے۔

(ب) طلبہ کی انجمن ہائے امداد باہمی۔ تقریباً ہر مدرسے میں ایک انجمن امداد باہمی موجود ہے۔ جو مقامی حالات کے حسب حال وضع کردہ ضوابط کے ماتحت کام کرتی ہے۔ یہ انجمن طلبہ کی ضرورت کی اشیاء فراہم کرتی ہے اور جو نفع ہو اس میں سے نادار طلبہ کو کتابیں اور دوسری ضروریات بہم پہنچاتی ہے بعض اوقات یہ انجمن اپنے منافع کی رقم سے مدرسے کی اہم ضروریات بھی پوری کرتی ہے۔ ان انجمنوں کا مقصد یہ ہے کہ مدرسے کی اجتماعی زندگی کو فائدہ پہونچائیں۔

(ج) انجمن ہائے تربیت جسمانی: نصاب مدرسہ میں تربیت ؟ ہے وہ نوجوان طلبہ کی سادی ضرورتیں پوری نہیں کرتا۔ ا مرکز قائم کیا گیا ہے۔ اس مرکز کی سرگرمیاں نصاب تعلیم سے کو ان میں حصہ لینا پڑتا ہے۔ ہاں اگر ڈاکٹر کسی طالب علم کو معذور قرار دے دے تو اسے [illegible] ہے۔ ان مرکزوں کا کام تربیت جسمانی کے ماہر استادوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور ان کی سرگرمیاں محکمہ تربیت جسمانی اور اسکاؤٹنگ کی زیر نگرانی ہیں۔

(د) موسیقی اور اداکاری کی انجمنیں۔ ان انجمنوں کا کام یہ ہے کہ طلبہ میں موسیقی، ڈرامہ اور علم و ادب کا ذوق پیدا کیا جائے۔ ان انجمنوں کا انتظام طلبہ کی چنی ہوئی کمیٹیوں کے ہاتھ میں ہے اور یہ استادوں کی زیر نگرانی کام کرتی ہیں۔

طلبہ کو زائد ذمہ داری سنبھالنے کے قابل بنانے اور جمہوری اصولوں کی ترقی کے لیے ہر مدرسے میں مانیٹروں سے کام لیا جاتا ہے۔ ہر جماعت آزاد رائے دہی سے اپنا مانیٹر خود چنتی ہے۔ اس کا انتخاب ایک مقررہ عرصہ کے لیے ہوتا ہے جس کے بعد اسے دوبارہ

انتخاب لڑنا پڑتا ہے۔ مانیٹر کمرۂ جماعت کے سامان اور مدرسے کی عمارت کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور سائنسی تجربہ گاہوں کتب خانوں اور غیر نصابی سرگرمیوں میں استادوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم ترکی میں اعلیٰ تعلیمی ادارے حکومت کے قائم کردہ ہیں اور حکومت ہی ان کا انتظام کرتی ہے۔ یہ ادارے دو قسموں کے ہیں:۔

(۱) یونی ورسٹیاں (۲) اعلیٰ فنی۔ پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل مدرسے۔

یونی ورسٹیاں:۔ ترکی میں کل تین یونی ورسٹیاں ہیں جن میں سے دو استنبول میں ہیں اور تیسری انقرہ میں۔

استنبول یونی ورسٹی کے پانچ شعبے ہیں۔ یعنی قانون۔ طب۔ سائنس۔ علوم اور معاشیات شعبۂ طب کی بنیاد ۱۸۲۶ء میں رکھی گئی تھی۔ باقی شعبے انیسویں صدی کے اواخر یا بیسویں صدی کے آغاز میں کھولے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں پاس شدہ ایک قانون کی رو سے یونی ورسٹی کی اصلاح کی گئی۔ اب اس کا انتظام ایک ریکٹر مختلف شعبوں کے صدور اور ایک سیکرٹری کے ہاتھ میں ہے۔ عملۂ تدریس پروفیسروں۔ لیکچراروں اور معاون پروفیسروں پر مشتمل ہے۔ جو لوگ اعلیٰ علمی کام شروع کرنا چاہیں ان کے لیے ضروری شرط ہے کہ پہلے یونی ورسٹی میں معاون پروفیسر کے طور پر پڑھائیں جو لوگ استنبول یونی ورسٹی سے طب کی ڈگری لینا چاہیں ان کے لیے نصاب کی میعاد ۱۲ سمسٹر ہے (ایک سال میں دو سمسٹر ہوتے ہیں) باقی شعبوں میں نصاب کی میعاد ۸ سمسٹر ہے شعبۂ طب میں دندان سازی اور دوا سازی کی شاخوں کے لیے بھی نصاب کی میعاد ۸ سمسٹر ہے۔

استنبول یونی ورسٹی میں ۱۹۵۰ء میں ۷۱ غیر ملکی پروفیسر کام کر رہے تھے اور ۳۰۵ ترک پروفیسر جن میں سے دو عورتیں تھیں ان کے علاوہ ۱۱۷ معاون پروفیسر تھے۔

شعبۂ طب:۔ جو طلبہ طب کا مطالعہ کرنا چاہیں انہیں پہلے دو سمسٹر طبیعات کیمیا اور قدرتی سائنس کے عام مطالعہ پر صرف کرنا پڑتے ہیں۔ اس طور پر وہ نہ صرف پہلے ہی حاصل کردہ علم میں اضافہ کر لیتے ہیں بلکہ انہیں سائنسی تجربہ گاہوں میں علمی کام کا تجربہ بھی ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد تین سمسٹر قبل از طب مضامین کے مطالعہ کی نذر ہوتے ہیں۔ اگلے سات سمسٹروں میں انہیں امراض کے اسباب و علاج اور عوامی صحت کے اصولوں کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ تدریس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ مریضوں کے عینی مشاہدہ سے طلبہ کو امراض کے اسباب و علاج کے متعلق سائنسی نگاہ حاصل ہو جائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ چھٹے سمسٹر کے آغاز سے طلبہ کی تربیت کا ایک اہم جزو علاج گاہوں میں عملی کام ہوتا ہے۔ طبی نصاب میں جدید طب کے تمام علوم شامل ہیں۔ حال ہی میں سرطان کے علاج کے لیے ایک تحقیقاتی ادارہ کھولا گیا ہے۔

دوسرے شعبے: — دوسرے شعبوں میں نصاب کی کل مدت آٹھ سمسٹر ہے۔ یہ نصاب نظری اور عملی ہر دو اجزا پہ مشتمل ہیں ہر سال کے خاتمہ پر امتحان ہوتا ہے۔ جو طلبہ ان نصابوں کو مکمل کر لیں وہ اگر چاہیں تو ڈاکٹر کی ڈگری کے لیے کام کر سکتے ہیں۔ اس ڈگری ...

موجود ہیں، ڈاکٹر کی ڈگری کے لیے کسی غیر ملکی زبان میں اس ...

بدولت اسی زبان سے اپنی زبان میں ترجمہ کیا جا سکے، ڈاکٹر ...

پر علمی مقالہ لکھنا اور اس کے متعلق اعتراضات کا جواب دینا بھی ...

شعبۂ علوم: — اس شعبے میں ترکیات۔ انگریزی۔ فرانسیسی۔ جرمن۔ عربی اور فارسی علم و ادب کے نصابوں کے علاوہ تاریخ جغرافیہ اور فلسفہ کے نصاب بھی شامل ہیں۔ اس شعبہ میں پڑھنے والے ہر طالب علم کو ان مضامین میں سے ایک کا گہرا خصوصی مطالعہ کرنا پڑتا ہے، اس کے ساتھ ہی دوسرے علوم کے لیکچروں میں شامل ہونا بھی ضروری ہے اس سے غرض یہ ہے کہ جہاں ایک گریجوایٹ اپنے مخصوص علمی میدان میں گہری نگاہ حاصل کرے وہاں وہ دوسرے علمی میدانوں کے متعلق بھی بے خبر نہ رہے۔

سائنس کے شعبے میں ہر طالب علم کو مندرجہ ذیل میں سے ایک میں خصوصی مہارت حاصل کرنا پڑتی ہے۔ ریاضی۔ طبیعات۔ کیمیا اور قدرتی سائنس۔ اس شعبہ میں کیمیائی انجینئرنگ کی ایک شاخ بھی موجود ہے۔

یونی ورسٹی میں ایک تعلیمی انسٹی ٹیوٹ بھی قائم ہے۔ شعبہ فلسفہ کے پروفیسر یہاں لیکچر دیتے ہیں۔ شعبہ سائنس اور شعبۂ علوم کے جو طلبہ استاد بننے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ اس انسٹی ٹیوٹ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دو سمسٹر تک اس انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم پانے کے بعد انہیں معلمی کی سند مل جاتی ہے۔

شعبۂ علوم میں غیر ملکی زبانوں کے مطالعہ کے لیے بھی ایک ذیلی شعبہ قائم ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ غیر ملکی زبانوں جو مطالعہ لیسے میں شروع کیا گیا تھا اس کی تکمیل ہو جائے۔ جو طلبہ اس شعبہ کا نصاب کامیابی سے پورا نہیں کر سکتے وہ گریجوایٹ نہیں بن سکتے۔

اسی طرح شعبۂ قانون میں بین الاقوامی قانون اور جرم کا ایک ذیلی شعبہ قائم ہے۔ یہ شعبہ اپنے مخصوص میدان میں تحقیقاتی کام کرتا ہے اور اپنے نتائج کو کتابچوں کی شکل میں شائع کرتا رہتا ہے۔

یونی ورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم پانے والے تمام طلبہ کے لیے لازمی ہے کہ ایک اور خصوصی نصاب کو پورا کریں جس کا نام ہے: "ترکی جمہوریت کی روح اور ترکی مجلسی انقلاب کی تاریخ"۔ اس نصاب کا مقصد اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں نقطہ نگاہ اور ذہنی رجحان کی یک جہتی پیدا کرنا ہے۔

انقرہ یونی ورسٹی انقرہ ایک ملک کا دوسرا علمی مرکز ہے۔ انقرہ یونی ورسٹی کے چار بڑے شعبے ہیں (۱) السنہ، تاریخ اور جغرافیہ کا شعبہ (۲) شعبہ سائنس (۳) شعبہ طب اور (۴) شعبۂ قانون

۱۹۲۷ء میں ترکی میں عدالتی اصلاحات کا نفاذ عمل میں آیا تھا جس کی رو سے ملک میں سوئٹزرلینڈ کے نمونہ پر نیا ضابطہ تعزیرات رائج کیا گیا۔ اسی زمانے میں سول اور تجارتی ضابطہ میں بھی تبدیلی ہوئی۔ ان نئے قانونی ضابطوں پر عمل درآمد کرنے کے لیے ایسے نوجوانوں کی ضرورت تھی جو ان ضابطوں میں ماہر ہوں، چنانچہ وزارت عدل نے ۱۹۲۷ء میں انقرہ یونی ورسٹی میں قانونی شعبے قائم کیے جن کا نصاب چار سالہ ہے۔ اس نصاب کے خاتمہ پر اعلیٰ قانونی تعلیم کے خصوصی نصاب ہیں جو ڈاکٹر کی ڈگری پر ختم ہوتے ہیں۔

انقرہ یونی ورسٹی کے نصاب کا خاکہ صفحہ ۲۳ پر درج ہے۔

شعبہ السنہ، تاریخ اور جغرافیہ: اس کی مندرجہ ذیل شاخیں ہیں۔

(۱) ترکی زبان اور علم و ادب

(۲) تاریخ۔

(۳) جغرافیہ

(۴) فلسفہ

(۵) جدید زبانیں اور ان کا علم و ادب (انگریزی، فرانسیسی، جرمن، روسی اور ہنگاری زبانیں)

(۶) کلاسیکی زبانیں، یونانی اور لاطینی۔

(۷) مشرقی کلاسیکی زبانیں اور ان کا علم و ادب (عربی اور فارسی)

(۸) ایشیائے کوچک کی قدیم زبانیں اور ان کا علم و ادب (... ... ... جلی)

(۹) قدیم ایشیائی زبانیں اور ان کا علم و ادب (چینی

(۱۰) علم الاقوام اور علم الشعوب۔

(۱۱) علم الآثار۔

ان شعبوں کے علاوہ بہت سے شعبوں کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ بھی ملحق ہیں جو اپنی اپنی شعبوں کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کا کام تحقیقاتی کام کرنا اور اپنی تحقیق کے نتائج کو کتابی شکل میں پبلش کرنا ہے۔ ان میں سے ایک اہم انسٹی ٹیوٹ ترکی معاشرتی انقلاب کی انسٹی ٹیوٹ ہے جو جمہوریہ ترکی کے جنم اور جدید ترکی معاشرہ کی تاریخ اور دیگر متعلقہ امور کے متعلق تحقیقاتی کام کا اہم مرکز ہے۔

شعبہ سائنس: سائنس کا شعبہ ۱۹۴۳ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس میں اس وقت ریاضی، طبیعات، اور کیمیا کے ذیلی شعبے کام کر رہے ہیں ان سب کا نصاب ۸ سمسٹروں کی مدت کا ہے۔ جو لوگ تدریسی سند حاصل کرنا چاہیں انہیں اس کے لیے ایک علیحدہ نصاب پورا کرنا پڑتا ہے۔

یونی ورسٹی میں ایک تعلیمی انسٹی ٹیوٹ بھی قائم ہے۔ شعبہ فلسفہ کے پروفیسر یہاں لیکچر دیتے ہیں۔ شعبہ سائنس اور شعبۂ علوم کے جو طلبہ استاد بننے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ اس انسٹی ٹیوٹ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دو سمسٹر تک اس انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم پانے کے بعد انہیں علمی کی سند مل جاتی ہے۔

شعبۂ علوم میں غیر ملکی زبانوں کے مطالعہ کے لیے بھی ایک ذیلی شعبہ قائم ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ غیر ملکی زبانوں جو مطالعہ لیسے میں شروع کیا گیا تھا اس کی تکمیل ہو جائے۔ جو طلبہ اس شعبہ کا نصاب کامیابی سے پورا نہیں کر سکتے وہ گریجو ایٹ نہیں بن سکتے۔

اسی طرح شعبۂ قانون میں بین الاقوامی قانون اور جرم کا ایک ذیلی شعبہ قائم ہے۔ یہ شعبہ اپنے مخصوص میدان میں تحقیقاتی کام کرتا ہے اور اپنے نتائج کو کتابچوں کی شکل میں شائع کرتا رہتا ہے۔

یونی ورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم پانے والے تمام طلبہ کے لیے لازمی ہے کہ ایک اور خصوصی نصاب کو پورا کریں جس کا نام ہے: "ترکی جمہوریت کی روح اور ترکی مجلسی انقلاب کی تاریخ"

اس نصاب کا مقصد اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں نقطہ نگاہ اور ذہنی رجحان کی یک جہتی پیدا کرنا ہے۔

انقرہ یونی ورسٹی | انقرہ اب ملک کا دوسرا علمی مرکز ہے۔ انقرہ یونی ورسٹی کے چار بڑے شعبے ہیں (۱) السنہ، تاریخ اور جغرافیہ کا شعبہ (۲) شعبہ سائنس (۳) شعبہ طب اور (۴) شعبہ قانون

۱۹۲۷ء میں ترکی میں عدالتی اصلاحات کا نفاذ عمل میں آیا تھا جس کی رو سے ملک میں سوئٹزرلینڈ کے نمونہ پر نیا ضابطہ تعزیرات رائج کیا گیا۔ اسی زمانے میں سول اور تجارتی ضابطہ میں بھی تبدیلی ہوئی۔ ان نئے قانونی ضابطوں پر عمل درآمد کرنے کے لیے ایسے نوجوانوں کی ضرورت تھی جو ان ضابطوں میں ماہر ہوں، چنانچہ وزارت عدل نے ۱۹۲۷ء میں انقرہ یونی ورسٹی میں قانونی شعبے قائم کیے جن کا نصاب چار سالہ ہے۔ اس نصاب کے خاتمہ پر اعلیٰ قانونی تعلیم کے خصوصی نصاب ہیں جو ڈاکٹر کی ڈگری پر ختم ہوتے ہیں۔

انقرہ یونی ورسٹی کے نصاب کا خاکہ صفحہ ۲۳ پر درج ہے۔

شعبہ السنہ۔ تاریخ اور جغرافیہ: اس کی مندرجہ ذیل شاخیں ہیں۔
(۱) ترکی زبان اور علم و ادب
(۲) تاریخ۔
(۳) جغرافیہ
(۴) فلسفہ
(۵) جدید زبانیں اور ان کا علم و ادب (انگریزی فرانسیسی۔ جرمن۔ روسی اور ہنگری زبانیں)
(۶) کلاسیکی زبانیں، یونانی اور لاطینی۔
(۷) مشرقی کلاسیکی زبانیں اور ان کا علم و ادب (عربی اور فارسی)
(۸) ایشیائے کوچک کی قدیم زبانیں اور ان کا علم و ادب
(۹) قدیم ایشیائی زبانیں اور ان کا علم و ادب (سنسکرت)
(۱۰) علم الاقوام اور علم الشعوب۔
(۱۱) علم الآثار۔

ان شعبوں کے علاوہ بہت سے شعبوں کے ساتھ انسٹی ٹیوشنز بھی ملحق ہیں جو انہی شعبوں کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کا کام تحقیقاتی کام کرنا اور اپنی تحقیق کے نتائج کو کتابی شکل میں پبلش کرنا ہے۔ ان میں سے ایک اہم انسٹی ٹیوٹ ترکی معاشرتی انقلاب کی انسٹی ٹیوٹ ہے جو جمہوریہ ترکی کے جنم اور جدید ترکی معاشرہ کی تاریخ اور دیگر متعلقہ امور کے متعلق تحقیقاتی کام کا اہم مرکز ہے۔

شعبہ سائنس: سائنس کا شعبہ ۱۹۴۳ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس میں اس وقت ریاضی، طبیعات، اور کیمیا کے ذیلی شعبے کام کر رہے ہیں ان سب کا نصاب ۸ سمسٹروں کی مدت کا ہے۔ جو لوگ تدریسی سند حاصل کرنا چاہیں انہیں اس کے لیے ایک علیحدہ نصاب پڑھنا پڑتا ہے۔

شعبۂ طب:- یہ شعبہ ۱۹۴۳ء میں قائم ہوا تھا۔ اس میں سردست طبیعات کیمیا اور عام سائنسوں کی تعلیم دی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ علاج گاہوں میں عملی تربیت کا انتظام ہے۔

اعلیٰ زراعت کا شعبہ:- یہ شعبہ ۱۹۳۳ء میں قائم کیا گیا تھا، غرض یہ تھی کہ سائنس زراعت کے لیے ماہرین کی جماعت پیدا کی جائے جو کھیتی باڑی کے علاوہ مویشیوں کی صحت، افزائش نسل اور جنگلات کا کام سنبھال سکے اور ان میدانوں میں سائنسی تحقیق جاری رکھے۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں مندرجہ ذیل شعبے ہیں:-

قدرتی سائنسیں۔ زراعت۔ مویشیوں کا علاج۔ علم الاشجار اور زرعی ٹکنالوجی۔ ان نصابوں کی مدت ۸ سے ۱۰ سمسٹر تک ہے۔ ان نصابوں کو ختم کرنے کے بعد ڈاکٹر کی ڈگری بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ جو لوگ معلمی کا پیشہ اختیار کرنا چاہیں وہ اول اول پروفیسروں کے نائب کے طور پر کام کرتے ہیں اور اگر ضروری آزمائش میں کامیاب ہو جائیں تو معاون پروفیسر مقرر ہو جاتے ہیں۔ بعد ازاں ترقی کر کے وہ پروفیسر کے عہدہ تک پہونچ سکتے ہیں۔

اعلیٰ تربیتی مرکز:- عام التعلیم کے کئی اعلیٰ مرکز وزارت تعلیم کے ساتھ منسلک ہیں۔ ان میں سے بڑے بڑے مرکز مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) تربیت اساتذہ کا اعلیٰ ادارہ استنبول۔

(۲) اساتذہ کی تربیت گاہ اور غازی انسٹی ٹیوٹ۔ انقرہ۔

(۳) ملک شیر تربیت گاہ اور نزہت انسٹی ٹیوٹ۔

(۴) تربیت جسمانی کا مدرسہ ادرنہ

(۵) مدرسۂ سیاسات

(۶) تجارت اور معاشیات کا اعلیٰ مدرسہ۔ استنبول۔

(۷) تجارت اور معاشیات کا اعلیٰ مدرسہ۔ ازمیر

(۸) فنون لطیفہ کی اکادیمی ۔ استنبول ۔

مدرسہ سیاسیات :- یہ مدرسہ ۱۸۵۹ء میں قائم کیا گیا تھا تاکہ یہ ان لوگوں کی تربیت کر سکے جو ملک کے انتظامی شعبوں، مالیات اور سیاسیات میں داخل ہونا چاہتے ہوں۔ اس کا نصاب چار سالہ ہے۔ یہ ایک رہائشی مدرسہ ہے جس میں داخلہ کے لیے ایک امتحان میں کامیاب ہونا شرط ہے۔ طلبہ کے اخراجات، وزارت داخلہ یا وزارت مالیات ادا کرتی ہے۔

تجارتی بیڑے کا مدرسہ وزارت مواصلات سے متعلق ہے۔ اس میں مڈل پاس نوجوان داخل کیے جاتے ہیں اور انہیں تجارتی بیڑے میں کپتان اور دوسرے عہدوں کے سنبھالنے کی تربیت دی جاتی ہے۔

فوجی اور بحری اکادمیوں میں ان نوجوانوں کو تربیت
ہوائی اور بحری فوجوں میں ذمہ داری کے عہدے سنبھالنے کی
اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلے کے لیے ضروری شرط یہ

سرکاری امتحان پاس کیا ہو۔ ۱۹۴۵ء میں اس امتحان میں کامیاب ہونے والوں کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ان میں سے اکثر طلبہ یونیورسٹی یا اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلے کے لیے درخواستیں دیتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں سے بعض کے ہاں رہائشی سہولتیں موجود ہیں۔ طب اور قانون کے بہت سے طلبہ کو وزارت صحت عامہ اور وزارت عدل کی طرف سے وظیفے دیے جاتے ہیں۔ ان وظائف کی شرط یہ ہوتی ہے کہ تکمیل تعلیم کے بعد یہ یہ لوگ ان محکموں میں ملازمت کریں گے۔ یہی طریق کار ٹیکنیکل یونیورسٹی میں مستعمل ہے ۱۹۴۵ء میں اعلیٰ تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم طلبہ کی تعداد ۱۹۹۸۳ تھی۔

غیر ملکوں میں تعلیم پانے والے طلبہ :- غیر ملکوں میں بھیجے جانے والے ترک طلبہ خواہ وہ کسی بھی وزارت کی طرف سے بھیجے جائیں، وزارت تعلیم کی نگرانی میں رکھے جاتے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے بہت سے طلبہ جرمنی، سوئٹزرلینڈ، فرانس اور بلجیم میں بھیجے جاتے تھے۔

آموزش

اب ان ملکوں میں جانے والے طلبہ کی تعداد گھٹ گئی ہے اور انگلینڈ اور ریاستہائے متحدہ میں جانے والے طلبہ کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ تاہم سوئٹزرلینڈ میں تعلیم پانے والے ترک طلبہ کی تعداد بدستور خاصی ہے۔ برلن۔ لندن اور نیویارک میں مقیم ترک تعلیمی اتاچی ان ملکوں میں تعلیم پانے والے ترک طلبہ کی رفتار ترقی پر نگاہ رکھتے ہیں۔ خواہ یہ طلبہ سرکاری خرچ پر بھیجے گئے ہوں یا ذاتی خرچ پر گئے ہوں ؎

دنیائے عرب میں
تعلیمی اور ثقافتی تبدیلیاں

محمد عبد العزیز

سلسل نمبر ۳

مدرسین کی تربیت

مختلف عرب ممالک میں تعلیم کا بیش از بیش مطالبہ اور اس کے پیش نظر ابتدائی اور ثانوی مدارس کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ایک اچھا شگون ہے۔ لیکن اگر ان مدرسوں میں بچوں کی تعلیم و تربیت کی نگرانی ایسے مدرسین کے سپرد کر دی جائے جو غیر تربیت یافتہ ہوں بچوں کے مزاج و آہنگ سے [illegible]
ان میں وہ جذبۂ خودکاری اور ہمدردی نہ ہو جو ایک مدرس کی
تعلیم کی بڑھتی ہوئی مانگ اور اس کی تکمیل کا مقصد دلوانے کا خو
بھی آج اسی کش مکش سے دوچار ہیں۔ تعلیمی ضروریات کے مطابق
ہو رہا ہے مگر مدرسین کی تربیت کا اب تک کوئی مستقل اور موزوں انتظام نہیں۔ سعودی عرب اور شرق اردن میں تو مدرسوں کے لیے کوئی تربیتی ادارہ ہی نہیں۔ لبنان اور فلسطین میں معمولی سا انتظام ہے۔ شام میں بھی چند تربیتی ادارے ابتدائی مدارس کے اساتذہ کی تربیت کے لیے مخصوص ہیں جو ملک کی موجودہ ضروریات کے لیے ناکافی ہیں۔ اس لیے اب ان ممالک میں سے بھی ایک ضروری تعلیمی مسئلہ سمجھ کر قابل قدر توجہ دی جا رہی ہے۔ عراق اور مصر اس سلسلے میں دوسروں سے بہتر ہیں۔ یہاں ابتدائی اور ثانوی مدارس کے اساتذہ کے تربیتی ادارے موجود ہیں جو بہر صورت وقتی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

تربیت اساتذہ کی نوعیت ہر ملک میں مختلف ہے۔ حتیٰ کہ زمانۂ تربیت میں بھی خاصا اختلاف ہے۔ مصر میں عمومی ثانوی سند کے لیے دو سال درکار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ

ابتدائی مدارس کے اساتذہ جو تعلیمی اور پیشہ ورانہ تربیت حاصل کرتے ہیں۔ اس کا معیار ثانوی تعلیم سے زیادہ نہیں ہوتا۔ ان مدرسوں کو ہمارے نارمل اسکولوں کا بدل سمجھنا چاہیئے۔ نارمل اسکولوں میں ایک مدرس کو اس سال سے کم عمر کے بچوں کی تعلیم و تدریس کی تربیت دی جاتی ہے جس کا معیار مشکل سے ہمارے موجودہ ثانوی مدارس کے برابر ہوتا ہے۔ بعض ممالک میں شہری اور دیہاتی مدرسوں میں کام کرنے والوں کی تربیت کا علاحدہ علاحدہ انتظام ہوتا ہے جو انہیں ان کے معاشرتی پس منظر کے مطابق تیار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اب ایسے تربیتی ادارے بھی کھل رہے ہیں جن میں تین سال کی مسلسل تربیت کے بعد سند ملتی ہے بعض اداروں میں یہی مدت دو سال ہے لیکن ان انتظامات کے باوجود ابھی ہر مدرسے میں اچھے اساتذہ کی کمی ہے۔ سرکاری مدرسوں میں تو تربیت یافتہ اور اچھے اساتذہ نظر آجاتے ہیں لیکن نجی اور بیرونی اداروں میں ان کی تعداد ناکافی ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ سرکاری مدرسوں میں تنخواہیں بہتر ہیں نسبتًا حالات اچھے ہیں اور مدت ملازمت کے اختتام پر پنشن ملنے کی توقع ہوتی ہے۔

اس وقت ہر ملک میں سب سے اہم مسئلہ اسی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ علاوہ ان میں تو اس ضرورت کو کسی نہ کسی طرح نہایت تیزی سے پورا کیا جا رہا ہے۔ مگر دوسرے ممالک اس سلسلے میں ابھی بہت پیچھے ہیں، حکومتوں نے اب تک اسے ایک اہم قومی مسئلہ سمجھا ہی نہیں یہ ممکن تھا کہ حکومت اور بعض نجی انجمنیں مل کر ایسے تربیتی ادارے قائم کرلیں جہاں اساتذہ کی تربیت کا موزوں اور مناسب انتظام ہوسکے۔ لیکن غریب ممالک کی مالی حالت بہت مشکل سے نجی ادارے اپنی روزمرہ ضروریات ہی بہ مشکل پورا کر پاتے ہیں وہ کسی تربیتی ادارے کے قیام کے لیے بھلا کون سی مالی امداد دے سکتے ہیں۔ تربیت یافتہ اساتذہ کی اس کمی کی وجہ سے بیشتر مدرسوں میں غیر تربیت یافتہ مدرس کام کرتے نظر آتے ہیں جو اس کام کے لیے نہ تو موزوں ہوتے ہیں اور نہ انہیں اس سے کوئی گہرا لگاؤ ہی ہوتا ہے کہ اس ذوق وشوق کی بدولت وہ بچوں کے نفسیاتی رجحانات کو دیکھ کر انہیں اس کے مطابق پڑھا لکھا سکے اور

ان کی شخصیت کی تعمیر میں حصہ لے سکے۔

اچھے کارکن

ہمارے یہاں دیہاتی مدرسوں میں بالعموم ایسے اساتذہ بھیجے جاتے ہیں جن کی ذہنی معلوماتی سطح کچھ اتنی بلند نہیں ہوتی۔ بعینہٖ یہی کیفیت عرب ممالک کی ہے۔ دیہاتی مدرسوں میں غیر تربیت یافتہ اساتذہ کی تعداد تربیت یافتہ اساتذہ سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اور خال خال اگر تربیت یافتہ اساتذہ نظر بھی آتے ہیں تو ان کی وضع قطع، ان کی چال ڈھال اور مدرسے کے نظم و نسق سے ان کی علمی بے مائگی نمایاں ہو جاتی ہے۔ عرب ممالک کا معاشی اور اقتصادی نظام خاصا شاندار رہا ہے۔ مگر دیہاتی مدرسوں میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا یہی عالم رہا تو کوئی علاقہ اپنی موجودہ زبوں حالی سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ گاؤں کے اچھے نظام ہی پر ملک کی عمومی فلاح و بہبود کا انحصار ہے۔ ساطی آفردی ناظم اعلیٰ تعلیم عراق ... کے لیے یہ تجویز پیش کی ہے۔

اس سلسلے میں ایک ایسا دیہاتی مدرسہ ایک اہم پارٹ ا... اپنی ضروریات پر بالخصوص توجہ دیتا ہے، لیکن ایک ایسے مدرسے ... ہو۔ اچھے اور تربیت یافتہ اساتذہ کا ہونا اصلاح کی شرط اول ہے۔ ان اداروں میں ایسے اساتذہ کی ضرورت ہے جو صرف اپنے مضامین ہی پر حاوی نہ ہوں بلکہ ملاقائی زراعتی ماحول، لوگوں کے رہن سہن، ان کی معاشری اور ثقافتی زندگی سے بھی خاص واقفیت ہو، اور وہ ان کی قیادت بھی کر سکیں۔

عراق اور فلسطین میں اس قسم کے تربیتی کالج موجود ہیں جن میں محض ایسے مدرسین کی تربیت کا انتظام ہے جو صرف دیہاتی مدرسوں میں ہی کام کر سکیں گے۔ متعلم اساتذہ کے انتخاب میں یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ دیہات ہی کا رہنے والا ہو اور اس ماحول میں اجنبی نہ ہو بلکہ اس کی ساری فضا جانی پہچانی ہو۔ اس سے یقیناً دیہاتی زندگی میں ایک انقلاب آ جائے گا۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب یہ متعلم اساتذہ ان تربیتی اداروں۔ دائرِ تعلیم اور اچھی تربیت حاصل

کر سکے گاؤں میں اس اصلاحی پروگرام کی تکمیل کریں۔ جس کی ابتدا انھوں نے کالج میں محض نظری اعتبار سے کی ہے، فی الحال ان اداروں میں اچھے اساتذہ کی کمی ہے۔ یہ نو آموز مدرسوں کے دل میں جذبۂ خود کاری کی لگن نہیں پیدا کر سکتے۔ مگر پھر بھی وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ یہ دشواریاں بھی دور ہو جائیں گی اور انہیں میں سے مخلص کارکن بھی پیدا ہو جائیں گے جو اصلاح تعمیر کے اس خواب کی تعبیر ثابت ہوں گے۔

طریق تربیت

اساتذہ کی تربیت کا مسئلہ اب چوں کہ ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے اس لیے ہر ملک اس طرف بالخصوص توجہ دینے کی کوشش کر رہا ہے اور اپنے وسائل و ذرائع کے مطابق اپنے مدرسوں میں تجدد کا رنگ بھرنے کی سعی کرتا ہے۔ لیکن ہر ملک اور ہر حکومت کا نقطۂ نگاہ مختلف ہے۔ اساتذہ کی تربیت کے سلسلے میں اس وقت دو ادارۂ فکر ہیں ایک گروہ کے خیال میں یونی ورسٹی تعلیم کے بعد استاد بننے سے پہلے ایک یا دو سال کی تربیت ضروری ہے۔ دوسرا گروہ تعلیم و تربیت کو یک جا کرنے کے حق میں ہے۔ یعنی تعلیم و تدریس کی تربیت کے ساتھ طلبہ کچھ دوسرے مضامین پر بھی دست گاہ حاصل کرتے رہیں۔ بیروت اور قاہرہ کی امریکی یونی ورسٹیوں میں موخر الذکر طریق تربیت رائج ہے، شام میں بھی اسی قسم کی تربیت کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ مصر میں برطانوی طریق تعلیم کے مطابق ثانوی مدارس کے اساتذہ کی تربیت گریجوایٹ بننے کے بعد ہی ہو سکتی ہے، مصر کے علاوہ دوسرے عرب ممالک میں بھی یہی طریق تربیت مستحسن متصور کیا جاتا ہے۔

اساتذہ کی تربیت کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ جو لوگ مدرسوں میں کام کرتے ہیں ان کے لیے تعطیلات میں یا وقتاً فوقتاً توسیعی تقریروں کا انتظام کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ حکومت بعض اہم مقامات پر تربیتی مرکز قائم کر دیتی ہے۔ جہاں اساتذہ شام کو جمع ہو کر تربیت کے مخصوص کورس کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس قسم کی تربیت سے اس وقت تک جو نتائج نکلے ہیں وہ خاطر خواہ نہیں۔ اس سے اساتذہ کا علم تر و تازہ اور ان کی معلومات وسیع ہو جاتی ہے اور وہ اپنے پیشے

کے اس تربیتی بوجھ سے کچھ اس طرح دب جاتے ہیں کہ وہ انہیں کورسوں کو حرف آخر اور تعلیم کی آخری منزل سمجھ لیتے ہیں۔ ان تربیتی مرکزوں کی اس خرابی کو یوں دور کیا جا سکتا ہے کہ یہاں گرمیوں کی تعطیلات میں ایک مقررہ تجدیدی کورس میں ہر استاد کا شامل ہونا لازمی قرار دے دیا جائے، یا اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہر مدرسے سے اساتذہ کی ایک مخصوص تعداد ایک ایک سال کے لیے ان تربیتی مراکز میں آکر تعلیم حاصل کرے اس سے ان کے زنگ خوردہ علم پر بھی صیقل ہو جائے گی اور وہ خود نئے ولولے اور نئے جذبے کے ساتھ پرانی ڈگر سے ہٹ کر اپنے اپنے مدرسوں میں نئی طرح ڈالیں گے۔

رئیس مدرسہ

ان مدرسوں کے نظام کار میں جو بنیادی خرابیاں ہیں ان میں اساتذہ کے ساتھ ساتھ منتظمین کی فہرست میں رئیس مدرسہ (ہیڈماسٹر) کا نام

اساتذہ سے اپنے علم اور اپنی تربیت میں کسی طرح بہتر نہیں ہوتے

صلاحیتیں ہوتی ہیں کہ وہ مدرسے گئے ہوئے ماحول میں زندگی کی حرارت پیدا کر سکیں۔ اس طرح مدرسوں میں اصلاح کی بہت کم گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ رئیس مدرسہ کی شخصیت اگر سہارا اساتذہ کے لیے ایک رہبر اور قائد کا نمونہ پیش نہیں کر سکتی تو اس مدرسے کی انتظامی کل میں خرابی پیدا ہو جانا ایک امر یقینی ہے۔ ہمارے ملک میں اس قسم کے واقعات اکثر رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اگرچہ تعلیمی لحاظ سے ہم غریب ممالک سے قدرے آگے ہیں لیکن ابھی ہمارے نظام میں بھی وہ بالیدگی اور تنوع پیدا نہیں ہو سکا جو کسی ملک کی عالمگیر ترقی کا باعث ہوتا ہے۔

گروہی تقسیم

ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں اساتذہ کی طبقاتی تقسیم نے انہیں مختلف گروہوں میں بانٹ دیا ہے۔ اگر ان میں ایک برہمن ہے تو دوسرا شودر۔ ایک حاکم ہے تو دوسرا محکوم۔ ایک بلند وارفع ہے تو دوسرا پست و ذلیل، پھر طبقاتی حیثیت سے معاشرے میں ان کا مقام جوتیوں کی صف میں ہوتا ہے۔ آخر یہ کیوں اور ایسا کیوں؟ اس کی ایک وجہ تو کسی کے

دل میں اپنے پیشے کا احترام نہ ہونا ہے، اور دوسری وجہ اس طبقے کی فکری کمزوریاں ہیں جس پر
ہر زود رآور خروج حاصل کرلیتا ہے، عرب ممالک میں حالات کچھ اس سے مختلف نہیں بلکہ بدتر ہیں۔
اساتذہ گروہوں میں تقسیم اور پھر معاشرے میں ان کا واجب الاحترام نہ ہونا۔ ان ممالک کو منزل سے دور
لے جائے گا۔ حوادث سے مقابلہ کرنے کی اہمیت پیدا نہیں کر سکے گا۔ مدرس کی معاشری حیثیت تو ایک
مستقل موضوع ہے جس پر یہاں بحث نہیں ہو سکتی، اس سلسلے میں صرف اتنا بتا دینا ہی کافی ہے
کہ ان ممالک نے بھی ابھی اساتذہ کا احترام کرنا نہیں سیکھا ہے۔

بیرونی زبانیں

عرب ممالک بالخصوص بلاد شام اقوام و ملل اور مشرق و مغرب کا سنگم ہے۔
اس لیے اس علاقے کے لوگ یوں بھی بڑی آسانی سے دوسری زبانیں سیکھ
لیتے ہیں، دو تین سو برس پہلے تو عربی زبان بجائے خود ایک بین الاقوامی زبان تھی، بخارا سے خدن
اور حکارتا سے قرطبہ اور اشبیلیہ تک بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ لیکن برطانوی اقتدار کے ساتھ ساتھ عربی
زبان دنیا کی بین الاقوامی حیثیت بھی قائم نہ رہ سکی۔ انگریزوں نے شمالی امریکہ، جنوبی اور وسطی افریقہ
آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں تو ان علاقوں کی زبان بھی انگریزی ہی رہی
مقامی باشندوں کی بولیاں اور ان کی معاشری زندگی کا پرانا چلن باقی نہ رہا۔ انگریزی زبان اور انگریزی
تمدن نے نئے ماحول میں بھی اپنا رنگ قائم رکھا۔ چنانچہ پہلی عالمگیر لڑائی کے بعد انگریزی زبان دنیا کی
بین الاقوامی زبان بن گئی۔ عرب ممالک میں اس سے پہلے فرانسیسی زبان کا رواج تھا کیونکہ یہی یورپ کی
مشترکہ زبان تھی جسے سب لوگ بولتے اور سمجھتے تھے۔ پہلی عالمگیر لڑائی کے بعد جب شام اور لبنان
کے علاقے فرانسیسی انتداب میں آئے تو اس زبان کا رواج اور عام ہو گیا اور یہاں چند ایسے
ادارے بھی قائم ہو گئے جن کا ذریعہ تعلیم فرانسیسی تھا۔

عربوں کو عربی سے محبت ہے وہ اس کی بقا اور اس کی ترقی کے لیے کوشاں بھی ہیں۔ اس لیے
عرب ماہرین تعلیم اپنی موجودہ بدحالی سے آزردہ نہیں ہیں، عربی زبان میں صدیوں پرانے علم کا وافر
ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن چونکہ دو تین سو برس کے سیاسی اور علمی زوال کی وجہ سے موجودہ علوم پر مستند

کتابوں کی کمی ہے۔ اس لیے اب اس میں نئے خیالات کو ادا کرنے کے لیے نئی اصطلاحات اور نئے الفاظ کی ضرورت ہے کیوں کہ زندہ زبانیں ہمیشہ اسی طرح اپنے سرمائے کو بڑھاتی رہتی ہیں۔ بیرونی اقتدار کے ساتھ ساتھ یہاں بیرونی زبانوں کی تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ بیروت اور قاہرہ کی امریکی یونی ورسٹیوں کا ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے۔ اس لیے بالعموم طلبہ انگریزی میں دست گاہ پیدا کر لیتے ہیں۔ عرب نسبتاً زبانیں جلد سیکھ لیتے ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی کے علاوہ جرمن لاطینی اور روسی زبانوں کے جاننے والے بھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں لیکن اس وقت ان کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ بیرونی زبانوں کی تعلیم کس نہج پر ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں ان کے پیشِ نظر یہ اہم مسائل ہیں۔

(۱) کون سی بیرونی زبان سیکھنی چاہیے۔

(۲) اس زبان کی تحصیل کا معیار کیا ہو، اور اس کی تدریس کب۔

(۳) کیا کسی بیرونی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا ضروری ہے۔

(۴) بیرونی زبانوں کی تدریس کا قومی زبانوں کی تدریس و تحصیل پر کیا اثر ہو۔

پہلا سوال تو اتنا دقت طلب نہ تھا۔ انگریزی کی موجودہ بین الاقوامی حیثیت کے پیشِ نظر اب عرب ممالک میں فرانسیسی کی بجائے انگریزی کی تدریس کی طرف زیادہ توجہ دی جا رہی ہے اور اس میں مصر و عراق اور شام و لبنان کا ایک ہی نقطۂ نظر ہے۔ لیکن دوسرا مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ بیرونی زبان کی تدریس کا معیار کیا ہو اور اسے کب اور کس طرح شروع کیا جا سکے، اس سلسلے میں ہر ملک کا نظریہ مختلف اور ہر ماہرِ تعلیم کا زاویۂ نگاہ مختلف ہے۔ لبنان کے بعض مدارس میں بیرونی زبان کی تدریس کنڈر گارٹن سے شروع ہو جاتی ہے اور بعض مدارس میں بارہ برس کی عمر سے۔

نئی تحریک مصر میں زبان کی تدریس کے سلسلے میں ایک نئی تحریک معرضِ وجود میں آ چکی ہے اس تحریک کے محرکوں کا یہ خیال ہے کہ سب سے پہلے بچے کو اپنی زبان آنی چاہیے، جب وہ اس کے مبادیات سے گذر کر اس پر قدرے دست گاہ حاصل کر لے تو اسے دوسری زبان کی تحصیل کی طرف

توجہ دلائی چاہیے۔ اپنی زبان کی معلومات اسے دوسری زبان کے سیکھنے میں مدد دے گی۔ چنانچہ اس تحریک کے زیر اثر ہر ملک میں عربی زبان ہی کو مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا ہے اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ عربی زبان وقت کے نئے رجحانات کے مطابق نئی سنورتی رہے گی۔ نوجوانوں کو اپنی زبان اور اپنی ثقافت سے یک گونہ وابستگی پیدا ہو جائے گی۔ ورنہ بالعموم طلبہ ایک ایسے احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں جو انہیں مایوس اور آزردہ خاطر بنا دیتا ہے۔

عربوں کو اپنی زبان دانی پر تو ایام جاہلیہ میں بھی غرہ تھا۔ اب اس نئی تحریک نے ان کے سوئے ہوئے جذبات کو جگا دیا ہے۔ آج ہر زبان پر یہی سوال ہے۔ آخر اپنی زبان کی بجائے کسی دوسری زبان کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے۔ مانا کہ روزمرہ زندگی میں ہمیں بیرونی زبان کے جاننے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر انہیں اپنی قومی زبان پر فوقیت دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ بچوں کو پہلے اپنی زبان سیکھنی چاہیے تاکہ طلبہ اپنی زبان میں ہر قسم کے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ انہیں اپنے افکار و خیالات کے اظہار کے لیے کسی دوسری زبان کا سہارا نہ لینا پڑا۔ اگر آج عربی زبان موجودہ علوم و فنون کی اصطلاح کے سلسلے میں کم مایہ ہے تو اس کا دامن اتنا وسیع ہے کہ اپنی ضرورت کے مطابق نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات روزانہ اختراع کی جا سکتی ہیں۔ عرب ماہرین تعلیم کو اپنی زبان پر بھروسہ ہے اور صرف بھروسہ ہی نہیں وہ لوگ اس سلسلے میں کام بھی کر رہے ہیں۔ اس لیے امید ہے کہ بہت جلد وہ اپنی جملہ دشواریوں پر قابو پا لیں گے۔

قابل تقلید نمونہ لبنان اور شام کے بعض ابتدائی اور ثانوی مدارس میں فرانسیسی لازمی تھی، ان اداروں میں یا تو عربی زبان کی تدریس خارج از نصاب تھی یا اگر پڑھائی جاتی تھی تو اس کی حیثیت ثانوی سے بھی کمتر تھی۔ ان اداروں کی اس تنگ نظری نے عربوں کے جذبۂ خودداری کو بیدار کیا اور انہوں نے بیرونی زبانوں کے بجبر اخراج کا بھی مطالبہ شروع کر دیا لیکن وقت کی ضرورت کے مطابق ہر عرب ملک نے بیرونی زبان کی تحصیل کو تو لازمی اور ضروری قرار دیا ہے۔ مگر ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم گاہوں میں اسے ذریعۂ تعلیم بنانے پر کبھی رضامند نہیں ہوئے۔ یہ اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ پچھلے دنوں جب حکومت

شام نے بیرونی مدرسوں سے وزارت معارف کے جاری کردہ نصاب کی تدریس کا مطالبہ کیا تو
انہوں نے اپنے اداروں میں اس نصاب کو رائج کرنے سے انکار کر دیا۔ عربوں کی حمیت ایک بار
پھر غیرت میں آئی۔ انہوں نے فرانسیسی مدرسوں سے مصالحت کی کوشش نہ کی اور نہ ان کے قیام
کو اپنے لیے اتنا ضروری سمجھا۔ وزارت معارف نے انہیں ایک اور نوٹس دیا اور جب اس پر بھی
بیرونی مدرسوں کے منتظمین کی گردنیں اکڑی رہیں تو انہوں نے ایک ایک ادارے کو بند کر کے
ایک عارضی تعلیمی تعطل قبول کر لیا۔ یہ ادارے ابھی اچھی طرح دوبارہ جاری نہیں ہو سکے۔ مگر اپنی
زبان و ثقافت کی بقا کے لیے ان کا یہ اقدام بہرصورت مستحسن ہے۔

ہمارے ملک میں کتنی کم و بیش سو برس سے انگریزی زبان کا سکہ رواں ہے اس نے فارسی
کو ہضم کر لیا اور ایک مدت سے اردو کو بھی ختم کرنے کے درپے ہے لیکن
آب و رنگ میں کچھ زیادہ سنجیدہ، باوقار اور نکھری ہوئی معلوم
کیا، غیروں کے ظلم اور اپنوں کی بے توجہی کا شکار رہی اور آ
جنہیں یہ مستعدی سے طے کرتی جا رہی ہے۔ ہمارے ثانوی مد
سے شروع ہوتی ہے اور پھر انٹرمیڈیٹ سے ذریعہ تعلیم کی صورت اختیار کر لیتی ہے، مجھے خود
ذاتی تجربہ ہے کہ بچے جس سرعت اور تیزی سے اردو سیکھ لیتے ہیں انگریزی نہیں سیکھ سکتے ہمارے
ثانوی مدرسوں میں جو اہمیت انگریزی کو دی جاتی ہے اگر اس کا نصف حصہ بھی اردو کی تدریس پر
صرف کیا جائے تو بڑے عمدہ نتائج مرتب ہو سکتے ہیں، وہ بچے جو اردو کی مدد سے دوسرے کام کر سکتے
ہیں اور نہایت عمدگی سے وہ انگریزی کی تحصیل میں اپنی عمر کا ایک طویل حصہ صرف کر دیتے ہیں
مگر اس کے باوجود دفتری کارروائی اور کاروباری انگریزی سے آگے انہیں کچھ بھی نہیں آتا اور یہ
ایک عجیب بات ہے کہ اس سرکاری پشت پناہی کے باوجود انگریزی ہمارے مزاج و آہنگ میں
نہ ڈھل سکی۔ نہ اسے ہم اپنا سکے اور نہ وہ ہمیں اپنا سکی۔ اس کا خمیر دوسرا ہے اور وہ کسی دوسری
آب و ہوا میں پلی بڑھی ہے۔ بھلا وہ ہمارے لیے کیسے موزوں ہو سکتی ہے؟

توجہ دلانی چاہیے۔ اپنی زبان کی معلومات اسے دوسری زبان کے سیکھنے میں مدد دے گی، چنانچہ اس تحریک کے زیر اثر ہر ملک میں عربی زبان ہی کو مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا ہے اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ عربی زبان وقت کے نئے رجحانات کے مطابق ترقی کرتی رہے گی۔ نوجوانوں کو اپنی زبان اور اپنی ثقافت سے یک گونہ وابستگی پیدا ہو جائے گی۔ ورنہ بالعموم طلبہ ایک ایسے احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں جو انہیں مایوس، دل آزردہ خاطر بنا دیتا ہے۔

عربوں کو اپنی زبان دانی پر تو ایام جاہلیہ میں بھی غرہ تھا۔ اب اس نئی تحریک نے ان کے سوئے ہوئے جذبات کو جگا دیا ہے۔ آج ہر زبان پر یہی سوال ہے۔ آخر اپنی زبان کی بجائے کسی دوسری زبان کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے۔ مانا کہ روزمرہ زندگی میں ہمیں بیرونی زبان کے جاننے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر انہیں اپنی قومی زبان پر فوقیت دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ بچوں کو پہلے اپنی زبان سیکھنی چاہیے تاکہ طلبہ اپنی زبان میں ہر قسم کے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ انہیں اپنے افکار و خیالات کے اظہار کے لیے کسی دوسری زبان کا سہارا نہ لینا پڑا۔ اگر آج عربی زبان موجودہ علوم و فنون کی اصطلاح کے سلسلے میں کم مایہ ہے تو اس کا دامن اتنا وسیع ہے کہ اپنی ضرورت کے مطابق نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات روزانہ اختراع کی جا سکتی ہیں، عرب ماہرین تعلیم کو اپنی زبان پر بھروسہ ہے اور صرف اور صرف بھروسہ ہی نہیں وہ لوگ اس سلسلے میں کام بھی کر رہے ہیں، اس لیے امید ہے کہ بہت جلد وہ اپنی جملہ دشواریوں پر قابو پالیں گے۔

قابل تقلید نمونہ

لبنان اور شام کے بعض ابتدائی اور ثانوی مدارس میں فرانسیسی لازمی تھی، ان اداروں میں یا تو عربی زبان کی تدریس خارج از نصاب تھی یا اگر پڑھائی جاتی تھی تو اس کی حیثیت ثانوی سے بھی کمتر تھی۔ ان اداروں کی اس تنگ نظری نے عربوں کے جذبۂ خودداری کو بیدار کیا اور انہوں نے بیرونی زبانوں کے بجز اخراج کا بھی مطالبہ شروع کر دیا لیکن وقت کی ضرورت کے مطابق ہر عرب ملک نے بیرونی زبان کی تحصیل کو تو لازمی اور ضروری قرار دیا ہے۔ مگر ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم گاہوں میں اسے ذریعۂ تعلیم بنانے پر کبھی رضامند نہیں ہوئے، یہ اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ پچھلے دنوں جب حکومت

شام نے بیرونی مدرسوں سے وزارت معارف کے جاری کردہ نصاب کی تدریس کا مطالبہ کیا تو انہوں نے اپنے اداروں میں اس نصاب کو رائج کرنے سے انکار کر دیا۔ عربوں کی حمیت ایک بار پھر غیرت میں آئی۔ انہوں نے فرانسیسی مدرسوں سے مصالحت کی کوشش نہ کی اور نہ ان کے قیام کو اپنے لیے اتنا ضروری سمجھا۔ وزارت معارف نے انہیں ایک اور نوٹس دیا اور جب اس پر بھی بیرونی مدرسوں کے منتظمین کی گردنیں اکڑی رہیں تو انہوں نے ایک ایک ادارے کو بند کر کے ایک عارضی تعلیمی تعطل قبول کر لیا۔ یہ ادارے ابھی اچھی طرح دوبارہ جاری نہیں ہو سکے۔ مگر اپنی زبان و ثقافت کی بقا کے لیے ان کا یہ اقدام بہر صورت مستحسن ہے۔

ہمارے ملک میں بھی کم و بیش سو برس سے انگریزی زبان کا سکہ رواں ہے اس نے فارسی کو ہضم کر لیا اور ایک مدت سے اردو کو بھی ختم کرنے کے درپے ہے۔ لیکن یہ زبان اپنے مقامی آب و رنگ میں کچھ زیادہ سنجیدہ، باوقار اور نکھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس نے حوادث کا مقابلہ کیا، غیروں کے ظلم اور اپنوں کی بے توجہی کا شکار ہوئی اور آج بھی کش مکش کی یہی منازل ہیں جنہیں یہ مستعدی سے طے کرتی جا رہی ہے۔ ہمارے ثانوی مدارس میں انگریزی چھٹی جماعت سے شروع ہوتی ہے اور پھر انٹرمیڈیٹ سے ذریعہ تعلیم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مجھے خود ذاتی تجربہ ہے کہ بچے جس سرعت اور تیزی سے اردو سیکھ لیتے ہیں انگریزی نہیں سیکھ سکتے ہمارے ثانوی مدرسوں میں جو اہمیت انگریزی کو دی جاتی ہے اگر اس کا عشر عشیر بھی اردو کی تدریس پر صرف کیا جائے تو بڑے عمدہ نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ وہ بچے جو اردو کی مدد سے دوسرے کام کر سکتے ہیں اور نہایت عمدگی سے وہ انگریزی کی تحصیل میں اپنی عمر کا ایک طویل حصہ صرف کر دیتے ہیں مگر اس کے باوجود دفتری کارروائی اور کاروباری انگریزی سے آگے انہیں کچھ بھی نہیں آتا اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس سرکاری پشت پناہی کے باوجود انگریزی ہمارے مزاج و آہنگ میں نہ ڈھل سکی۔ نہ اسے ہم اپنا سکے اور نہ وہ ہمیں اپنا سکی۔ اس کا خمیر دوسرا ہے اور وہ کسی دوسری آب و ہوا میں پلی بڑھی ہے۔ بھلا وہ ہمارے لیے کیسے موزوں ہو سکتی ہے؟

کیا عربوں کو اس زندہ مثال کے باوجود ہمارے ارباب حل وعقد اردو کی تدریس کی طرف توجہ نہیں دیں گے۔ یہ تو ہماری غیرت وحمیت کا ایک امتحان ہے۔ کیا آزادی کے بعد بھی ہم آزاد ہیں کیا ہم آقایان فرنگ کے پڑھائے ہوئے سبق سے سرمو انحراف کرنے کی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر نہیں تو آنے والی نسلیں ہمارا اس طرح مواخذہ کریں گی جیسے آج ہم میر جعفر اور صادق دکن کا احتساب کرتے ہیں۔

بیرونی مدرسے عرب ممالک میں بے شمار بیرونی مدرسے قائم تھے۔ لبنان۔ شام۔ فلسطین اور مصر و عراق میں متعدد ادارے درس وتدریس کے کام میں مصروف تھے۔ اور ان اداروں نے عربوں کی تعلیمی بیداری میں ایک اہم پارٹ ادا کیا ہے۔ موجودہ قومی تعلیمی تحریک کا سرچشمہ بھی بیرونی مدارس تھے۔ آج عربوں کی تحریک آزادی کے چند معروف قائد قاہرہ اور بیروت کی امریکی یونی ورسٹیوں کے گریجویٹ ہیں، ایک مدت تک بیرونی اقتدار کے زیراثر یہ بیرونی ادارے ان ملکوں کی تعلیمی زندگی میں ایک اہم حیثیت کے مالک بنے رہے۔ لیکن پچھلے چند سالوں سے بیرونی مدرسے عربوں کی تنقید کا نشانہ بن رہے ہیں، اس کی سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہ بیرونی مدرسے تمام تر مسیحی ادارے ہیں جہاں دینی تعلیم بھی نصاب کا ایک جزو ہے۔ اس دینی تعلیم میں مسلمان بچوں کو بھی شریک ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے مسلمان والدین عام طور پر اپنے بچوں کو ان مدرسوں میں بھیجنے کی بجائے قومی مدرسوں میں داخل کرا دیتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنے دین ومذہب سے تو اس قدر بیگانہ نہ ہو جائیں۔ ایک عام مسلمان کا یہ خیال کہ یہ ادارے ہماری قومی اور ملی روایات کے مٹانے کے لیے قائم ہیں ایسا شدید ہے کہ اسے اس سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو اس کے ایمان کا ایک جزو ہے چناں چہ ان بیرونی مدرسوں میں طلبہ کی بیشتر تعداد غیر مسلم عیسائی یا یہودی ہوتی ہے۔ ایسے علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو ان اداروں میں غیر مسلموں کا زیادہ ہونا ایک عجیب سی بات ہے لیکن واقعات اور حقائق یہی ہیں۔

ان اداروں پر دوسرا عام اعتراض یہ ہے کہ جو انجمنیں ان اداروں کے نظم ونسق کی ذمہ دار ہیں

ان کا مقامی حکومتوں سے کوئی تعلق نہیں اس لیے یہ ادارے اپنے نظام کار میں خود مختار ہیں
ان کا اپنا نصاب اور اپنا طریق تدریس ہے جس پر وزارت معارف کو براہ راست کوئی اختیار
نہیں۔ اس لیے ان اداروں کا اپنے ملکوں سے وابستہ رہنا ایک امر ناگزیر ہے۔ آخر ان اداروں
میں عربی کی تعلیم اور مشرق وسطی کے جغرافیہ کی تدریس سے کیوں گریز کیا جاتا ہے۔ اس سے تو یہی ظاہر
ہوتا ہے کہ ان کا مقصد عربوں میں انتشار پیدا کر کے نئی نسل کو ان کے اپنے ماحول میں انہیں
ہر چیز سے بیگانہ بنا دینا ہے۔ اس خیال نے رفتہ رفتہ ایک قومی اعتراض کی صورت اختیار کر لی
اب ہر شخص ان اداروں کو اس روش کا شاکی ہے اور بار بار اس کے سامنے یہی سوال آتا ہے۔ ہم دوسرے
ملکوں کا جغرافیہ کیوں پڑھیں۔ ہم دوسرے ملکوں کی تاریخیں کیوں پڑھیں۔ ہم دوسری زبان کو ذریعۂ تعلیم
کیوں بنائیں۔ اس تحریک کا لازمی نتیجہ یہی نکلا کہ ان بیرونی مدرسوں سے انقطاع کیا جائے، ورنہ یہ ایک
معاشرے میں دوسرا معاشرہ اور ایک قوم میں دوسری قوم پیدا کر کے عربوں کی ہیئت اجتماعی کو ختم
کر دیں گے۔ کیوں کہ طلبہ کی لاتعداد ان اداروں سے نکلے گی۔ اس کی نگاہیں ملکی مسائل کی بجائے بیرون
ملک کے مسائل اور ان کے حالات و واقعات کے تجزیے پر مرکوز ہو جائیں گی اور یہ اقدام قومی خودکشی
کے مترادف ہے۔

تنقید کا تیسرا اثر زیادہ شدید ہے۔ یہ بیرونی ادارے مختلف ملکوں اور قوموں سے متعلق ہیں
ان کا نظام کار اور ان کا ذریعۂ تعلیم مختلف۔ انگریزی اور امریکی اداروں کا ذریعۂ تعلیم انگریزی، اطالوی
اداروں کا ذریعۂ تعلیم اطالوی، جرمن اور فرانسیسی اداروں کا فرانسیسی۔ اندریں حالات ملک میں
نوجوانوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو جائے گا جس کے خیالات و افکار میں تضاد ہوگا۔ ان میں سے
ہر ایک کی بولی اور انداز فکر اور طریق گفتگو مختلف ہوگا۔ وہ کبھی ایک مرکز پر جمع ہو کر ملک کی فلاح و بہبود
کے لیے سوچ بچار نہیں کر سکیں گے۔ آج قوم کو جس اشتراک اور تعاون کی ضرورت ہے وہ مفقود ہو
جائے گا۔ اس طرح ان بے شمار اداروں کا وجود قومی اور ملی مفاد کے منافی ہے۔ اس سے قومی تحریکوں
میں بے دلی اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کا خیال بڑی حد تک صحیح بھی ہے۔

قومی تعلیم | ان خیالات کے پیش نظر جو لوگ نئی قومی تحریکوں سے متاثر ہیں۔ انہوں نے ان اداروں میں اپنے بچوں کو پڑھانا چھوڑ دیا ہے۔ پچھلے پچیس تیس برس سے بیرونی مدرسوں کی وہ اہمیت باقی نہیں رہی۔ اب تو والدین اپنے بچوں کو معمولی تعلیم کے لیے بالعموم عوامی سرکاری اداروں میں بھیج دیتے ہیں۔ جہاں بچے ایک مقررہ نصاب کے مطابق تعلیم پاتے ہیں۔ یہ نصاب عربوں کی قومی اور ملی ضروریات کا حامل ہے۔ اب ہر ملک میں قومی تعلیم کا ایک نظام قائم ہو چکا ہے۔ وزارت معارف نصاب مقرر کرتی ہے کتابیں منظور کرتی ہے اور ہر سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی نگرانی کرتی ہے۔ اس لیے والدین اپنے بچوں کو انہی اداروں میں پڑھانے کے زیادہ آرزومند ہیں اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے اختتام پر ایک امتحان ہوتا ہے جس کا اہتمام وزارت معارف کا محکمہ تعلیم کرتا ہے۔ بیرونی مدرسوں کو مجبوراً اپنے طلبہ کو انہی خطوط پر چلانا پڑا اگر وہ ایسا نہ کریں تو طلبہ کی رہی سہی تعداد بھی ان کی طرف متوجہ نہ ہو کیوں کہ بغیر امتحان پاس کیے ہوئے انہیں کوئی ملازمت بھی تو نہیں مل سکتی۔

ہمارے ملک میں بڑے بڑے شہروں میں بیرونی مدرسے اور کالج موجود ہیں لیکن ان میں سے بیشتر کا نصاب اور طریقہ تدریس وہی ہے جو یونی ورسٹی نے مقرر کر دیا ہے۔ لیکن بعض ایسے ادارے بھی ہیں جہاں نہ تو ملک کے مروجہ نصاب کی تدریس کا انتظام ہوتا ہے اور نہ ان میں وہ قومی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نہ ایک آزاد شہری کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے بلکہ ان اداروں میں تعلیم و تربیت کا کچھ ایسا اہتمام ہوتا ہے کہ طلبہ کو مغربی بنانے کی دھن میں ان سے ان کی مشرقیت بھی چھین لی جاتی ہے۔ یہاں اسی طرح انجیل مقدس کی تدریس لازمی ہوتی ہے۔ اور طلبہ کو قرآن حکیم سے روشناس ہونے کا کبھی موقع نہیں ملتا۔ کیا ہم بھی ان اداروں کو اپنے میلانات کے مطابق چلنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتے؟

عبدالغفور چوہدری

بچو تم کہو گے یہ کون ہے ؟ بھئی میں ہوں ہڑپا کا بڑا دادا۔ بڑے دادا نہیں۔ بلکہ پڑدادا
اگر مجھے دیکھ پاؤ تو میری داڑھی کو دیکھ کر چھو لینے لگو اور میری گود میں آجاؤ، تو ا تمنے
اونچے چلے جاؤ کہ آسمان کے تاروں کو چھونے لگو۔ تم نے دادی اماں سے بہت سی کہانیاں
سنی ہوں گی۔ مگر آج بڑے دادا سے بھی ایک کہانی سن لو، بھئی جگ بیتی نہیں آپ بیتی سناتے
ہیں، یہ کہانی میں نے اپنے بڑے دادا سے سنی ہے، آج میں اس جگہ پر کھڑا ہوں جہاں
میرے بڑے دادا پانچ ہزار سال پہلے کھڑے تھے۔ آج تمہارے سامنے جو یہ ٹیلہ سا کھڑا
ہے یہاں ایک زمانے میں ایک بڑا شاندار شہر آباد تھا۔ تمہیں معلوم ہے کس زمانے کی بات
ہے۔ یہی کوئی پانچ ہزار سال پہلے کی۔

تم نے تاریخ میں سکندر اعظم کا نام تو ضرور سنا ہوگا، یہ شہر اس سے بھی کوئی پونے تین ہزار
سال پرانا ہے۔

ہڑپا پرانا تو تھا، مگر اس کی رونق کے کیا کہنے، آج کل کے بہت سے شہروں کو مات
یا تھا، وہ دیکھو شہر کے گرد کتنی چوڑی خندق اور فصیل بنی ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے جنہوں نے
نا اچھا شہر بنایا تھا تو اسے دشمنوں سے بچانا بھی ضرور ہوا۔ اس لیے اس کے گرد اتنی
بوط فصیل بھی بنائی۔ ان شہروں کے پرانے باشندے اپنے ملک کے ہیں۔ اگر تم ان کی جنگلوں
کہانی سنو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ پاکستان کے یہ پرانے باشندے اپنے وطن کی خاطر کس طرح
ن نثار کرتے تھے۔ میرے دادا نے وہ بھی دن دیکھے ہیں جب سکندر کی فوجوں نے
ب کے ایک شہر کو گھیر لیا تھا۔ سکندر کے مقابلے کا بھلا کسے حوصلہ ہو سکتا تھا۔ یہ

فاتح اعظم مصر، شام، ایران اور توران کو روندتا ہوا پنجاب میں پہونچا تھا۔ راستے میں کسی کو اس کے روکنے کی ہمت نہ ہوئی لیکن پاکستان کے پرانے شہریوں نے وہ جان توڑ کر مقابلہ کیا، کہ سکندر کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ ایک مرتبہ تو یہاں کے سپاہیوں میں ایسا گھرا کہ بال بال ہی بچا سپاہی آڑے نہ آجاتا تو اس کی خیر نہ تھی۔

آج تو یہاں چٹیل میدان میں ہی اکیلا رہ گیا ہوں اور ان کمبخت گدھوں کو بھی میرے سوا کہیں اور ٹھکانہ نہیں ملتا۔ لیکن ایک زمانے میں یہاں کے جنگلوں میں شیر ڈکارتے تھے۔ اور ہاتھی چنگھاڑتے تھے۔

تم کہو گے بڑے دادا پنجاب میں شیر کہاں سے آئے۔ واہ بھئی واہ کیا تم سمجھتے ہو کہ پنجاب کا یہ علاقہ ہمیشہ گنجی بار کی طرح ننگا منگا ہی رہا ہے۔ ارے بھئی ایک زمانے میں اس کے سر پر اس قدر بال تھے کہ کاٹے نہیں کٹتے تھے، یہ تو ادھر ہی آکر منڈا منڈا سا ہو گیا ہے۔

بابر کا نام تو تم نے سنا ہوگا۔ بھلا بابر کو پنجاب میں آئے ہوئے کتنے سال ہوئے ہوں گے یہی کچھ چار سو سال سے کچھ زیادہ، اس وقت جب بابر سندھ کے کنارے آیا تو اس کا دل تھکا تو للچایا، یہ ننھا سا بچہ تھا کیسے نہ للچاتا، دریائے سندھ پر پہونچا تو کنارے پر سرکنڈوں کے جنگل میں گینڈوں کے جھنڈ چرتے ہوئے نظر آئے۔ ایسے ہی گینڈے اور ہاتھی ہڑپا کے جنگلوں میں ہی گھومتے تھے اور جب سکندر اس علاقے سے آگیا تو وہ اپنے ساتھ کچھ پالتو شیر اور شیر ببر بھی لے گیا تھا۔

ہمارے بڑے دادا نانا تے تھے کہ ہڑپا کے لوگ بڑے زبردست کُتّے پالتے تھے ایسے کہ اگر شیر پر جھپٹ پڑیں تو ہوش بگاڑ دیں۔ ایک بار ہڑپا کا ایک شکاری جنگل میں گیا۔ تھوڑی دور ہی پہونچا تھا کہ کچھار سے شیر نکلا۔ اس نے اپنے کتے اس پر للکار دیے۔ کتوں نے جھپٹ کر پنجے اور دانت شیر کے جسم میں ایسے گاڑ دیے کہ بے چارہ بے بس ہو کر رہ گیا۔
مگر یہ کیا تم تو میری اس بات کو سن کر مسکرا دیے۔ بھئی ہم بھی تاڑ گئے۔ تم سمجھتے ہو کہ بڑھاپے میں

بڑے دادا کا دماغ چل گیا ہے۔ تبھی تو ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ اگر اعتبار نہ آئے تو ان مورخوں کے سفرنامے پڑھ لو جو سکندر کے ساتھ آئے تھے وہ کہتے ہیں کہ یہاں کے کتنے شیر پر اس تندی سے حملہ کرتے ہیں کہ خواہ ان کی ٹانگ کو چاقو سے کاٹ ہی کیوں نہ ڈالا جائے وہ مرتے دم تک اسے بغیر ہلاک کیے نہ چھوڑتے کے سائے میں شہر کے گوالے اپنے جانور لے کر آتے تھے۔

ہاں اس زمانے میں ہمارے بڑے دادا کہیں بھینسیں اور بیل جگالی اور کہیں اونٹ منہ سے جھاگ اٹھاتے تھے۔ کبھی کبھی سائے کی سڑک سے اپنے گدھے لے گزرتا تھا۔ ہمارا کسان بھی خوب ہے۔ ہم سینکڑوں سال سے ایک ہی جگہ جمے ہوئے ہیں۔

ان پر بڑی بڑی دلچسپ چیزیں لدی ہوئی تھیں۔ گیہوں۔ چاول۔ جو بھی کچھ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک کمہار گاڑی پر برتن لیے ہوئے جو گزرا۔ رنگ روپ کو دیکھ کر بڑے دادا سکتے میں آئے۔ کیسے پیارے پیارے رنگ اور کیسی چمک دمک کے برتن تھے۔

بات یہ تھی کہ اس زمانہ کے کمہار برتن بنانے ہی خوب تھے۔ یہ لوگ کٹورے پیالے تھالیاں بنانے تھے اور مٹکے تو اتنے بڑے بڑے تیار کرتے تھے کہ اگر ان میں آدمی بھی چھپ جائے تو کہیں پتہ نہ چلے۔ ان مٹکوں میں پانی تو کیا رکھتے۔ غلہ اور تیل وغیرہ جمع رکھنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

پاکستان بننے کے بعد کچھ کچھ ہونے لگا ہے۔ پانچ ہزار سال پہلے کسانوں کے گڈے ایسے ہی تھے جیسے آج کل کے۔ ان پر دھوپ سے بچنے کے لیے چھت ہوتی تھی۔ اور ان میں گھوڑے جتے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی بڑ کے سائے میں جنگل کے جانور بھی چلے آتے تھے۔ ہیں جنگل کے جانور! ارے بھائی معاف کرنا آج تو بیچ بیچ بات بات پر بھول ہو جاتی ہے۔ جنگلی جانور کہاں۔ جنگلی جانوروں کے کھلونے، شہر کے بچے کبھی کبھی بڑے دادا کے سایہ میں کھیلنے آ جاتے تو جنگلی بھینسے۔ گینڈے، شیر، بچھو۔ بندر، خرگوش سبھی قسم کے جانوروں کی قطاریں لگ جاتیں۔ ایک طرف بچے کھیلتے اور دوسری طرف بڑے زد کی بازیاں لگاتے تھے۔

ہمارے بڑے دادا کو شہر کے اندر جانے کا تو کبھی اتفاق نہیں ہوا لیکن جو لوگ راستہ چلتے ہوئے

ستانے کے لیے ٹھہر جاتے تھے ان کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ ہڑپا بڑا آباد شہر تھا۔ کھلے کھلے بازار دونوں طرف بدروئیں پکی اینٹوں سے ڈھکی ہوئی نالیاں گھروں میں فرش غسل خانے اور نالیاں سبھی کچھ بنے ہوئے تھے۔ اور بعض گھر تو ایسی شان کے تھے جیسے کوئی محل ہو اور پھر گھر بھی ایک منزل کے نہیں بلکہ کئی کئی منزل اونچے تھے۔ چھت پر سیڑھیاں چڑھاتے تھے تو اوپر کمرے اور برآمدے بناتے تھے ——— یہ لوگ تھے پرانے لیکن انہیں رہنے کا سلیقہ خوب آتا تھا۔ سردیوں میں کمروں کے اندر مٹی کی بنی ہوئی انگیٹھیاں جلاتے تھے اور کڑاکے کی دھوپ پڑتی تھی تو مکانوں کے نیچے بنے ہوئے تہ خانوں میں پہونچ جاتے تھے اور وہاں دوپہر کی گھڑیاں گذارتے تھے۔ ہمارے بڑے دادا کہا کرتے تھے کہ اگر تم کہیں ان کے کپڑے اور زیوروں کو دیکھ پاتے تو عش عش کر اٹھتے۔ آج کل کی بچیاں سمجھتی ہیں کہ فیشن کے سب پھول انہیں کے حصے میں آئے ہیں۔ لیکن یہاں کے لوگوں کے کپڑے دیکھتیں تو اپنا سب فیشن بھول جاتیں۔

اگر فرصت ہو تو عجائب گھر میں جا کر اس زمانے کے بت دیکھنا۔ ان سے ان کے کپڑوں کی نفاست کا پتہ چلے گا۔ اور ان کے کپڑے اتنے بھلے کیوں نہ ہوتے، بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں روئی تو سب سے پہلے پاکستان میں ہی پیدا ہوئی تھی اور اس روئی کے گالے تو کبھی کبھی ان گڈوں سے اٹ اٹ کر بڑے دادا کی داڑھی میں اٹک جاتی ہے تو وہ ایسے معلوم ہونے لگتے تھے جیسے ہڑپا کے ہی بڑے دادا ہوں ؞

(ریڈیو پاکستان سے نشر کیا گیا)

ماڈرن پولینڈ کا نظامِ تعلیم

شیخ نذیر احمد

پس منظر

دوسری جنگ عالمگیر کے بعد پولینڈ کو سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی ترقی کے زرّیں مواقع حاصل ہوئے۔ اٹھارھویں صدی کی ملکی تقسیم نے پولینڈ کی ثقافتی زندگی پر ضرب کاری لگائی تھی۔ موجودہ حد بندی کی رو سے اس میں اہم صنعتی مراکز اور خام مال کے پیدا کرنے والے مغربی علاقے شامل ہو گئے ہیں۔ دارالسلطنت وارسا جنگ عظیم کی ہولناک تباہ کاریوں کا ہدف بن کر راکھ کا ڈھیر نظر آتا تھا۔ یہی حشر اکثر و بیشتر شہروں کا ہوا تھا۔ آبادی ساڑھے تین کروڑ سے گر کر ڈھائی کروڑ رہ گئی اس واہی تباہی کے باوجود اہل پولینڈ کے عزائم بلند رہے۔ بڑی گرم جوشی سے تعمیری پروگرام پر عمل پیرا ہو کر اپنے نقصانات کی تلافی پر لگ گئے ہیں۔ غیر اقوام کی غلامی، زمانہ جنگ کی دہشت اور نازی ظلم و ستم نے نہ صرف انہیں اتحاد و یک جہتی کے رشتہ میں منسلک کر دیا ہے۔ بلکہ انہیں اپنی بلند ثقافتی میراث کا بھی احساس دلا دیا ہے۔ آج پولینڈ کے ارباب بست و کشاد کے سامنے ایک نصب العین ہے اور وہ یہ ہے کہ زرعی اور صنعتی انقلاب سے عوام کا معیار زندگی بلند کیا جائے۔

شش سالہ منصوبہ

۱۹۴۹ء میں شش سالہ صنعتی ترقی کے منصوبہ پر عمل شروع ہوا، اس نے ملک کی ہیئت بدل دی ہے۔ عوام کے لیے بہتر جائے رہائش، حفظان صحت کے لیے بہتر تنظیم اور ہر قسم کی تعلیمی سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ حصول تعلیم کے لیے عوام دیوانہ وار منہمک ہیں۔ ان کے سانئہ ارتباط سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ساری کی ساری قوم پڑھنے پڑھانے میں لگ گئی ہے۔ دفتروں اور کارخانوں کے ملازموں کو بہتر علمی اور فنی تعلیم کے اکتساب کے لیے ہر طرح کی سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔ الغرض تعلیمی ترقی کو اس شش سالہ منصوبہ میں کلیدی مقام حاصل ہے اس وقت قوم کے سامنے ایک بلند پروگرام ہے اور وہ جہالت کا خاتمہ کرنا ہے، وہ دن دور نہیں جبکہ ان کے

عوام علی جامہ پہن لیں۔

تعلیمی حالت قبل از جنگ اکثریت آبادی کے لیے صرف پرائمری اسکول تھے۔ اعلیٰ تعلیم صرف اُمراء کے طبقہ کے لیے مخصوص تھی۔ مزدوروں اور کسانوں کے بچوں کے لیے کوئی تسلی بخش انتظام نہ تھا۔ دیہات میں شہروں کی نسبت بہت کم تعلیمی مواقع حاصل تھے۔ نظری طور پر تو سات سے چودہ سالہ بچوں کے لیے تعلیم لازمی تھی لیکن عملی طور پر دس لاکھ سے زائد بچوں کے لیے پڑھائی کا کوئی بندوبست نہ تھا اور سولہ لاکھ دیہاتی بچے چار سالہ پرائمری اسکول میں معمولی نوشت و خواند کا ملکہ حاصل کرنے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ ان اسکولوں میں ہمارے دیہاتی پرائمری اسکولوں کی طرح چار جماعتوں کے لیے صرف ایک ہی معلّم کام کرتا تھا۔ اسکول جانے والے بچوں میں نصف سے بھی کم بچوں کو ہفت سالہ کورس کے اسکولوں میں داخلہ میسر آتا تھا۔ تقریباً بیس فی صد کے قریب آبادی بالکل کوری رہ جاتی تھی، غریب کسانوں کے بچوں کے لیے کسی مالی امداد کا کوئی اہتمام نہ تھا، اس لیے قوم کے بیحد محنتی اور ذہین بچے غربت و افلاس کا شکار ہو کر زیور تعلیم سے یکسر محروم رہ جاتے تھے۔

نازی یلغار نازی جور و استبداد نے اس تھوڑے بہت انتظام کا بھی شیرازہ بکھیر دیا، اسکولوں اور کالجوں کے پچیس ہزار کے قریب اساتذہ جاں بحق ہوئے۔ نازیوں نے پولش ثقافت کا قلع قمع کرنے کے لیے اعلیٰ تعلیمی مراکز کے دروازے بند کر دیے اور اُن کے کتب خانوں کو آگ کی نذر کر دیا، اس نقصان عظیم کی تلافی کے لیے اہل پولینڈ نے ایک عظیم الشان پروگرام مرتب کیا ہے جس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ تعلیمی مواقع کے لحاظ سے ہر کرہ مہ سے مساوی سلوک روا رکھا جائے۔

موجودہ نظام کا خاکہ سات سے چودہ سالہ بچوں کے لیے تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے جن اسکولوں میں انہیں پڑھایا جاتا ہے۔ انہیں بنیادی یا پرائمری اسکول کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ شہری اور دیہاتی علاقوں میں نرسری اسکول بھی تین سے سات سال کے

بچوں کے لیے موجود ہیں، اس بنیادی تعلیم کے بعد بچے چہار سالہ کورس کے لیے پرائمری اسکولوں میں جنہیں لائیکم (LYCEUM) کہتے ہیں چلے جاتے ہیں۔ اس کے مقابل فنی تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے چہار سالہ فنی تربیتی ادارے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ دو سالہ زراعتی یا پیشہ ورانہ تربیتی ادارے بھی قائم ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹیوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ جن کے مراتب یکساں ہیں اور ان کی ڈگریوں کی قدر وقیمت بھی برابر ہے۔

اصلاحی پروگرام

اس پروگرام کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے، پہلی منزل (سنہ ۱۹۴۶-۴۹ء) تین سال میں طے کی گئی۔ بہت سی شکستہ عمارات از سر نو تعمیر کی گئیں۔ ساڑھے چار ہزار نئے پرائمری اسکول کھولے گئے اور فوری ضروریات کے پورا کرنے کے لیے کافی تعداد میں فنی ادارے قائم کیے گئے، وہ لوگ جو اعلیٰ تعلیم کے حصول سے محروم تھے ان کے لیے تعلیمی مواقع بہم پہونچائے گئے اور مستحق طلبا کے لیے فیاضانہ مالی امداد مہیا کی گئی۔

موجودہ تعلیمی منصوبہ

موجودہ شش سالہ منصوبہ جس پر ۱۹۴۹ء میں عمل شروع ہوا، کا مقصد وحید یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو جہالت کو نیست و نابود کرکے ضیائے علم سے ہر کونے کو منور کر دیا جائے، غریب طبقہ محض اپنی غربت کی وجہ سے زیور تعلیم سے عاری نہ رہ جائے۔ پرائمری اور اعلیٰ تعلیم کے نصاب کو وسعت اور گہرائی دی گئی ہے، اس جدید نصاب کے تحت درسی کتب تیار کی گئی ہیں، فنی اور اعلیٰ علمی تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے ہر ممکن ذریعہ اختیار کیا جا رہا ہے۔

نرسری اسکول

جدید نظام تعلیم میں نرسری اسکولوں کا مقام بہت اہم ہے، ۱۹۵۵ء کے اختتام تک تین سے سات سال کے پانچ لاکھ ساٹھ ہزار بچوں کے لیے انتظام مکمل ہو جائے گا، یہ انتظام قومی ضرورت کے صرف چالیس فی صد حصہ کو پورا کرے گا۔ اگر کام اسی سرگرمی سے جاری رہا تو سنہ ۱۹۶۰ء تک سو فی صد بچوں کے لیے جگہیں مہیا ہو جائیں گی۔ رہائشی آبادی کی ہر نئی اسکیم میں نرسری اسکول کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وارسا کی تمام نئی آبادیوں میں ان ابتدائی اسکولوں کو امتیازی پوزیشن دی جا رہی ہے۔ اس سے دو فوائد پیش نظر ہیں، معترضین

بچوں کے لیے خوش گوار ماحول اور صحت مند مشاغل مہیا کیے جائیں اور ان کی ماؤں کو معاشرہ میں نقل و حرکت اور مفید مطلب شہری فرائض کی انجام دہی کے لیے کافی وقت مل سکے، وہ بچوں کے بار سے آزاد ہو کر دفتری یا دیگر کاروباری امور کو باحسن وجوہ نبھا سکیں، داخلہ کے وقت ان بچوں کو ترجیح دی جاتی ہے، جن کی مائیں کسی مفید شہری فریضہ کی انجام دہی پر معین ہیں، داخلہ کا فیصلہ کرنے کے لیے صدر معلم کے علاوہ اس قصبہ یا علاقہ کے تین ممتاز شہری مشاورتی کمیٹی بناتے ہیں جو حقیقی مستحق بچوں کے داخلہ کی جانچ پڑتال کرتے ہیں، اس طرح اسکول کے عملہ کو مقامی تعاون حاصل ہوتا ہے۔

اوقاتِ مدرسہ یہ مدرسے ساڑھے سات بجے صبح کھل کر ساڑھے تین بجے شام بند ہوتے ہیں پولینڈ کے دفتری اور دیگر کاروباری اوقات بھی یہی ہیں۔ لیکن اگر ماں کا دفتر یا کاروباری مقام جائے رہائش سے کافی فاصلہ پر واقع ہو تو بچے کو مدرسہ میں مشغول رکھنے کے لیے ایک زائد معلمہ کی خدمات سے استفادہ کیا جاتا ہے، بالعموم ہر اسکول میں چار معلمین کے علاوہ ایک صدر معلم ہوتا ہے۔

مشاغل نرسری اسکولوں میں رسمی طور پر پڑھنا لکھنا سکھایا نہیں جاتا، یہ ان مدرسوں کے فرائض منصبی میں شامل نہیں، ان مضامین کی تدریس کا باقاعدہ سلسلہ پرائمری اسکول سے شروع ہوتا ہے، ان ابتدائی اسکولوں میں بچوں کے لیے دلچسپ مشاغل پر ہی اکتفا کی جاتی ہے تاکہ وہ صحت مند ماحول میں رہ کر خوش گوار ابتدائی تاثرات سے ہم کنار ہوں۔

عمارت بالعموم نرسری اسکولوں کی عمارات یک منزلہ ہوتی ہیں، کسی جماعت میں تینتیس سے زائد بچے داخل نہیں کیے جاتے، داخلہ کے اس اصول پر کڑی نگرانی رکھی جاتی ہے، ہر طبقہ عمر کے لیے علیحدہ کمرہ جماعت معین ہوتا ہے، ان کمروں کے ساتھ غسل خانے وغیرہ موجود ہوتے ہیں۔ کمرے خوب کشادہ ہوتے ہیں، جن میں کھلے روشن دان اور دریچے لگے ہوتے ہیں۔ کمروں کا ماحول دلچسپ بنانے کے لیے انہیں رنگین جاذب نظر تصاویر سے مزین کیا جاتا ہے۔ ہر اسکول

کے ساتھ چھوٹے چھوٹے باغیچے بھی لگائے گئے ہیں، تاکہ اسکول کا ماحول صحیح معنوں میں بچوں کا باغ کہلانے کا مستحق ہو سکے۔ علاوہ ازیں بچوں کے کھیلنے کے لیے طرح طرح کے کھلونے فراہم کیے جاتے ہیں، تاکہ بچوں کا مدرسے کے ماحول کے ساتھ دلی لگاؤ پیدا ہو جائے۔ ان کے کھیلنے کودنے کے لیے بھی باحسن وجوہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے اسکول کے ماحول میں خرم و خورسند رہتے ہیں اور ماں کے لیے ہرگز اداس نہیں رہتے۔

اساتذہ کے لیے سہولتیں اسکول کے ماحول کے ساتھ اساتذہ کو وابستہ کرنے کے لیے اعلیٰ سہولتیں بہم پہونچائی جاتی ہیں۔ ہر اسکول کے ساتھ دو کمرے اساتذہ کے لیے مخصوص ہوتے ہیں، جن میں انہیں آرام کرنے کے لیے پلنگ اور دیگر ضروریات کی اشیا مہیا کی جاتی ہیں۔ ہر اسکول میں اپنا کچن موجود ہے، جس میں کھانے پینے کی چیزیں بافراط مل سکتی ہیں۔ دوپہر کا کھانا سب مل کر خوب مزے سے کھاتے ہیں۔ اسکول کے اوقات میں کھانے کا وقت پُربہار سماں پیدا کر دیتا ہے۔

رازِ درونِ خانہ اب ذرا اپنے گھر پر بھی نظر دوڑائیں، تاکہ ہمیں اپنے ارباب حل و عقد کی تعمیری سرگرمیوں کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ ان لوگوں کے اسکولوں کو ہم نے دیکھا ہے جنہوں نے جنگ عظیم کی ہولناک تباہ کاریوں کا سامنا کیا، کئی سال متواتر ان کے سر پر آگ برستی رہی اور وہ گوناگوں مصائب کا تختۂ مشق بنے رہے، بمقابلتہً ہم ان تمام آفات و بلیات سے مامون و محفوظ رہے لیکن ہمارے رہنماؤں کے مشاغل کچھ اور رہیں، اور قومی ضروریات کا تقاضا کچھ اور، جب تک یہ خرد جاہ پرستی، خود غرضی اور کنبہ پروری کے مہلک امراض کا شکار ہیں قومی دکھ کا مداوا نہیں کر سکتے۔

لاہور میں بچوں کے باغ لاہور میں اس وقت لڑکوں کے لیے ۹۱ اور لڑکیوں کے لیے ۵۰ نام نہاد پرائمری اسکول قائم ہیں۔ ان میں تقریباً چالیس ہزار لڑکے اور دس ہزار لڑکیاں زندگی کے ساتھ کھیلنے آتے ہیں۔ تقریباً دس ہزار طلبا اور پانچ ہزار

طالبات کے لیے کہیں کوئی جگہ نہیں۔ اکثر اسکولوں میں ڈبل شفٹ کا تجربہ زیرِ عمل ہے جہاں ہر شفٹ میں بچوں کو ڈھائی تین گھنٹے مقید رکھنے کے بعد گلی کوچوں کی گشت کے لیے آوارہ چھوڑ دیا جاتا ہے، وہ معلمین جو اپنی مالی مشکلات کی وجہ سے دونوں نشستوں میں کام کرنے پر مجبور ہیں پیسے ماہانہ الاؤنس حاصل کرتے ہیں۔ عمارات کی حالت ناگفتہ بہ ہے اس کا تذکرہ جس قدر کم کیا جائے اسی قدر بہتر ہوگا۔ کارپوریشن نے بیس متروکہ عمارات پر جبگل جما رکھا ہے اور بیس کے قریب زنانہ خانے کرایہ پر لے رکھے ہیں، باقی عمارات کارپوریشن کی اپنی تعمیر کردہ ہیں۔ ان تمام عمارات میں کھیلنا تو درکنار آسانی سے سانس لینا بھی مشکل ہے، مجموعی طور پر یہ متعفن ماحول قوم کے نونہالوں کی جڑیں کاٹنے کے لیے کافی سازگار ہے۔

راقم الحروف کو پرائمری اسکول دربار دتا صاحب کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا اس میں تقریباً نوسو کے قریب طلبا زیرِ تعلیم ہیں۔ اسکول کی عمارت صرف پانچ تاریک کمروں پر مشتمل ہے اور نوسو طلبا۔ جائے تنگ است و مردماں بسیار۔ ان کمروں میں بجلی کا انتظام سرے سے مفقود ہے۔ لہٰذا پنکھے لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اندازہ کیجیے اس قدر مکدر اور متعفن ماحول میں ننھے منے غنچوں کو جن کے ساتھ قوم کی ساری امیدیں وابستہ ہیں مقید رکھنا کتنا بڑا ظلم ہے بمغل پورہ، قلعہ لچھمن سنگھ اور مزنگ اسکولوں کی حالت بھی دربار اسکول سے چنداں بہتر نہیں، ان اسکولوں میں آرائشی سامان کو تو چھوڑیے ٹاٹ بھی میسر نہیں، اس ضمن میں تو کارپوریشن کے شاہکار مزنگ ہائی اسکول کی داستان بھی بڑی اندوہناک ہے۔ چھٹی ساتویں جماعت کے بچے تمازتِ گرما اور شدتِ سرما کے ایام میں کورے فرشوں پر پورے چھ گھنٹے روزانہ بیٹھنے پر مجبور رہیں۔ پھر اسکول جاتے ہوئے ان کے چہروں پر افسردگی اور پژمردگی کیوں عیاں نہ ہو۔ اس قید سے رخصت کے بعد ان بچوں کی خوشی کا منظر قابلِ دید ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے صاحبِ اقتدار اور صاحبِ ثروت حضرات کو فرصت کے چند اوقات عطا فرمائے، جبکہ وہ سیاسی الجھنوں

فراغت پاکر قوم کے ان نونہالوں کی زبوں حالی کا جائزہ لے سکیں۔

ان مدرسوں کے اساتذہ کی شکل و شباہت، ان کی مفلوک الحالی کی آئینہ دار ہے، دور سے صاف نظر آتا ہے کہ اگر یہ گردش دوران کا ستم رسیدہ گداگر نہیں تو مدرس ضرور ہوگا۔ معاشرے میں اسے جو مقام حاصل ہے محتاج بیان نہیں۔ پھر اس سے کسی موثر کام کی توقع کرنا عبث ہے،

خاتمہ کلام

اہل پولینڈ نے آزادی کے دس سالوں میں قوم کے اس تعمیری شعبہ میں معجزنما کام کر دکھایا ہے۔ حصول آزادی کے ہشت سالہ دور میں ہم نے جو کچھ کیا ہے اس کے مقابلے میں عشر عشیر ہے۔ لیکن ہمارا ان سے مقابلہ کیا، وہ مغرب کی ترقی یافتہ قوم ہیں ہم مشرق کے پسماندہ لوگ۔ ہم کچھ پرانی روش کے لوگ ہیں۔ ہماری گاڑی کچھ ایسی رفتار سے ہی چلتی ہے۔

تدریس جغرافیہ میں انسانی عنصر

نذیر احمد

متعلم استاد کو گردش دوری اور موسموں کے تغیر و تبدل پر سبق دیتے یہ تیسرا یوم تھا دن تھا۔ گلوب اور تختہ سیاہ پر کھینچی گئی شکلوں کی مدد سے وہ محور کے جھکاؤ اور سالانہ گردش کے نتائج پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈال چکے تھے۔ آج وہ سوالات کی مدد سے اپنی تدریس کے نتائج جانچ رہے تھے تختہ سیاہ پر شکلوں کے ذریعہ ۲۱ جون اور ۲۲ دسمبر کو زمین کی موسمی کیفیت ظاہر کی گئی تھی، دونوں شکلوں میں دائرہ روشنی و تاریکی کو مناسب رنگوں سے ظاہر کیا گیا تھا، استاد صاحب کو اپنی تدریس کے نتائج پر خوب بھروسہ تھا اور طلبہ کے جوابات عموماً اس بھروسہ کی تائید کرنے معلوم ہوتے تھے، اتنے میں نگران صاحب کمرے میں داخل ہوئے، استاد نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے پوچھا "اچھا تو یہ شکل ۲۱ جون کی کیفیت ظاہر کرتی ہے اس تاریخ کو سورج کہاں عموداً چمکتا ہے"؟ جواب! "خط سرطان پر" "تو بتاؤ اس دن شمالی نصف کرہ میں دن رات کی لمبائی کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟" جواب :- "دن بڑے ہوتے ہیں اور راتیں چھوٹی" "اور جنوبی نصف کرہ میں کیا کیفیت ہوتی ہے؟" جواب :- شمالی نصف کرہ کے بالکل الٹ، یعنی دن چھوٹے ہوتے ہیں اور راتیں بڑی"

متعلم استاد صاحب ان جوابوں سے بڑے مطمئن تھے۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے نگران کی طرف دیکھا۔ اس پر نگران صاحب نے جماعت کو مخاطب کر کے کہا "آپ لوگ زمین کی سالانہ گردش اور محور کے جھکاؤ کے نتائج اچھی طرح سمجھ گئے معلوم ہوتے ہیں، بھلا دیکھیں آپ انسانی زندگی پر اس کے اثرات کو بھی بخوبی سمجھ گئے ہیں یا نہیں۔ ہاں تو ابھی آپ میں سے ایک نے کہا تھا کہ ۲۱ جون کو شمالی نصف کرہ میں دن بڑے ہوتے ہیں اور راتیں چھوٹی اور

یہاں گرمی کا موسم ہوتا ہے، یہ جواب بالکل درست ہے۔ مگر یہ بتاؤ کہ کیا اس موسم میں شمالی نصف کرہ کے ہر نقطہ پر دن رات کی لمبائی بالکل ایک سی ہوتی ہے یا کم وبیش ؟ زیادہ وضاحت کے لیے اس سوال کو یوں سمجھو کہ کیا ۲۱ جون کو شمالی نصف کرہ میں ہر جگہ موسم ایک سا ہوتا ہے اور کیا مدراس۔ لاہور، کابل اور ماسکو میں دن رات کی لمبائی ایک سی ہوتی ہے ؟"

اس سوال نے جماعت کو کچھ مخمصے میں ڈال دیا۔ لڑکے کچھ دیر سوچتے رہے، پھر کچھ ہچکچاہٹ کے چند ہاتھ اوپر اٹھے، ان طلبہ نے پہلے سوال کا جواب تقریباً درست دیا ۲۱ جون کو شمالی نصف کرہ میں ہر جگہ موسم ایک سا نہیں ہوتا جوں جوں شمال کو جائیں موسم سرد ہوتا جاتا ہے لیکن دوسرے سوال کا جواب ساری جماعت میں سے کسی ایک نے بھی صحیح نہ دیا، سب نے یہی کہا کہ دن کی لمبائی ہر جگہ ایک سی ہوتی ہے، دن زیادہ سے زیادہ کوئی سولہ گھنٹے کا ہو جاتا ہے، اس کی لمبائی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے ؟

متعلم استاد صاحب کو یک دم احساس ہوا کہ انہوں نے جغرافیہ کو انسانی زندگی سے غیر متعلق اصولوں کے طور پر پڑھایا ہے، طلبہ ان اصولوں کی عملی کارفرمائی کو نہیں سمجھے۔ اب لڑکوں سے کہا گیا کہ اچھا ۲۱ جون کو دائرہ روشنی وتاریکی کی کیفیت دیکھو۔ کیا یہ ٹھیک قطب شمالی اور قطب جنوبی میں سے گذرتا ہے ؟ نہیں۔ یہ قطبوں میں سے نہیں گذرتا، قطب شمالی اس کی دائیں جانب بہت زیادہ سورج کی طرف جھکا ہوا ہے اور قطب جنوبی اس کی بائیں جانب سورج کی بالکل اوٹ میں ہے، خط استوا پر اس دائرے کی کیا کیفیت ہے ؟ یہ دائرہ خط استوا کو دو برابر حصوں میں بانٹتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں دن اور رات بالکل برابر ہیں، اب دیکھو کہ خط استوا سے جوں جوں شمال کو بڑھیں روشنی اور تاریکی کی نسبت میں کیا فرق پڑتا ہے ؟ شمالی نصف کرہ میں خط استوا سے اوپر جو خط بھی اس کے متوازی کھینچا جائے اس کا زیادہ حصہ روشنی میں ہے اور تھوڑا حصہ اندھیرے میں، روشنی کا یہ تناسب شمال کی طرف لگاتار بڑھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ ہم شمال میں ایک ایسے نقطے پر پہنچ جاتے ہیں جہاں خط استوا کے متوازی

کھینچا ہوا خط سارے کا سارا روشنی میں ہے۔ یہ خط اندھیرے کے دائرے سے بالکل باہر ہے۔

ان توجیہات کی عملی تعبیر کیا ہے؟ یہی نا کہ خطِ استوا پر دن رات بالکل برابر ہیں اس سے شمال میں جوں جوں آگے بڑھیں دن کی لمبائی بڑھتی جاتی ہے اور رات کی لمبائی گھٹتی جاتی ہے استوا پر دن رات بارہ بارہ گھنٹے کے ہیں۔ اس کے شمال میں ہر قدم پر دن کی لمبائی کچھ سیکنڈ بڑھتی ہے اور رات کی لمبائی گھٹتی ہے اور ان کا تناسب ۱۲ ! ۱۲ سے بدل کر ۱۳ ! ۱۱، ۱۴ ، ۱۰ ، ۱۵ / ۹ ، ۱۶ ، ۸ ! ۱۷ ، ۷ ! ۱۸ ، ۶ ! ۱۹ ، ۵ ، ۲۰ ! ۴ ، ۲۱ ! ۳ ، ۲۲ : ۲ اور ۲۳ ! ۱ کو جا پہونچتا ہے۔ اس سے اور آگے شمال کو کرۂ ارض کی شمالی چھت پر زمین کا وہ حصہ بھی آجاتا ہے جہاں سورج لگاتار مہینوں تک چمکتا ہے یعنی مہینوں تک وہاں رات نہیں پڑتی۔

نظامِ کائنات کے ان حیرت انگیز کرشموں کو لڑکوں نے غیر معمولی توجہ سے سنا۔ اب ان کے خیالات پوری شدت کے ساتھ ان انسانوں کے تصور میں لگے تھے جو ان عجیب و غریب مقامات میں بستے ہیں جہاں سورج مہینوں غروب نہیں ہوتا۔ آخر ایک نے کھڑے ہو کر پوچھا: —

"جناب! یہ مئی کا مہینہ ہے اور ماہ رمضان۔ ان دنوں بھی لاہور میں بہتیرے ایسے ہیں جن پر روزہ کی طوالت شاق گذرتی ہے، لیکن جہاں دن مہینوں لمبا ہو وہاں لوگ روزے کس طرح رکھتے ہیں؟"

استاد نے مسکرا کر کہا یہ سوال بہت معقول ہے۔ یہ درست ہے کہ مہینوں کھائے پیے بغیر رہنا عام انسانی طاقت سے باہر ہے لیکن ذرا دنیا کے نقشہ پر دیکھو کرۂ ارض کے انتہائے شمال اور جنوب میں وہ برخ بستہ خطے ہیں جہاں انسانی آبادی تقریبًا برائے نام ہے اور جو تھوڑے بہت انسان (اسکیمو لوگ) یہاں بستے بھی ہیں وہ اسلام کے پیرو نہیں کیوں کہ آج تک کسی مسلمان کو یہ توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ قرآن کا پیغام ان تک پہونچائے اگر اسکیمو مسلمان ہو جائیں تو یقینًا انہیں مہینوں لمبے روزے نہیں رکھنے ہوں گے، کیوں کہ

اسلام دین فطرت ہے اور وہ انسانوں سے کسی ایسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتا جو ان کی ہمت سے باہر ہو۔

جغرافیہ میں انسانی عنصر کے غیر متوقع طور پر داخل ہو جانے سے اب سبق کے موضوع میں بے انتہا دلچسپی پیدا ہو چکی تھی، طلبہ کے اذہان محور کے جھکاؤ کے درجے اور دوسرے مجرد مباحث سے آگے بڑھ کر انسانی زندگی کی بوقلمیوں کا نظارہ دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے دنیا کے برفانی منطقوں میں بسنے والوں کی زندگی کے متعلق طرح طرح کے سوال پوچھنے شروع کیے نگران صاحب کے ہاتھ میں نیشنل جیوگرافک میگزین کا تازہ پرچہ تھا۔ انہوں نے کہا دیکھیئے ۔ حسن اتفاق سے اس پرچے میں سفید برفانی چادر میں لپٹے ہوئے شمال کے دلچسپ موسمی حالات اور بعض سبق آموز مناظر دیے گئے ہیں۔ یہ مندرجات تمہارے اکثر سوالات کا پورا پورا جواب دیں گے۔

یخ بستہ شمال

شمالی امریکہ کا نقشہ دیکھو۔ کینیڈا کے انتہائے شمال میں بہت سے جزیرے بحر منجمد شمالی کے برفانی ویرانے میں بکھرے ہوئے ہیں ان جزیروں میں پانچ مختلف مقامات پر موسمیات کے ادارے قائم ہیں جو کینیڈا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مشترکہ نگرانی میں ہیں، موسمیات کے ان پانچ مرکزوں سے ہر چھ گھنٹے کے بعد کناڈا کے شہر ایڈمنٹن (واقع البرٹا) میں موسمی حالات کی اطلاع منتقل کی جاتی ہے اور یہاں سے یہ اطلاع دنیا بھر کے موسمی اداروں کو بھیجی جاتی ہے۔

گذشتہ اپریل میں نیشنل جیوگرافک میگزین کے کچھ نمائندے ونی پگ (کناڈا) سے پرواز کر کے ۰۰ ۷ میل شمال میں ان یخ بستہ جزیروں میں پہونچے جو ٹھیک دائرہ قطب شمالی کی دہلیز پر واقع ہیں، یہ سفر صرف ایک دن میں طے ہوا تھا۔ لیکن جوں ہی ان لوگوں نے طیارے سے باہر قدم رکھا انہیں یک دم یہ احساس ہوا کہ راتوں رات وہ ونی پگ کے موسم بہار سے نکل کر منجمد کر دینے والی سردی میں آ داخل ہوئے ہیں، جنوبی کینیڈا میں موسم بہار کی آمد آمد تھی شگوفے اور پھول

چھوٹنے کو تھے، ویز ویلیوٹ نامی مرکز موسمیات میں پارہ درجہ انجماد سے ۱۲ درجے نیچے تھا اور تیز برفانی ہوا کے جھونکوں کی کاٹ موٹے گرم کپڑوں کے باوجود ہڈیوں تک پہونچ رہی تھی۔ میلوں تک برف کے تودوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ برفانی جھکڑ برف کے تودوں کو جگہ جگہ اڑائے پھرتے تھے اور اگرچہ سورج لگاتار چمک رہا تھا برف کے اڑتے والے گالوں پر اس کی حرارت کا کچھ اثر نہ تھا۔ ادارہ موسمیات کی نارنجی رنگ کی عمارت سورج کی سنہری کرنوں میں چمک رہی تھی لیکن اس کا آدھا نچلا حصہ اڑنے والے برفانی تودوں نے جمع ہو ہو کر ڈھانپ رکھا تھا۔

اس یخ بستہ شمالی خطہ کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ سردی کی شدت کا یہ حال ہے کہ عام تیل یہاں شربت کی طرح گاڑھا ہوجاتا ہے، اس لیے انجنوں میں ایک خاص قسم کا ڈیزل تیل جلایا جاتا ہے جو اس سردی میں بھی اصلی حالت پر قائم رہتا ہے، پینے کا پانی جن نالیوں میں لایا جاتا ہے ان کے گرد ایک گرم غلاف چڑھا رہتا ہے، جہاں پانی میسر نہ ہو وہاں برف کو پگھلا کر پانی حاصل کیا جاتا ہے، یہ انتہائی شمالی خطہ دراصل ایک یخ بستہ صحرا ہے۔ یہاں آسمان سے گرنے والے پانی کی مقدار صحرائے اعظم سے زیادہ نہیں، یہ پانی زیادہ تر برف کی شکل میں گرتا ہے، ہوا کے جھکڑ اس برف کو مہینوں تک جگہ جگہ اڑائے پھرتے ہیں حتیٰ کہ مہینوں تک لگاتار چمکنے والے سورج کی گرمی اسے پگھلا دیتی ہے، سردیوں میں مہینوں لمبی رات کی سیاہ چادر اس خطے کو ڈھانپے رکھتی ہے، لیکن اس موسم میں مطلع صاف رہتا ہے۔

"آفتاب نیم شب" اس یخ بستہ خطے کی ایک عام خصوصیت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب باقی دنیا آدھی رات کے اندھیرے میں لپٹی ہوتی ہے یہاں اس وقت بھی سورج چمک رہا ہوتا ہے، مثلاً ایلس میئر نامی جزیرے کے مرکز موسمیات واقع ایلرٹ میں سورج لگاتار ۱۴۷ دن تک غروب نہیں ہوتا اور اس کی سنہری کرنیں برف اور یخ کے روپہلی چہرے پر عجب جگمگاہٹ پیدا کرتی ہیں۔

آفتاب نیم شب صرف انہی خطوں کا خاصہ نہیں جہاں رات مہینوں لمبی ہو۔ بلکہ

آدھی رات کا سورج ہر اس مقام پر دیکھا جا سکتا ہے جہاں رات کی لمبائی چوبیس گھنٹے یا اس سے زیادہ ہو۔ چنانچہ یورپ کے انتہائی شمالی عرض بلد دل (لیپ لینڈ) میں ہر سال ہزاروں لوگ آفتاب نیم شب کا تماشہ دیکھنے جاتے ہیں۔

کناڈا کے ان یخ بستہ جزیروں میں رسد و رسائل کا بڑا ذریعہ ہوائی راستہ ہی ہے۔ سال بھر کی خوراک اور تعمیر کا ساز و سامان زیادہ تر ہوائی جہازوں کے ذریعہ لایا جاتا ہے بعض جزیروں میں یخ پاش سمندری جہازوں کے ذریعہ بھی سامان لایا جاتا ہے۔

یہ یخ بستہ جزیرے عموماً دائرہ قطب شمال کے کئی میل اندر تک چلے گئے ہیں جو موسمیات کے جو مرکز یہاں کام کر رہے ہیں وہ دوسری عالمی جنگ کے بعد قائم ہوئے ہیں پہلے ان میں آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ کناڈا کی حکومت نے خود چند اسکیمو کنبوں کو یہاں لا کر آباد کیا تاکہ موسمیات کے مراکز کو ضرورت کے وقت مزدور مل سکیں۔ اسکیمو برف کے گھروں میں رہتے ہیں جو باہر سے دیکھنے میں یخ کے گول تودے دکھائی دیتے ہیں یہ مکان "اِگلو" کہلاتے ہیں، اس میں داخل ہونے کے لیے یخ کی سیڑھیاں نیچے اترتی ہیں اور ایک تنگ سرنگ میں سے گذر کر آگے وہ زمین دوز گھر آتا ہے جہاں اسکیمو ماں ریچھ کی کھال پر پاؤں پھیلائے اپنے بچوں کو لیے بیٹھی نظر آتی ہے۔ اس تہ خانے میں قطبی ریچھ کی چربی سے جلنے والا چراغ مدھم روشنی کرتا ہے۔ اور عموماً اسی جانور کا گوشت کھایا جاتا ہے۔

ان برفانی ویرانوں میں قطبی ریچھ، قطبی بھیڑیا، گاؤ مشک اور کتا خشکی کے جانور ہیں۔ وہیل سمندری جانور۔ انہی کے شکار پر اسکیمو لوگوں کی زندگی کا مدار ہے۔ موسمیات کے مرکزوں کی عمارتیں سردی کی مہینوں لمبی رات میں بجلی کی تیز روشنی سے منور رکھی جاتی ہیں تاکہ وحشی جانور قریب نہ پھٹکنے پائیں، پھر بھی بعض اوقات بھوک ان میں سے کسی نہ کسی کو اس انسانی مرکز کی طرف کھینچ لاتی ہے۔

قطب شمالی کے قریب قطب نما کی سوئی سمتیں معلوم کرنے میں مدد نہیں دیتی، یہ یا تو

ناکارہ ہو جاتی ہے اور یا جنوب کی طرف اشارہ کرنے لگتی ہے، چنانچہ ان بلند عرض بلدوں میں ہوائی اور جہاز ران سمتیں معلوم کرنے کے لیے دوسرے آلوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ان عرض بلدوں میں کشش ثقل میں بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ اگر خطِ استوا پر کسی آدمی کا وزن ۲۰۰ پونڈ ہو تو یہاں اس کا وزن بقدر ایک پونڈ بڑھ جائے گا۔

نقشے پر گرین لینڈ کا جزیرہ دیکھو۔ اس میں تھیول کا ہوائی اڈہ جو ریاستہائے متحدہ نے ڈنمارک کے مقبوضہ علاقے میں تعمیر کیا ہے۔ قطبی علاقہ میں اہم ترین فوجی مقام ہے۔ یہاں سے قطب شمالی صرف ۹۴۰ میل اوپر ہے اور یہ مقام ریاست ہائے متحدہ کے صدر مقام واشنگٹن اور روس کے صدر مقام ماسکو سے یکساں فاصلہ پر واقع ہے۔ تھیول میں بری، بحری اور ہوائی فوج کے لوگوں کی مزید تعلیم کا انتظام بھی موجود ہے۔ یہاں یونی ورسٹی آف میری لینڈ (ریاست ہائے متحدہ امریکہ) نے ایک شاخ کھول رکھی ہے۔ یونی ورسٹی ہر آٹھ سے سولہ ہفتوں کے بعد یہاں ایک نیا پروفیسر بھیج دیتی ہے جو تقریباً ایک سو طلبہ کو پڑھاتا ہے۔

نیشنل جیوگرافک میگزین کی مہیا کردہ ان معلومات کو طلبہ نے انتہائی توجہ سے سنا۔ اب ان کے لیے موسموں کے تغیر تبدل کی کہانی کوئی پھیکی اور بے معنی چیز نہ رہی بلکہ اس میں زندگی کا لوچ اور رنگ پیدا ہو گیا۔

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

یونیسکو کی پچھلے سال کی کارگذاریاں

پچھلے سال کے آخر تک اقوام متحدہ کے تعلیمی سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) کے تقریباً ساڑھے تین سو ماہرین ممبر ملکوں میں بھیجے گئے تھے۔ نیز تعلیم اور سائنس سے متعلق منصوبوں کو ۴۶ ملکوں میں عملی جامہ پہنایا جا رہا تھا ۲۸ منصوبے پایۂ تکمیل کو پہونچ چکے تھے اور ہر منصوبے کو جسے یونیسکو کے ماہرین نے شروع کیا تھا متعلقہ حکومتیں آگے چلا رہی تھیں۔

یونیسکو کے تعاون سے بنیادی تعلیم کا جو طبقاتی تربیتی مرکز یونیسکو کے شہر پٹز کوارو میں قائم ہے اس سے پچھلے سال جنوبی امریکہ کے ۱۲ میں سے ۸ ملکوں نے فائدہ اٹھایا۔ اب تک ۱۵۹ طلبا نے ۹ ماہ کا نصاب ختم کیا ہے اور اب وہ اپنی حکومتوں کے بنائے ہوئے بنیادی یا دیہی تعلیمی پروگراموں کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں، اسی دوران میں دس پاکستانی طلبہ کی ایک جماعت کو پٹز کوارو بھیجنے کے خاص انتظامات کیے گئے ہیں، وہاں سے واپس آنے کے بعد یہ طلبا پاکستان میں دس طبقاتی مرکزوں کو چلائیں گے جنہیں ریاست ہائے متحدہ کے امدادی پروگرام کے ماتحت کام کیا جا رہا ہے۔

مصر کے تربیتی مرکز میں داخلے کے لیے عربی بولنے والے تمام ملکوں نے بنیادی تعلیم کی تربیت کے لیے اپنی اپنی جماعتیں بھیجیں جو ۱۹۵۳ء کے آخر میں فارغ التحصیل ہوگئیں۔ علاوہ ازیں ۶ ممبر ملکوں نے اپنے ہاں یونیسکو کے تعاون سے تربیتی مرکز قائم کیے ہیں، تاکہ استادوں کو بنیادی تعلیم کے طریقے سکھائے جاسکیں۔ یہ ملک ہائیٹی۔ سیلون۔ فلپین۔ تھائی لینڈ۔ عراق اور لائبیریا ہیں۔

سرکاری مدرسوں کے تعلیمی نظام کا جہاں تک تعلق ہے یونیسکو نے پچھلے سال ممبر ملکوں کو امداد دینے کا خاص خیال رکھا ہے۔ بہت سی حکومتوں نے ملک بھر میں تعلیمی طریقوں کو نئے سرے سے منظم کرنے کے لیے

یونیسکو سے امداد طلب کی تھی اور ۱۹ ملکوں میں اب بھی سرکاری مدرسوں میں تعلیمی سہولتوں کو فروغ دینے کے لیے یونیسکو کی امداد دی جا رہی ہے۔

یونیسکو کے پاس پہونچنے والی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ حکومتیں خود بھی اس مسئلے پر خاص توجہ دے رہی ہیں۔ مثلاً بھارت نے اطلاع دی ہے کہ پچھلے سات سال میں پچاس لاکھ مزید بچے ابتدائی مدرسوں میں داخل کیے گئے ہیں۔ ہائی اسکولوں میں طلبا کی تعداد تیس لاکھ سے ساٹھ لاکھ ہو گئی ہے۔ مدرسوں کی تعداد دوگنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے اور تعلیمی بجٹ کو ۴ کروڑ ۵۰ لاکھ سے بڑھا کر ۳۰ کروڑ کر دیا گیا ہے۔

علوم طبعی کے میدان عمل میں یونیسکو کی سب سے اہم کامیابی یہ ہے کہ یونیسکو کے ایما سے ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے سالماتی تحقیقات کا ایک یوروپین مرکز قائم کر لیا گیا ہے۔ معاہدے کی توثیق ہو چکی ہے اور مرکز کے قیام میں یہ دس یوروپین ملک شامل ہیں۔ بلجیم، ڈنمارک، فرانس، جمہوریۂ جرمنی یونان، نیدرلینڈز، ناروے، سویڈن، سوئٹزرلینڈ اور برطانیہ، ان کے علاوہ اٹلی اور یوگوسلاویہ نے بھی معاہدے پر دستخط کیے ہیں، پچھلے سات سال کا خرچ جو تقریباً ۴ کروڑ ڈالر ہوگا مرکز میں شامل ہونے والی قومیں برداشت کریں گی، کیوں کہ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ غیر فوجی مقاصد کے اعتبار سے سالماتی قوت کی بنیادی ماہیت معلوم کرنے کے لیے وہ اپنے وسائل جمع کریں گی۔

سائنسی معلومات جمع کرنے کا ایک مرکز میکسیکو میں قائم کیا گیا ہے جس کے قیام میں یونیسکو کے ماہرین نے تین سال تک خدمات انجام دی ہیں۔ وہاں جنوبی امریکہ کے ملکوں کے طلبا نے اطلاعات جمع کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے طریقے سیکھے ہیں، ایسے ہی مرکز یونیسکو کے تعاون سے بھارت، یوگوسلاویہ، اروگوئے اور مصر میں بھی قائم ہوتے ہیں۔

سائنسی تحقیقات کے پروگراموں کو جو صنعتی ترقی کے لیے ضروری ہیں ۱۴ ملکوں میں عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ نیز سائنسی تعلیم کو رائج کرنے اور ترقی دینے میں یونیسکو کے ماہرین ۱۵ ملکوں کو امداد دے رہے ہیں ٭

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجسال —— —— شعبۂ مدارس

ای/۳۸۵۸ محمد صدیق ایس، وی منشی فاضل (۶۰ — ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ پرائمری اسکول
۱۸ مئی ۱۹۵۵ء چوبرجی باغ لاہور کو ۴ جون ۱۹۵۵ء سے م نثار قطب کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور مقرر کیا گیا۔

〃 م نثار قطب منشی فاضل۔ او۔ ٹی میٹرک (۶۰ — ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور کو ۴ جون ۱۹۵۵ء سے م۔ محمد صدیق کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ پرائمری اسکول چوبرجی باغ لاہور مقرر کیا گیا۔

ای/۳۷۸۳ محمد انور ایس۔ وی۔ منشی فاضل (۶۰ — ۱۴۰) قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
۱۷ مئی ۱۹۵۵ء ڈھکانہ کو تاریخ حاضری سے م عبدالمجید خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے قائم مقام اردو مدرس قصور مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ عبدالمجید خاں ایس، وی اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول قصور کو تاریخ حاضری سے م محمد انور کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ڈھکانہ مقرر کیا گیا۔

ای/۷۳۹۸ م۔ سعید رسول ایس، وی اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول نئی جھنگ کو تاریخ حاضری
۵ مئی ۱۹۵۵ء سے م ہولابخش کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول منٹھاٹوانہ مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ مولابخش ایس وی (۶۰ — ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول منٹھاٹوانہ کو تاریخ حاضری سے م۔ سعید رسول کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر

اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول فتح جنگ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۷۷/۷ م۔ غلام رسول ایف اے سی۔ ٹی (۹۰ — ۱۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ
۲۰ امئی ۱۹۵۵ء ہائی اسکول کھوچال کلاں کو تاریخ حاضری سے م۔ شیر اخاں کی جگہ جن کا تبادلہ
ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول لقہ مقرر کیا گیا۔

" م۔ شیر خاں بی۔ اے، بی، ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
لقہ کو تاریخ حاضری سے م۔ غلام رسول کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر
انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کھوچال کلاں مقرر کیا گیا۔

ای/۲۰۰/۷ س۔ نیاض حسین شاہ بی۔ اے، بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس
۲۰ امئی ۱۹۵۵ء گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی گھیب کو تاریخ حاضری سے ش۔ محمد عبداللہ کی جگہ
جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ
مقرر کیا گیا۔

" ش۔ محمد عبداللہ۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس
گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ کو تاریخ حاضری سے س۔ نیاض حسین شاہ کی جگہ
جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی گھیب
مقرر کیا گیا۔

ای/۲۰۷/۷ م۔ عبدالمجید شاہ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
۲۰ امئی ۱۹۵۵ء شاہ پور صدر کو تاریخ حاضری سے ایک موجودہ آسامی پر اور اپنی تنخواہ پر انگریزی
مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو مقرر کیا گیا۔

ای/۲۴۰/۷ م۔ ولی محمد (۶۰ — ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو کو تاریخ حاضری
۲۰ امئی ۱۹۵۵ء سے م۔ محمد حیات کی جگہ جو حاضر نہیں ہوئے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ
ہائی اسکول سرگودھا مقرر کیا گیا۔

ای/۶/۴۰۷ م۔ محمود شاہ (۶۰ ـ ـ ۱۴۰) ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ پور صدر کو تاریخ
۴ امئی ۵۵ء حاضری سے م۔ محمد حنیف کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ورزش ماسٹر
گورنمنٹ ہائی اسکول للّٰہ مقرر کیا گیا۔

" م۔ محمد حنیف (۶۰ ـ ـ ۱۴۰) ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول للّٰہ کو تاریخ
حاضری سے م۔ محمد حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ورزش ماسٹر
گورنمنٹ ہائی اسکول حسن ابدال مقرر کیا گیا۔

" م۔ محمد حسین (۶۰ ـ ـ ۱۴۰) ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول حسن ابدال کو تاریخ
حاضری سے م۔ محمد شاہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ورزش ماسٹر
گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ پور صدر مقرر کیا گیا۔

ای/۱۰/۴۱۰ م۔ نور محمد۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ـ ـ ۲۵۰) سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول
۴ امئی ۵۵ء عیسیٰ خیل کو تاریخ حاضری سے م۔ عطاء الرحمٰن کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
اپنی تنخواہ پر سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول میاں والی مقرر کیا گیا۔

" م۔ عطاء الرحمٰن۔ بی۔ ایس۔ سی۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ـ ـ ۲۵۰) سائنس ماسٹر گورنمنٹ
ہائی اسکول میاں والی کو تاریخ حاضری سے م۔ نور محمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
اپنی تنخواہ پر سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول عیسیٰ خیل مقرر کیا گیا۔

ای/۸/۴۰۸ م۔ بشیر محمد (۶۰ ـ ـ ۱۴۰) ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول عیسیٰ خیل کو تاریخ حاضری
امئی ۵۵ء سے م۔ سعید جلال کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ
ہائی اسکول میاں والی مقرر کیا گیا۔

" میاں سعید جلال (۶۰ ـ ـ ۱۴۰) ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول میاں والی
کو تاریخ حاضری سے م۔ سردار محمد کی جگہ جن کا تبادلہ قسمت ملتان میں ہو چکا ہے اپنی
تنخواہ پر ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول مٹھا ٹوانہ مقرر کیا گیا۔

ای/۱۳/۴۲۷ م۔ مجید احمد (۶۰ - ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا کو تاریخ حاضری ۲۴ اپریل ۵۵ء سے م۔ غلام حیدر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ پور صدر متقرر کیا گیا۔

" م۔ غلام حیدر ایس۔ وی (۶۰ - ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ پور صدر کو تاریخ حاضری سے م۔ مجید احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا متقرر کیا گیا۔

" م۔ فضل الٰہی اٹک ایس۔ وی (۶۰ - ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد رفیق شاہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ متقرر کیا گیا۔

" م۔ محمد رفیق شاہ ایس۔ وی (۶۰ - ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ کو تاریخ حاضری سے م۔ فضل الٰہی اٹک کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم متقرر کیا گیا۔

ای/۶۳۱۸ م۔ غلام نبی قاضی (۲۵۰ - ۳۵۵) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول مٹھا ٹوانہ ۳۰ اپریل ۵۵ء کو تاریخ حاضری سے مسٹر آل نبی کی جگہ جن کا تبادلہ لائل پور ٹیکنیکل اسکول میں ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا متقرر کیا گیا۔

ای/۳۱۳۲ م۔ محمد سعید ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں کو جن کے تبادلہ کے احکام ۲۹ اپریل ۵۵ء شیخوپورہ کے لیے جاری ہو چکے تھے م۔ عبدالواحد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں متقرر کیا گیا۔

" م۔ عبدالواحد (۶۰ - ۱۴۰) ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد سعید کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ متقرر کیا گیا۔

ای/۳۰۲۵ م۔ محمد انور قریشی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
۲۵ اپریل ۵۵ء پسرور کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد رشید فریدی کی جگہ جو ڈیرہ غازی خاں میں صدر معلم مقرر ہو چکے ہیں اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول سیالکوٹ مقرر کیا گیا۔

ای/۳۱۲۲ م۔ فضل کریم (۱۵۰ — ۲۵۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ کو تاریخ
۲۸ اپریل ۵۵ء حاضری سے م۔ محمد سعید رانا کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال مقرر کیا گیا۔

" م۔ محمد سعید رانا ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال کو تاریخ حاضری سے م۔ فضل کریم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۷۰۹ ملک شفیق احمد (۶۰ — ۱۴۰) ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال کو تاریخ
۱۳ اپریل ۵۵ء حاضری سے جن کی خدمات ختم کرنے کی سفارش کی جا چکی ہے، ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور مقرر کیا گیا۔

" رانا محمد اقبال ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے ملک شفیق احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ۔/۶۰ روپے ماہوار بریج الاؤنس قائم مقام ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال مقرر کیا گیا۔

ای/۲۲۲۰ م۔ محمد حسین آزاد (۶۰ — ۱۴۰) قائم مقام ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول
۲۸ مارچ ۵۵ء باغبانپورہ کو تاریخ حاضری سے عبدالواحد چوہدری کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شرقپور مقرر کیا گیا۔

" م۔ عبدالواحد چوہدری (۶۰ — ۱۴۰) ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شرقپور کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد حسین آزاد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول باغبانپورہ مقرر کیا گیا۔

ای/ ۵۹۷ م۔ وزیر خان سالار ایس۔ وی (۶۰ -- ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
۲۳ فروری ۵۵ء مری کو جن کے تبادلہ کے احکام کہوٹہ کے لیے جاری ہو چکے تھے ۱۸ دسمبر ۵۴ء سے
۹ فروری ۵۵ء تک م۔ عبدالکریم کی جگہ جن کی تقرری ہوئی تھی مگر حاضر نہیں ہوئے
اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ پور صدر مقرر کیا گیا۔

" وزیر خان سالار ایس۔ وی (۶۰ -- ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ پور صدر
کو تاریخ حاضری سے م۔ بشیر دین کی جگہ جو مستعفی ہو چکے ہیں اپنی تنخواہ پر اردو مدرس
گورنمنٹ ہائی اسکول مری مقرر کیا گیا۔

" م۔ عبدالرؤف، میٹرک ایس وی ایک امیدوار کو جن کی تقرری کے احکام گورنمنٹ
ہائی اسکول شاہ پور صدر کے لیے جاری ہو چکے تھے، تاریخ حاضری سے م۔ غلام سرور
کی جگہ جن کا تبادلہ مری ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
کہوٹہ مقرر کیا گیا۔

ای/ ۱۲۶۷ م۔ ظہور مہدی ایس۔ وی (۶۰ - ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پھالیہ کو
۱۸ فروری ۵۵ء جن کی تقرری کے احکام گجرانوالہ کے لیے جاری ہو چکے تھے یکم مارچ ۱۹۵۵ء
کے بعد کی تاریخ حاضری سے م۔ محمد حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر
اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی بھٹیاں مقرر کیا گیا۔

" م۔ محمد حسین، ایس۔ وی (۱۵۰ - ۵۰ ") اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول "
پنڈی بھٹیاں کو تاریخ حاضری سے م۔ ظہور مہدی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی
تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول گجرانوالہ مقرر کیا گیا۔

ای/ ۱۴۹۱ م۔ محمد اصغر قائم مقام معلم دست کاری گورنمنٹ ہائی اسکول گجرانوالہ کو تاریخ حاضری
یکم فروری ۵۵ء سے م۔ تاج محمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام ڈرائنگ ماسٹر
گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی بھٹیاں مقرر کیا گیا۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دوھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل
آموزش
۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

شمارہ ۲] لاهور [مئی ۱۹۵۵

اس شمارہ میں

تحریر { پروفیسرسراج الدین
پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی

معاونین { عبدالغفور چودھری
فضل احمد

یمی ماہنامہ

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
07 AUG 1956

آموزش
لاہور

مئی ۱۹۵۵ء

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

ر ——— ۸
ره ——— ۲

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر، ایچ، ڈی، رخالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

اداریہ

ایم۔اے۔ مخدومی

پنجاب یونی ورسٹی کے ضمنی (سپلیمنٹری) امتحانات کو ختم کرنے کے لیے حال ہی میں جو تجویز پیش ہوئی تھی اس کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا ہے، یہ امر قدرتی ہے کہ طلبہ کو عرصہ سے جو خاص رعایت حاصل تھی اس کے کھوئے جانے کا خطرہ ان میں بے چینی پیدا کرے، لیکن ان وقتی جذبات سے قطع نظر اس تجویز کے نتائج دور رس ہیں، امتحانوں کی نوعیت اور ان کا طریق ایسے معاملات ہیں جو تعلیم کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، اس لیے اس مسئلہ پر خالص تعلیمی نقطۂ نگاہ سے غور کیا جانا چاہیے۔

اس تجویز کے پیش نظر کونسا مقصد ہے؟ صریح طور پر مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ امتحانی چھلنی کے سوراخوں کو اور تنگ کر دیا جائے تاکہ صرف حقیقی قابلیت کے طلبہ ہی اس میں سے گذر سکیں، اگر یہ درست ہے تو مجوزہ صورت نہ صرف عجیب ہے بلکہ اس کی افادیت بھی مشکوک ہے یقینی طور پر اعلیٰ تعلیم کی غایت یہ ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے رہنما تیار کیے جائیں، لیکن مہذب دنیا میں کہیں بھی اس تیاری کو کڑی ذہنی ورزش کے مترادف نہیں بنایا گیا۔ اس کے برعکس ترقی پسند ملکوں میں یونی ورسٹی کے طلباء کو ہر ممکن سہولت بہم پہونچائی جاتی ہے کہ وہ اپنی اپنی رفتار پر کام کریں، جو طلبا باقاعدہ جماعتوں میں شامل ہو کر ڈگری کے نصاب کی شرائط پوری نہیں کر سکتے انہیں اجازت ہوتی ہے کہ گرمائی نصابوں میں شامل ہو کر ایسا کریں بعض امتحانوں کی

صورت میں اس امر کی بھی اجازت ہوتی ہے کہ کئی سالوں تک گرمائی نصابوں میں شرکت کر کے آہستہ آہستہ مختلف مضامین کے مقررہ کورس ختم کر لیے جائیں اور یوں ڈگری حاصل کر لی جائے۔ یہ طریق کار صحت مند تعلیمی اصولوں کے عین مطابق ہے۔ اول درجہ کی قابلیت کی دریافت اور نشو ونما کے لیے تعلیم کو اس کے سوا چارہ نہیں کہ دامن تلاش کو دور دور تک پھیلائے۔ اس کی عملی صورت یہ ہے کہ جو لوگ علم و اکتساب کی پیاس رکھتے ہیں انہیں ہر جائز سہولت دی جائے۔

اگر ترقی یافتہ ملکوں کا نقشہ یہ ہے تو ہمارے ملک کا مفاد اس میں ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اعلیٰ تعلیم کی نسبتاً محدود سہولتوں کو محدود تر کر دیا جائے۔ ہماری سماجی زندگی کی بڑی لعنت معاشی احتیاج ہے۔ اس کی بدولت بے شمار جوہر قابل ضائع ہو جاتے ہیں۔ ضمنی امتحانوں کا وجود بعض ایسے طلبہ کے لیے معاشی سہارے کے مترادف ہے جو بصورت دیگر ناہمواری کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے اور عالم یاس میں جد و جہد کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

اس سے کسی کو انکار نہیں کہ تعلیمی معیاروں کو بہتر بنانا ایک شدید ضرورت ہے۔ لیکن یہ ضرورت موجودہ نصابوں اور مروجہ طریقہ ہائے تدریس کی اصلاح سے پوری ہونی چاہیے۔ یہ مثبت اور تعمیری علاج ہیں۔ تعلیمی مواقع کو محدود کرنا ایک منفی علاج ہے جو نہ صرف ہمارے مخصوص حالات کے ناموافق ہے بلکہ تعلیمی طور پر بھی غلط ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

روس کے صنعتی انقلاب میں
تعلیم کا حصّہ

فضل احمد

انیسویں صدی کے آغاز میں انگلستان جس دور رس صنعتی انقلاب میں سے گذرا تھا، جدید روس آج ٹھیک اسی قسم کے صنعتی انقلاب میں سے گذر رہا ہے، زیادہ دیر کی بات نہیں کہ روس خالصتہً ایک زرعی ملک تھا۔ آج بھی روسی اپنے آپ کو "دہقانوں کی قوم" کہہ کر پکارتے ہیں، لیکن پچھلی چوتھائی صدی میں دہقانوں کی اس قوم نے جس عزم و پامردی کے ساتھ ملک میں بھاری صنعتوں کو ترقی دی ہے اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ انگلستان کا صنعتی انقلاب کسی سوچے سمجھے منصوبے کی پیداوار نہ تھا، بلکہ قدرتی حالات کا نتیجہ تھا، جرمنی امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں نے انگلستان کی دیکھا دیکھی جدید صنعتوں کو ترقی دی، اس غرض کے لیے انہوں نے منصوبہ بندی اور ملکی صنعتوں کے تحفظ کو ذریعہ بنایا، لیکن جرمنی اور امریکہ کے لوگ ذہنی طور پر صنعتی انقلاب کے لیے بالکل تیار تھے، اس کے برعکس روسی عوام صدیوں سے جہل و افلاس اور استبداد کی جن بھاری زنجیروں میں جکڑے چلے آتے تھے انہوں نے ان سے قوت فکر قریبًا قریبًا سلب ہی کر لی تھی، دہقانوں کی اس قوم کو یہ ممکن ہی نظر نہ آتا تھا کہ وہ کبھی صنعتی میدان میں دوسری مغربی قوموں کے ہم دوش ہو سکتی ہے، مگر آج یہ ناممکن چیز ممکن بن چکی ہے، صنعتی طور پر آج روس خود مکتفی ہے، اس کی بھاری صنعتیں تمام ملکی ضرورتیں پورا کرنے کے قابل ہیں، اکتوبر ۱۹۵۵ء میں ایک برطانوی پارلیمانی وفد روس کے دورہ پر گیا تھا، اس میں قدامت پسند رکن پارلیمنٹ مسٹر پی۔ جے۔ ایرول بھی شامل تھے جو کئی برطانوی انجینئرنگ کمپنیوں کے ڈائرکٹر ہیں، جب یہ وفد ماسکو کے زیر زمین ریلوں کے جال کا ملاحظہ کر چکا تو ان کے روسی رہنما نے کہا "یہ زیر زمین ریل دہقانوں کی قوم کے لیے بری نہیں" رہنما کو اس کسر نفسی کی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ خوبی اور نفاست کے اعتبار سے ماسکو کی زیر زمین ریل

صورت میں اس امر کی بھی اجازت ہوتی ہے کہ کئی سالوں تک گرمائی نصابوں میں شرکت کر کے آہستہ آہستہ مختلف مضامین کے مقررہ کورس ختم کر لیے جائیں اور یوں ڈگری حاصل کر لی جائے ۔ یہ طریق کار صحت مند تعلیمی اصولوں کے عین مطابق ہے ۔ اول درجہ کی قابلیت کی دریافت اور نشو و نما کے لیے تعلیم کو اس کے سوا چارہ نہیں کہ دامن تلاش کو دور دور تک پھیلائے ۔ اس کی عملی صورت یہ ہے کہ جو لوگ علم و اکتساب کی پیاس رکھتے ہیں انہیں ہر جائز سہولت دی جائے ۔

اگر ترقی یافتہ ملکوں کا نقشہ یہ ہے تو ہمارے ملک کا مفاد اس میں ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اعلیٰ تعلیم کی نسبتاً محدود سہولتوں کو محدود تر کر دیا جائے ، ہماری سماجی زندگی کی بڑی لعنت معاشی احتیاج ہے ، اس کی بدولت بے شمار جوہر قابل ضائع ہو جاتے ہیں ، ضمنی امتحانوں کا وجود بعض ایسے طلبہ کے لیے معاشی سہارے کے مترادف ہے جو بصورت دیگر ناہمواری کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے اور عالم یاس میں جد و جہد کو چھوڑ بیٹھتے ہیں ۔

اس سے کسی کو انکار نہیں کہ تعلیمی معیاروں کو بہتر بنانا ایک شدید ضرورت ہے ، لیکن یہ ضرورت موجودہ نصابوں اور مروجہ طریقہ ہائے تدریس کی اصلاح سے پوری ہونی چاہیے ، یہ مثبت اور تعمیری علاج ہیں ، تعلیمی مواقع کو محدود کرنا ایک منفی علاج ہے جو نہ صرف ہمارے مخصوص حالات کے ناموافق ہے بلکہ تعلیمی طور پر بھی غلط ہے ۔

(انگریزی سے ترجمہ)

روس کے صنعتی انقلاب میں
تعلیم کا حصّہ

فضل احمد

انیسویں صدی کے آغاز میں انگلستان جس دور رس صنعتی انقلاب میں سے گذرا تھا، جدید روس آج ٹھیک اسی قسم کے صنعتی انقلاب میں سے گذر رہا ہے، زیادہ دیر کی بات نہیں کہ روس خالصتہً ایک زرعی ملک تھا۔ آج بھی روسی اپنے آپ کو "دہقانوں کی قوم" کہہ کر پکارتے ہیں، لیکن پچھلی چوتھائی صدی میں دہقانوں کی اس قوم نے جس عزم و پامردی کے ساتھ ملک میں بھاری صنعتوں کو ترقی دی ہے اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، انگلستان کا صنعتی انقلاب کسی سوچے سمجھے منصوبے کی پیداوار نہ تھا، بلکہ قدرتی حالات کا نتیجہ تھا، جرمنی امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں نے انگلستان کی دیکھا دیکھی جدید صنعتوں کو ترقی دی، اس غرض کے لیے انہوں نے منصوبہ بندی اور ملکی صنعتوں کے تحفظ کو ذریعہ بنایا، لیکن جرمنی اور امریکہ کے لوگ ذہنی طور پر صنعتی انقلاب کے لیے بالکل تیار تھے، اس کے برعکس روسی عوام صدیوں سے جہل و افلاس اور استبداد کی جن بھاری زنجیروں میں جکڑے چلے آتے تھے انہوں نے ان سے قوت فکر قریبًا قریبًا سلب ہی کر لی تھی، دہقانوں کی اس قوم کو یہ ممکن ہی نظر نہ آتا تھا کہ وہ کبھی صنعتی میدان میں دوسری مغربی قوموں کے ہم دوش ہو سکتی ہے، مگر آج یہ ناممکن چیز ممکن بن چکی ہے، صنعتی طور پر آج روس خودمکتفی ہے، اس کی بھاری صنعتیں تمام ملکی ضرورتیں پورا کرنے کے قابل ہیں، اکتوبر ۱۹۵۵ء میں ایک برطانوی پارلیمانی وفد روس کے دورہ پر گیا تھا، اس میں قدامت پسند رکن پارلیمنٹ مسٹر پی بی۔ ایڈول بھی شامل تھے جو کئی برطانوی انجینئرنگ کمپنیوں کے ڈائرکٹر ہیں، جب یہ وفد ماسکو کے زیر زمین ریلوں کے جال کا ملاحظہ کر چکا تو ان کے روسی رہنما نے کہا "یہ زیر زمین ریل دہقانوں کی قوم کے لیے بری نہیں" رہنما کو اس کسر نفسی کی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ خوبی اور نفاست کے اعتبار سے ماسکو کی زیر زمین ریل

لندن اور نیویارک کی زیر زمین ریلوں سے کسی طرح پیچھے نہیں، یہ زیر زمین ریل دراصل اس ہمہ گیر صنعتی انقلاب کی ایک منہ بولتی تفسیر ہے جو روس میں کوئی چوتھائی صدی پہلے شروع ہوا تھا اور آج تک جاری ہے۔ اس انقلاب کے متعلق اہم ترین بات یہ ہے کہ عام روسی اس کا ذکر بڑی سرگرمی کے ساتھ کرتے ہیں، وہ بجا طور پر اس قومی کارنامے پر بڑا فخر کرتے ہیں، گو کہ کئی سال تک روسی عوام ان عام مصنوعات سے محروم رہے جو مغربی ملکوں میں زندگی کا لازمہ سمجھی جاتی ہیں۔ اس عرصہ میں تمام قومی وسائل قوت کے اسٹیشنوں برقی بھٹیوں اور فولاد کے کارخانوں کی نذر ہو رہے تھے۔ اگرچہ آج بھی بھاری صنعت کی پیش قدمی پہلے کی طرح جاری ہے۔ لیکن اب عام استعمال کی چیزیں بھی دکانوں میں آنے لگی ہیں۔

تعلیم کے مقاصد صنعتی انقلاب کا یہ معجزہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کی پیداوار ہے، سرخ انقلاب کے فوراً بعد روسی نہ صرف دہقانوں کی ایک قوم تھے بلکہ ان کا صدیوں پرانا جمود ضرب المثل بن چکا تھا، جہالت اور بدحالی میں ڈوبے ہوئے ان کروڑوں لکیر کے فقیروں کو روشنی اور امید کی نئی راہیں دکھانا ایک موہوم خواب معلوم ہوتا تھا، لیکن آج اس خواب کی تعبیر دنیا کے سامنے ہے، بیسویں صدی کا یہ حیرت انگیز معجزہ دراصل تعلیم کے ذریعے پیدا کیا گیا ہے۔ تعلیم ہی وہ جادو کی چھڑی ہے جس نے روس میں ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔

روسی رہنماؤں نے پہلے ہی دن سے تعلیم کے مقاصد متعین کر لیے تھے۔ اس ضمن میں ان کے ذہن بالکل صاف تھے، انہوں نے اس حقیقت کو لمحہ بھر کے لیے نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیا کہ تعلیم محض ایک آلہ اور اوزار ہے، بہتر زندگی کی تعمیر کا بہ بذات خود مقصود نہیں، بلکہ اصل مقصود وہ بلندتر اور پاکیزہ ترین زندگی ہے جس کا خاکہ وضاحت کے ساتھ تیار کر لیا گیا ہے یعنی یہ زندگی کا واضح خاکہ وضاحت کے ساتھ تیار کر لیا گیا کیوں کہ اس زندگی کا واضح خاکہ تیار کیے بغیر تعلیم کا اہتمام کرنا ایسے ہی ہے جیسے گھوڑے کے آگے گاڑی رکھ دی جائے

روس کا سرخ انقلاب بعض پر زور معاشی اور معاشرتی نظریوں کی پیداوار تھا، لیکن اس

اِنقلاب کے رہنما یہ نکتہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ان نظریوں کو غالب بنانے کے لیے صرف دلیل و حجت کافی نہیں، بلکہ ان کی پشت پر مضبوط صنعتی اور ٹیکنیکل قوت بھی ہونی چاہیے، چنانچہ تعلیم کے دو تہائی مقاصد قرار دیے گئے۔

(۱) نوجوانوں میں ہر طرح کی ٹیکنیکل اور فنی مہارت پیدا کرنا تاکہ وہ ملک کی بڑھتی ہوئی صنعتی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔

(۲) انہیں اشتراکی عقیدوں کی تعلیم اس طور پر دینا کہ یہ معتقدات ان کے رگ و ریشے میں بس جائیں اور انہیں اس امر کا پورا یقین ہو جائے کہ جو عالمگیر انقلاب آنے والا ہے اس میں جیت اشتراکیت ہی کی ہوگی۔

روسی تعلیم کی ایک جھلک

ان دو مقاصد کو نگاہ میں رکھ کر جو نظام تعلیم وضع کیا گیا تھا وہ حیرت انگیز طور پر کامیاب ثابت ہوا ہے۔ ابتدائی تعلیم اور بالغوں کے لیے خواندگی کی تعلیم بہت دیر سے لازمی ہے کیوں کہ یہ وہ آلہ ہے جس کی مدد سے پسندیدہ مقاصد کی طرف پیش قدمی ممکن ہے۔ جو طلبہ کی تعلیم کی نچلی منزلوں پر قابلیت کا ثبوت دیتے ہیں، انہیں ٹیکنیکل کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھیج دیا جاتا ہے، بہت سے نوجوان ایسے بھی ہیں جو مدرسے کی تعلیم کے بعد کسی کارخانے میں کام کرنے لگ جاتے ہیں اور چند سال بعد ٹیکنیکل کالج یا یونیورسٹی کے داخلہ کا امتحان پاس کر لیتے ہیں۔ انجینئرنگ اور ٹیکنیکل مضامین پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ ملک میں نئے کارخانے اس تیزی کے ساتھ قائم ہو رہے ہیں کہ ٹیکنیکل ماہروں اور ناظموں کی مانگ لگاتار بڑھ رہی ہے۔ خواہ کسی کارخانے میں نکل جاؤ ہدایت کاری اور نظم و نسق کا کام ایسے لوگوں کے ہاتھ میں نظر آئے گا جو کبھی اسی کارخانے میں معمولی مزدور تھے اور بعد میں کالج کی تعلیم حاصل کر کے منیجر کی کرسی پر آن بیٹھے۔

لیکن ترقی کے لیے اکیلی ٹیکنیکل مہارت کفایت نہیں کرتی۔ اس کے ساتھ ہی لینن اور اسٹالن کے معاشی نظریوں پر مکمل عقیدہ بھی ہونا چاہیے۔ نوجوان طلبہ کو فنی مہارت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ

اشتراکی پارٹی کے نظریات میں بھی ماہر ہونا چاہیے، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ آئندہ عالمی انقلاب میں اشتراکی طرزِ زندگی کیوں باقی طرز ہائے زندگی پر غالب آئے گی، یہ اشتراکی معتقدات دل و دماغ پر اس طرح چھا جانے چاہئیں کہ آئندہ تمام خیالات تصورات اور افعال انہی کے سانچے میں ڈھل کر نکلیں، جو نوجوان طالب علم ان بنیادی معتقدات میں راسخ نہیں ہو سکتا اسے ٹیکنیکل قابلیت کے باوجود اپنے مخصوص میدان میں بلند ترین اعزاز حاصل کرنے کی امید نہیں ہو سکتی۔ اشتراکی معتقدات کا راسخ ہونا کیمونسٹ پارٹی کی رکنیت کے لیے پروانہ راہ داری ہے، یہ وہ پارٹی ہے جس کے ہاتھ میں ملکی معاملات کی باگ ڈور ہے، اگر اس اعتقادی پختگی کے ساتھ ٹیکنیکل قابلیت بھی مل جائے تو یہ امر روس کی صنعتی معیشت میں اعلیٰ ترین مدارج پر پہونچنے کی ضمانت بن جاتا ہے۔

روسی تعلیم کی کامیابی اس نظامِ تعلیم کی پیداوار کیسے لوگ ہیں؟ مسٹر ایف۔ جے۔ ایرول کے الفاظ میں "روہ مرد اور عورتیں کارخانوں، کانوں اور انجینیرنگ کے منصوبوں میں کام کر رہے ہیں وہ سب کے سب اعلیٰ درجہ کے لوگ ہیں، یہ اس درجہ کے لوگ ہیں جو برطانیہ میں انٹرنیشنل ہارویسٹر کمپنی کے کارخانہ واقع ڈنکاسٹر یا دوسرے جدید ترین قوت کے سٹیشنوں میں کام کرتے نظر آتے ہیں، روس کے دہقان نے صنعت کاری کو ہاتھ ڈالا ہے تو نتیجہ یہ ہے کہ دہقانوں کے تمام پسندیدہ اوصاف آج روس کے انجینیرنگ کے کارخانوں میں نظر آتے ہیں"

معتقدات کی پختگی بے شک ایک پرہیبت قوت متحرکہ ہے۔ لیکن جدید سائنسی تہذیب ٹکنالوجی کے میدان میں اتنی آگے بڑھ چکی ہے کہ کسی ملک یا قوم کے لیے یہ ہرگز ممکن نہیں کہ ابجد سے آغاز کر کے اس میدان کے پیش روؤں سے بازی لے جائے۔ اشتراکی انقلاب کے رہنما اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے، چناں چہ لینن نے اپنی مشہور تصنیف "جلد آنے والی تباہی" میں یہ نکتہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے "ہم ایجادیں نہیں کریں گے، ہم سرمایہ دارانہ نظام سے بہترین کارخانے تجرباتی مرکز اور دارالعلوم بنے بنائے لے لیں گے۔ ہمیں ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ انتہائی ترقی یافتہ ملکوں سے بہترین نمونے اخذ کر لیں اور بس"

روس نے اپنی صنعتی زندگی کی تعمیر میں لینن کے اس اصول کو سختی کے ساتھ مشعل راہ بنایا ہے۔ گورکی کے مقام پر موٹریں بنانے کا جو عظیم الشان کارخانہ قائم ہے، اس میں چالیس ہزار مزدور کام کرتے ہیں لیکن ان کے مقابلے میں ڈرافس مین صرف ۲۵۰ ہیں، وجہ یہ ہے کہ روس کے صنعتی رہنما موٹروں کے نئے نمونے ایجاد کرنے میں وقت اور قوت فضائع نہیں کرنا چاہتے۔ یہ وقت اور قوت دوسری سمتوں میں صرف ہوتے ہیں جہاں ان کی شدید ترضرورت ہے، اس کارخانے میں اس وقت جو لاری بن رہی ہے وہ جنرل موٹرز (امریکہ) کی قبل از جنگ بنی ہوئی لاری کی نقل ہے۔ اس کا انجن ۱۹۳۸ء میں معیاری بنا لیا گیا تھا، اس وقت سے اب تک اس میں کچھ ترمیمیں آئی ہیں، لیکن اس انجن کی بنیادی ساخت کو ابھی نہیں بدلا گیا۔ کیوں کہ یہ عملی ضرورتوں کے لیے اچھا ہے۔

روس کے منضبط معاشی نظام میں یہ طریق کار بہت کارآمد ثابت ہوا ہے، نئے نمونے اور نئے نقشے تیار کرنے والوں کی ملک میں کمی ہے، اس لیے ان لوگوں کو ایسے کام پر کیوں لگایا جائے جبکہ ایک اچھا خاصہ کارآمد نمونہ پہلے سے موجود ہے؟ اس کے علاوہ مغرب کے ایجاد کردہ تازہ ترین نمونے ہر وقت ہاتھ لگ سکتے ہیں۔ نمونوں کے انتخاب کے معاملے میں بڑی احتیاط برتی جاتی ہے، لیکن جب ایک اچھا نمونہ ہاتھ لگ جائے تو اسے خواہ مخواہ پھینکا نہیں جاتا، اس کے بعد اگلا قدم یہ ہوتا ہے کہ پسند کردہ نمونے کے مطابق پیدائش کی ریل پیل کر دی جائے، خواہ جیٹ انجن ہوں یا موٹر کاریں اور خواہ بھاری مشینی اوزار، ہر میدان میں یہی طریق کار جاری ہے، روسی صنعت سرمایہ دارانہ نظام کے گلا کاٹ مقابلے سے بالکل بے خبر ہے، اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ نئی ایجادوں اور اختراعوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی، اس چیز کا تدارک مغربی ملکوں کے تازہ ترین نمونوں کے انتخاب سے کر لیا جاتا ہے، تاہم روسی صنعت میں ایک اور قسم کا مقابلہ موجود ہے جو اشتراکی مقابلہ پکارا جاتا ہے، مزدور، صنعت کار اور ناظم سب کو اس بات کی ہر وقت دھن لگی رہتی ہے کہ پیدائش کی رفتار اس قدر تیز کر دی جائے کہ وہ باقی ساتھیوں سے بازی لے جائیں، ہر کارخانے میں ایک بڑا تختہ لٹکتا نظر آتا ہے جس پر رفتار پیدائش کے اعداد و شمار

درج رہتے ہیں، ہر ہفتے اور ہر مہینے کے لیے انتہائی پیدائش کا ایک "ہدف" مقرر کر لیا جاتا ہے بعض حالتوں میں اصلی پیدائش اس "ہدف" سے بھی بڑھ جاتی ہے، اس امتیازی کامیابی کے ذمہ دار مزدوروں اور صنعت کاروں کو خاص تمغے اور انعامات دیے جاتے ہیں، ہر کارخانے میں ایک اعزازی فہرست بھی لٹکی نظر آتی ہے، اس فہرست کی زینت ان لوگوں کے نام ہیں، جو کارخانے میں کام کرتے ہیں اور جن کی غیر معمولی ہمت اور فراست نے پیدائش کے مقررہ ہدفوں سے بڑھ کر قدم رکھا، روس کا صنعتی نظام فی الحقیقت ان ہی لوگوں کے جذبہ عمل اور عزم کے سہارے قائم ہے، اور یہ لوگ روسی نظام تعلیم کی پیداوار ہیں، ان سے ملک کا کوئی کارخانہ، کوئی کان، کوئی تعمیری ادارہ خالی نہیں، روسی نظام تعلیم اپنے اس کارنامے پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے

اسلامی تاریخ کا سبق

روس نے اپنے نظام تعلیم کے مقاصد مقرر کرنے اور اپنی معاشی زندگی کی تعمیر میں جن اصولوں کو اپنایا ہے ان پر غور کریں تو یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہر نئے نظریۂ حیات کو ان اصولوں کے اپنائے بغیر چارہ نہیں۔ زندگی کا کوئی نظریہ اس وقت تک جڑیں نہیں پکڑتا جب تک انسانوں کی ایک جماعت اس کے ساتھ والہانہ لگاؤ پیدا نہ کرے، جس طرح آج کوئی روسی لینن اور سٹالن کے فلسفہ میں اپنے آپ کو کھوئے بغیر کمیونسٹ پارٹی کا رکن نہیں بن سکتا، بالکل اسی طرح قرآنی نظام حیات میں کوئی شخص اپنے آپ کو اللہ کی رضا میں کھوئے بغیر مومن نہیں بن سکتا، اسلامی عقائد کا زبانی اقرار کسی شخص کو مسلمان بنا سکتا ہے لیکن مومن بننے کے لیے اسے ایک کٹھن ضبط میں سے گذرنا پڑتا ہے، اس کے لیے خاص تربیت اور لگاتار مجاہدہ کی ضرورت ہے، جو شخص اس کٹھن ضبط اور لمبے مجاہدہ میں سے نہیں گذرتا اس کے ہاتھوں میں اسلامی معاشرہ کی باگ ڈور نہیں سونپی جا سکتی، تاریخ کا یہ سبق ہمارے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے، کیوں کہ ہم پاکستان میں ایک خالص اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے دعویدار ہیں، یہ خواب اسی وقت شرمندۂ تعبیر ہوگا جب مستقبل کے رہنماؤں کی تربیت اس طرح کی ہونے لگے کہ انہیں بھی اسلامی اقدار کے ساتھ والہانہ لگاؤ پیدا ہو جائے، جب تک ہمیں زندگی

ہر شعبہ میں ۔ خواہ وہ دینی ہو یا تعلیمی، صنعتی ہو یا سائنسی، کاروباری ہو یا حکومتی ـــ اس قسم کے رہنما فراوانی کے ساتھ ہاتھ نہیں لگتے اس وقت تک اسلامی معاشرے کا خواب ادھورا رہے گا ایسے رہنماؤں کی تیاری تعلیم کی ذمہ داری ہے ۔

معاملہ کا دوسرا پہلو بھی یکساں سبق آموز ہے ۔ اسلام نے اپنے پیروؤں کو روحانی اور اخلاقی اقدار کی دولت عطا کی تھی، اس نے انہیں کوئی مخصوص معاشی نظام نہیں دیا تھا، چناں چہ اسلامی معاشرے کے رہنماؤں نے زندگی کے فوجی، انتظامی، زرعی، صنعتی شعبوں میں کھلے دل کے ساتھ زیادہ ترقی یافتہ ملکوں سے بنے بنائے نمونے اخذ کیے اور انہیں اپنا کر اسلامی معاشرے کی معاشی زندگی کو اس حد تک استوار کیا کہ وہ حریف معاشروں کی ضربیں سہنے کے قابل ہو گئی ۔ مسلمانوں نے صدیوں تک اخذ و جذب کے اس اصول پر عمل کیا، انہوں نے کمال دریا دلی کے ساتھ یونان کے علمی خزانوں اور روم و ایران کی حکومتی اور ثقافتی روایات کو اپنایا وہ اس ابدی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے کہ نوع انسانی دراصل ایک ہی کنبہ ہے، اس لیے اس کے مختلف گروہوں کا علمی، فنی اور ثقافتی ترکہ ساری دنیا کی مشترکہ میراث ہے، عالمی کنبے کا جو گروہ اپنے آپ کو اس میراث سے محروم کرتا ہے وہ سخت گھاٹے میں رہتا ہے، صدیاں گزر جانے پر یہ سنہری اصول مسلمانوں کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا ۔ انہوں نے چند مخصوص علوم و فنون اور معاشی و مجلسی طور طریقوں پر "اسلامی" ہونے کی مہر لگا دی اور ان کے سوا باقی ہر شے کو غیر اسلامی قرار دے دیا، اس طور پر انہوں نے اپنے آپ کو ترقی پذیر انسانی میراث کے جائز حصے سے محروم کر لیا، اس کے نتائج آج معاشی تباہ حالی کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں، پاکستان کی تعمیر نو میں ہمیں یہ حقیقت لحظہ بھر کے لیے فراموش نہ کرنی چاہیے کہ صنعتی، فنی اور سائنسی میدانوں میں ہم اس وقت تک دوسری قوموں کے ہم قدم نہیں ہو سکتے جب تک ہم ان کی تازہ ترین ایجادوں اور اتنی ہی طریقہ ہائے پیدائش کو پوری طرح نہ اپنا لیں ۔

روس کی صنعتی زندگی | جدید روسی زندگی کی قوت متحرکہ فنی تعلیم اور نظام تعلیم پر ایک

سرسری نگاہ ڈال لینے کے بعد اب ہم اس صنعتی انقلاب کی عملی کارفرمائیوں کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کریں گے جو انقلاب براہ راست اشتراکی فلسفہ حیات اور نظام تعلیم کی پیداوار ہے۔

پچھلی چوتھائی صدی میں روس میں جگہ جگہ صنعتی شہروں نے سر اٹھایا ہے جہاں کارخانوں اور محنت کاروں کی آبادی کے بڑے بڑے جاؤ ہیں، ظاہری شکل و صورت میں یہ شہر مغرب کے دوسرے صنعتی شہروں سے چنداں مختلف نہیں، کوہ یورال کے پار اور وادی والگا میں بھاری صنعت کے جو نئے مرکز قائم ہوئے ہیں انہیں دیکھ کر برطانیہ کے صنعتی مرکزوں کی یاد تازہ ہوتی ہے، ان تمام شہروں میں جدید قسم کے وسیع ہوائی اڈے موجود ہیں، رقبہ کے اعتبار سے روس دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے، اگرچہ ریلوں اور آبی آمدورفت کی کافی سہولتیں موجود ہیں پھر بھی یخ بستہ شمال کے اکثر حصوں میں رسل و رسائل کا واحد ذریعہ ہوائی راستہ ہی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس طرح ہوائی آمدورفت کو بے حد ترقی دی گئی ہے۔

شہروں کی بڑھتی ہوئی صنعتی آبادی نے رہائشی مکانوں کے مسئلہ کو کافی ٹیڑھا بنا رکھا ہے اس مسئلہ کے حل کے لیے جامع منصوبے موجود ہیں جن کے مطابق وسیع سڑکوں اور عالیشان عمارتوں کو عملی شکل ملنے والی ہے، لیکن سردست محنت کار اور ان کے کنبے بہت محدود مکانیت میں گذارہ کرنے پر مجبور ہیں، برطانوی پارلیمانی مشن نے سٹالن گراڈ کے شہر میں مزدوروں کے مکانوں کو دیکھا۔ ایک بڑی عمارت کی ایک منزل میں تین کمرے تھے اور یہاں تین کنبے اقامت گزین تھے گویا ایک کمرے میں ایک کنبہ رہائشی مکانیت کا عام معیار یہی ہے، لیکن کمیونسٹ پارٹی کے اراکین۔ ٹیکنیکل ماہروں اور انجینیروں کے ساتھ ترجیحی برتاؤ کیا جاتا ہے، اس بھیڑ کے باعث ہر رہائشی کمرے میں متعدد بستر بچھے نظر آئے، لیکن اس پر بھی صفائی اور ستھرائی کا عام معیار بہت بلند تھا۔ ایک کمرے میں ایک گراموفون باجہ اور کچھ ریکارڈ پڑے تھے، پاس ہی ریڈیو سٹ رکھا تھا اس کے اوپر سلولائڈ کا بنا ہوا دو کوہانوں والا اونٹ دھرا تھا جو چھوٹے بچے کا کھلونا تھا، اس کے پاس ہی بچے کے چچا کا بھیجا ہوا مبارکباد کا تار پڑا تھا جو اس نے جنم دن کے موقع پر بھیجا تھا، بجلی کے میٹر کے

قریب ٹیلیفون دھرا تھا اور اس سے ذرا آگے دو سائیکل پڑے تھے۔ مکان کی مالک نے مسٹر ایرول سے معذرت کی کہ مجھے آپ کی آمد کی خبر نہ تھی ورنہ میں کمرے کو کچھ صاف کر لیتی اور آپ کی تواضع کے لیے چائے کی ایک پیالی تیار رکھتی، دراصل یہ معذرت ضروری نہ تھی کیوں کہ کمرہ بالکل صاف ستھرا تھا اور ہر چیز قرینے سے دھری تھی۔

پارلیمانی وفد کے اراکین جوں ہی نیچے گلی میں آئے انہیں مزدوروں کے بچوں نے گھیر لیا اور برطانوی سکوں اور ٹکٹوں کی فرمائش ہونے لگی، ان کے عوض میں وہ اپنے پاس سے کچھ نہ کچھ دینے پر اصرار کرتے تھے چنانچہ ایک چھوٹے بچے نے مسٹر ایرول کو ۱/۲ پنس کے ٹکٹ کے بدلے ایک کمیونسٹ تمغہ دے دیا۔

صنعتی شہروں میں بھی بچوں کی پڑھائی کا انتظام بہت اچھا ہے، بہت سے مدرسے دن میں دو دفعہ لگتے ہیں۔ بچوں کی آدھی تعداد قبل از دوپہر پڑھنے کے لیے آتی ہے اور دوسری آدھی تعداد بعد از دوپہر، اس کی وجہ یہ ہے کہ صنعتی آبادی کی بھیڑ کے باعث مکانیت کی تنگی ہے، اور سویت کا دعویٰ ہے کہ ان کے ملک میں کوئی ان پڑھ نہیں تعلیم ہر ایک کے لیے لازمی ہے۔ جب بچے لکھنا پڑھنا سیکھ جاتے ہیں تو انہیں اس بات کی ترغیب دی جاتی ہے کہ ایسے مضامین میں خصوصی مہارت پیدا کریں جن کی عملی افادیت ہو، مثلاً فزکس۔ بیالوجی۔ ریاضی اور ڈرائنگ، جدید زبانوں کی تدریس بہت مقبول ہے اور لاکھوں روسی بچے انگریزی زبان کا مطالعہ کرتے ہیں۔

”سوویٹ یونین میں ہر چیز ممکن ہے“۔ یہ مقولہ زبان زد عام ہے، اس مقولے کی صداقت ہر اس شخص کو ماننا پڑتی ہے جو روسی کارخانوں کا ملاحظہ کرے، روسی رہنماؤں نے اپنے ملک کی صنعتی ترقی کو اپنے تمام منصوبوں میں پہلا درجہ دے رکھا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ جن چیزوں کو وہ ملک کے لیے ناگزیر خیال کرتے ہیں ان پر ہر قسم کے وسائل بے دریغ صرف کیے جاتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام پیدائش میں افراد محض منفعت کے لیے بے روک ٹوک مقابلہ کرتے ہیں جو لوگ زیادہ چوکس اور سمجھدار ہوں وہ اس دوڑ میں دوسروں سے آگے نکل جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم

اپنے یہاں بعض کارخانے ایسے دیکھتے ہیں جن کا بندوبست اور نظام کار بے حد اعلیٰ اور سلجھا ہوا نظر آتا ہے ان کے برعکس اسی صنعت میں بعض کارخانے ایسے دکھائی دیتے ہیں جو محض گزارہ کیے جا رہے ہیں۔ روس میں بھی دونوں قسم کے کارخانے پہلو بہ پہلو موجود ہیں، اس کی وجہ طلب منفعت کی خواہش نہیں بلکہ قومی ضرورت کے تقاضے ہیں، جو کارخانے اہم ترین قومی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں وہاں بہترین سازوسامان اور بہترین دل و دماغ سے کام لیا جاتا ہے، لیکن جو کارخانے نسبتاً کم اہم اشیا، تیار کرتے ہیں ان کے لیے اسی قدر کافی سمجھا جاتا ہے کہ وہ عام رفتار پر چلتے رہیں۔ مثلاً گورکی کے شہر میں مشینی اوزار تیار کرنے والا کارخانہ پہلی قسم کی ذیل میں آتا ہے اور اس کے قریب واقع بھاری ڈیزل انجنوں کا کارخانہ دوسری قسم کی ذیل میں، وجہ یہ کہ مشینی اوزاروں کو روس میں آج کل چوٹی کی اہمیت حاصل ہے جبکہ ڈیزل انجن پہلے کی طرح اہم نہیں رہا، یہ انجن مغربی ملکوں سے بآسانی سے درآمد کیے جا سکتے ہیں۔

مشینی اوزاروں کو اول درجہ کی اہمیت دینے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ بالکل حال ہی تک بہت سے مشینی اوزار باہر سے درآمد کیے جاتے تھے کیوں کہ روسیوں کا خیال تھا کہ وہ خود یہ اوزار نہیں بنا سکتے۔ تیسری عالمگیر جنگ کے خطرے نے روس کو اس کمزوری کا شدید احساس دلایا۔ "روس میں ہر چیز ممکن ہے" کا مقولہ غلط ہوتا نظر آ رہا تھا، چنانچہ ہر قسم کے مشینی اوزاروں کی درآمد بند کر دی گئی، تمام اوزار ملک میں بنانے کی کوشش شروع ہوئی۔ بہترین دماغ، چوٹی کی مہارت اور ان تھک کوشش اس کام کی نذر ہونے لگی۔ اس سے پیدائش کے دوسرے شعبوں پر برا اثر پڑا لیکن بالآخر روسی اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے پیچیدہ سے پیچیدہ مشینی اوزاروں کو بنا لیا اور ان پر یہ حقیقت از سر نو واضح ہو گئی کہ ہر قومی ضرورت کو ملکی وسائل ہی سے پورا کیا جا سکتا ہے۔

ہوائی جہازوں کے کارخانوں کو بھی چوٹی کی اہمیت حاصل ہے، ایسے کارخانوں میں بہترین دماغوں اور فنی مہارت کو کھینچنے کے لیے اجرت کی شرح زیادہ کر دی جاتی ہے۔ مسٹر ایردل ہوائی جہازوں کے ایک کارخانے کا چکر لگایا، مزدور اپنے کام میں اس قدر منہمک تھے کہ انہوں

غیر ملکی جہان کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا، اس انہماک کی تہ پر یہ جذبہ تھا کہ چند منٹ ضائع کر دینے سے بھی مزدوری میں خاصا فرق پڑ جائے گا۔

سوویٹ روس میں سونے کی پیدائش کو بھی پہلے درجہ کی اہمیت حاصل ہے۔ یورال کی سونے کی کانوں میں جدید ترین طریقے استعمال ہو رہے ہیں، اگرچہ ان میں سے اکثر کچھ سال پہلے دریافت ہوئی ہیں، پھر بھی ان کی پیدائش کافی زیادہ ہے، سوویٹ یونین میں جہاں زیورات اور دوسری نمائشی چیزوں کو چنداں وقعت حاصل نہیں، سونے کی یہ اہمیت کچھ عجیب معلوم ہوتی ہے، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ روس سونے کے عوض ۔۔۔ ڈالر حاصل کر سکتا ہے اور ڈالروں سے وہ ایسی بنیادی خام اشیا خرید سکتا ہے جو روس میں پیدا نہیں ہوتیں مثلاً ربڑ اور بعض ضروری مشینیں۔

غرض روس کا سارا صنعتی نظام ایک مرکزی منصوبے کے ماتحت ہے، یہ منصوبہ ماسکو میں تیار ہوتا ہے اور یہاں سے چھن چھن کر ہر چھوٹے بڑے کارخانہ تک پہونچتا ہے، اکثر کارخانوں کی دیواروں پر یہ لکھا نظر آتا ہے "سرکاری منصوبہ ملک کا قانون ہے" اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دو بڑے حربے ہیں۔ (۱) حوصلہ افزائی اور انعامات کا حربہ (۲) جرمانے اور سزا کا حربہ۔ زیادہ کام پہلے حربے سے لیا جاتا ہے، دوسرا حربہ محض خاص خاص حالتوں میں استعمال ہوتا ہے، جو مزدور کاریگر یا منیجر پیدائش کی خوبی یا مقدار کو بڑھانے کے لیے کامیاب تدبیریں سوچیں اور پیش کریں انہیں معقول مالی انعام ملتا ہے، ان کو تمغے دیے جاتے ہیں اور ان کا نام خوب مشتہر کیا جاتا ہے، مزدوروں کو عموماً آٹھ گھنٹے روزانہ کام کرنا ہوتا ہے اور وہ ہفتہ میں چھے دن کام کرتے ہیں۔

ہر کارخانے میں مزدوروں کی ایک نمائندہ انجمن موجود ہے جو نہ صرف طریق کار کو بہتر بنانے اور پیدائش کو بڑھانے کے طریقوں پر غور کرتی ہے، بلکہ یہ کارخانہ میں کام کرنے والے تمام لوگوں کے کام پر تنقید بھی کرتی ہے، اگر کسی مزدور، فنی کاریگر یا نگران کا کام تسلی بخش نہ ہو تو پہلے اسے

اپنے یہاں بعض کارخانے ایسے دیکھتے ہیں جن کا بندوبست اور نظام کار بے حد اعلیٰ اور سلجھا ہوا نظر آتا ہے
ان کے برعکس اسی صنعت میں بعض کارخانے ایسے دکھائی دیتے ہیں جو محض گزارہ کیے جا رہے ہیں۔
روس میں بھی دونوں قسم کے کارخانے پہلو بہ پہلو موجود ہیں، اس کی وجہ طلب منفعت کی خواہش نہیں
بلکہ قومی ضرورت کے تقاضے ہیں، جو کارخانے اہم ترین قومی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں وہاں بہترین
سازوسامان اور بہترین دل ودماغ سے کام لیا جاتا ہے، لیکن جو کارخانے نسبتاً کم اہم اشیا
تیار کرتے ہیں ان کے لیے اسی قدر کافی سمجھا جاتا ہے کہ وہ عام رفتار پر چلتے رہیں۔ مثلاً گورکی کے شہر
میں مشینی اوزار تیار کرنے والا کارخانہ پہلی قسم کی ذیل میں آتا ہے اور اس کے قریب واقع بھاری
ڈیزل انجنوں کا کارخانہ دوسری قسم کی ذیل میں، وجہ یہ کہ مشینی اوزاروں کو روس میں آج بھی
چوٹی کی اہمیت حاصل ہے جبکہ ڈیزل انجن پہلے کی طرح اہم نہیں رہا۔ یہ انجن مغربی ملکوں سے بھی
آسانی سے درآمد کیے جا سکتے ہیں۔

مشینی اوزاروں کو اول درجہ کی اہمیت دینے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ بالکل حال ہی تک
بہت سے مشینی اوزار باہر سے درآمد کیے جاتے تھے کیونکہ روسیوں کا خیال تھا کہ وہ خود یہ اوزار
نہیں بنا سکتے۔ تیسری عالمگیر جنگ کے خطرے نے روس کو اس کمزوری کا شدید احساس دلایا۔
"روس میں ہر چیز ممکن ہے" کا مقولہ غلط ہوتا نظر آرہا تھا، چنانچہ ہر قسم کے مشینی اوزاروں کی درآمد
بند کر دی گئی، تمام اوزار ملک میں بنانے کی کوشش شروع ہوئی۔ بہترین دماغ، چوٹی کی مہارت اور
ان تھک کوشش اس کام کی نذر ہونے لگی۔ اس سے پیدائش کے دوسرے شعبوں پر برا اثر پڑا لیکن
بالآخر روسی اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے انہوں نے پیچیدہ سے پیچیدہ مشینی اوزاروں کو بنانا سیکھ لیا
ان پر یہ حقیقت از سر نو واضح ہو گئی کہ ہر قومی ضرورت کو ملکی وسائل ہی سے پورا کیا جا سکتا ہے۔

ہوائی جہازوں کے کارخانوں کو بھی چوٹی کی اہمیت حاصل ہے، ایسے کارخانوں میں بہترین
دماغوں اور فنی مہارت کو کھینچنے کے لیے اجرت کی شرح زیادہ کر دی جاتی ہے۔ مسٹر ایرول نے
ہوائی جہازوں کے ایک کارخانے کا چکر لگایا، مزدور اپنے کام میں اس قدر منہمک تھے کہ انہوں نے

غیر ملکی مہمان کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا، اس انہماک کی تہ پر یہ جذبہ تھا کہ چند منٹ ضائع کر دینے سے بھی مزدوری میں خاصا فرق پڑ جائے گا۔

سوویٹ روس میں سونے کی پیدائش کو بھی پہلے درجہ کی اہمیت حاصل ہے۔ یورال کی سونے کی کانوں میں جدید ترین طریقے استعمال ہو رہے ہیں، اگرچہ ان میں سے اکثر کچھ سال پہلے دریافت ہوئی ہیں، پھر بھی ان کی پیدائش کافی زیادہ ہے۔ سوویٹ یونین میں جہاں زیورات اور دوسری نمائشی چیزوں کو چنداں وقعت حاصل نہیں، سونے کی یہ اہمیت کچھ عجیب معلوم ہوتی ہے، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ روس سونے کے عوض۔۔۔ ڈالر حاصل کر سکتا ہے اور ڈالروں سے وہ ایسی بنیادی خام اشیا خرید سکتا ہے جو روس میں پیدا نہیں ہوتیں، مثلاً ربڑ اور بعض ضروری مشینیں۔

غرض روس کا سارا صنعتی نظام ایک مرکزی منصوبے کے ماتحت ہے، یہ منصوبہ ماسکو میں تیار ہوتا ہے اور یہاں سے چھن چھن کر ہر چھوٹے بڑے کارخانہ تک پہونچتا ہے، اکثر کارخانوں کی دیواروں پر یہ لکھا نظر آتا ہے "سرکاری منصوبہ ملک کا قانون ہے" اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دو بڑے حربے ہیں۔ (۱) حوصلہ افزائی اور انعامات کا حربہ (۲) جرمانے اور سزا کا حربہ۔ زیادہ کام پہلے حربے سے لیا جاتا ہے، دوسرا حربہ محض خاص خاص حالتوں میں استعمال ہوتا ہے، جو مزدور کاریگر یا منیجر پیدائش کی خوبی یا مقدار کو بڑھانے کے لیے کامیاب تدبیریں سوچیں اور پیش کریں انہیں معقول مالی انعام ملتا ہے، ان کو تمغے دیے جاتے ہیں اور ان کا نام خوب مشتہر کیا جاتا ہے، مزدوروں کو عموماً آٹھ گھنٹے روزانہ کام کرنا ہوتا ہے اور وہ ہفتہ میں چھ دن کام کرتے ہیں۔

ہر کارخانے میں مزدوروں کی ایک نمائندہ انجمن موجود ہے جو نہ صرف طریق کار کو بہتر بنانے اور پیدائش کو بڑھانے کے طریقوں پر غور کرتی ہے، بلکہ یہ کارخانہ میں کام کرنے والے تمام لوگوں کے کام پر تنقید بھی کرتی ہے، اگر کسی مزدور، فنی کاریگر یا نگران کا کام تسلی بخش نہ ہو تو پہلے اسے

اتباہ کیا جاتا ہے، اگر اس پر بھی اصلاح نہ ہو تو اسے جرمانہ کیا جاتا ہے، اگر یہ چیز بھی اسے بیدار کرنے کے لیے کافی نہ ہو تو اسے کسی ایسے کارخانے میں تبدیل کر دیا جاتا ہے، جہاں کام کم تو اہمیت کا ہو اور اجرت کم ہو، جس طرح ہمارے یہاں ہر سرکاری ملازم کے لیے ایک سروس بک رکھی جاتی ہے جس میں اس کے کام کی کیفیت کا اندراج ہوتا رہتا ہے، بالکل اسی طرح ہر روسی مزدور کے لیے ایک "لیبر بک" رکھی جاتی ہے جو عمر بھر اس کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔

کمیونسٹ پارٹی روس کی حکمران جماعت ہے، اس کے اراکین زندگی کی ہر سطح پر کام کرتے اور کھلی آنکھوں سے ہر چیز کو دیکھتے نظر آتے ہیں، کارخانوں میں مزدوروں کی جو انجمنیں تنقید اور ہدایت کاری کا کام کرتی ہیں ان کی ایک چوتھائی رکنیت کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں پر مشتمل ہوتی ہے "حکومت کا منصوبہ" فی الحقیقت کمیونسٹ پارٹی کا منصوبہ ہے اور اس کے مخلص اور سرگرم اراکین اس امر کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ یہ منصوبہ ہر سطح پر کامیاب ہو، کمیونسٹ پارٹی کی پشت پر خفیہ پولیس کی بے پناہ قوت ہے جو ہر اس شخص کے پیچھے سایہ کی طرح لگ جاتی ہے جو حسد یا بغض کی وجہ سے اپنے ساتھیوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دے۔

روسی پروپیگنڈا اب تک ہم روسی تعلیم کے کارناموں اور روسی صنعتی انقلاب کی عملی کارفرمائیوں کا ذکر کیا ہے، لیکن یہ تصویر بالکل یک طرفہ اور ادھوری رہے گی اگر روسی پروپیگنڈا کی طرف اشارہ نہ کیا جائے

تعلیم اور پروپیگنڈا میں کیا فرق ہے، مدرسے، اخبارات، ریڈیو تعلیم کے لیے بھی استعمال ہو سکتے ہیں اور پروپیگنڈا کے لیے بھی، دونوں میں فرق صرف نیت کا ہے تعلیم لوگوں میں ایسی تیز نگاہ پیدا کرنا چاہتی ہے جو نیک و بد میں تمیز کر سکے، اس کے برعکس پروپیگنڈا محض یک طرفہ نگاہ پیدا کرنے پر سارا زور صرف کر دیتا ہے، وہ نگاہوں سے کچھ صلاحیتیں سلب کرنے کے درپے رہتا ہے، تاکہ یہ نگاہ ایک مخصوص سمت میں ہی دیکھ سکے، اسے دوسری طرف کچھ نظر نہ آئے۔

اشتراکی فلسفہ کو اعتقادی رنگ دینے کے ساتھ ساتھ روس میں یہ اہتمام بھی کیا جاتا ہے کہ نئی پود

تمام مخالف نظریے حیات کو فرسودہ بے کار اور برائیوں کا سرچشمہ خیال کرنے لگ جائے۔ مسٹر ایڈول ایک مدرسے کا ملاحظہ کر رہے تھے کہ ایک بھولے بھالے چھوٹے بچے نے حیرت بھری نگاہیں اٹھا کر کہا ”اچھا۔ تو سرمایہ دار اس طرح کا ہوتا ہے“ وہ لینن گراڈ کے ایک بڑے کارخانے میں ایک نوجوان کاریگر سے باتیں کر رہے تھے جس کا باپ جرمنوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اس نوجوان کو لینن گراڈ کا جرمن محاصرہ اور شہر پر جرمن بم باری تو خوب یاد تھی۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ ہٹلر کے چھپے ہوائی جہازوں نے لندن پر بھی بم باری کی تھی، صرف اسی نوجوان ہی پر کیا منحصر نہیں، بلکہ لینن گراڈ کے میئر کو بھی یہ علم نہ تھا کہ جن دنوں جرمن اس کے شہر پر آگ برسا رہے تھے، ان دنوں برطانیہ کے لوگوں پر بھی آگ برس رہی تھی۔

ایک نوجوان کاریگر نے برطانوی ممبر پارلیمنٹ سے پوچھا ”کیا برطانیہ فی الواقع امن کی خاطر برسر پیکار رہا تھا؟ لندن کے تمام مدرسے بند کیوں کر دیے گئے ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ بیماری کی حالت میں برطانوی مزدور کو یہ حق حاصل نہیں کہ ڈاکٹر سے مشورہ لے؟ کیا وجہ ہے کہ برطانوی مزدوروں کو ہفتہ میں صرف پانچ دن کام کرنے کی اجازت ہے اور انہیں باقی دو دن فاقہ پر مجبور کیا جاتا ہے“، یہ اور اس قسم کے دوسرے سوال بے خبری کی پیداوار نہ تھے بلکہ عوام نے بے شمار دفعہ یہ باتیں اپنے اخباروں میں پڑھی اور ریڈیو پر سنی تھیں۔ روسی مزدوروں کو یہ پختہ یقین دلایا گیا ہے کہ ان کی حالت سرمایہ دار ملکوں کے مزدوروں سے بہت بہتر ہے، مزدور کو رہنے کے لیے کافی مکانیت نہ سہی، خوراک کی کمی سہی، کپڑوں کا ملنا مشکل سہی لیکن پھر بھی یہ حالت سرمایہ پرست ملکوں کے بر عکس مزدوروں کے مقابلے میں کئی گنا بہتر ہے، اخبارات اور ریڈیو یہی کہتے ہیں، چوں کہ اخبارات اور ریڈیو حکومت کے ہاتھ میں ہیں اور حکومت مزدوروں کی ہے، اس لیے یہ ساری باتیں حرف بہ حرف درست ہیں۔

پروپیگنڈا مغربی تہذیب کا ایک اہم ستون ہے، اس تہذیب کی جمہوری چھاپ اور اشتراکی چھاپ دونوں اس سے اہم خدمت لیتی ہیں، اگر اشتراکیت نے اس حربے کی مدد سے

سرمایہ دارانہ نظام کے متعلق ایک بگڑا ہوا تصور پیدا کیا ہے تو نام نہاد جمہوری تہذیب نے اس حربے سے دینی اور روحانی اقدار کی جڑیں کھوکھلی کی ہیں، دونوں کے استعمال میں فرق اگر ہے تو فقط اتنا کہ مغربی جمہوریت اس حربے کو کمال چابک دستی کے ساتھ استعمال کرتی ہے جب کہ اشتراکیت کھلے بندوں اس سے کام لیتی ہے۔ اسلامی نظام میں پروپیگنڈا کے لیے کوئی جگہ نہیں اسلام ہر انسان کا یہ فطری حق سمجھتا ہے کہ اسے بے لاگ نگاہ دی جائے تاکہ وہ پوری ذمہ داری کے ساتھ اچھے برے راستوں میں سے جس کو چاہے چن لے۔ معاشی تعمیر اور صنعتی ترقی بے شک پسندیدہ چیزیں ہیں لیکن ان کے نام پر انسانوں کی نگاہ میں مستقل کجی پیدا کرنا کسی طرح روا نہیں سمجھا جا سکتا۔

پروپیگنڈا کے بارے میں قرآن کا موقف اتنا واضح ہے کہ اس کی کسی تاویل کی ضرورت نہیں خدا کی توحید میں یقین رکھنا اور شرک کی ہر آلائش سے بچنا انسانی شرف کا معراج ہے، لیکن یہ شرف بھی کسی آدمی پر بہ جبر ٹھونسنے کی اجازت نہیں، اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی مسلک کا پیرو بنا دیتا لیکن اللہ زبردستی ایسا نہیں کرنا چاہتا ہے، اس نے انسان کو ہدایت کا راستہ دکھا دیا ہے، اسے اختیار کرنا نہ کرنا اس کی اپنی پسند ہے۔ نیکی اور نجات کے حامیوں پر صرف یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اللہ کا پیغام دوسروں تک پہنچا دیں، لیکن یہ کام پوری دیانت اور شرافت کے ساتھ ہونا چاہیے، اس میں واقعات پر پردہ ڈالنے یا ان کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوئی کوشش نہ ہونی چاہیے، افسوس کہ اس پاکیزہ جمہوری کردار کی حامل قوم اب ایک پرانی کہانی ہے اور اس وقت دنیا کی سیادت ایسی جمہوریتوں کے ہاتھ میں ہے جو پروپیگنڈا کی تاثیر میں پختہ ایمان رکھتی ہیں۔

جمہوریت اور مدرسہ

محمد عبدالعزیز

پچھلی عالمگیر لڑائی کے بعد دنیا کی مختلف قومیں دو گروہوں میں تقسیم ہو گئیں، ان میں سے ایک گروہ اشتراکی نظام حیات کو دنیا کی خرابیوں کا علاج بتاتا ہے اور دوسرا جمہوری نظام کو انسانی فلاح کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ لیکن ان دونوں متنازع گروہوں کے نیچے اقتدار میں کچھ ایسی قومیں بھی ہیں جنہیں غیر ترقی یافتہ اور پست کہہ کر حکومت کا اہل نہیں سمجھا جاتا اس کی بے شمار مثالیں ایشیا اور افریقہ کے نام نہاد غیر ترقی یافتہ ممالک میں مل جائیں گی۔ المغرب کو آزادی اس لیے نہیں دی جاتی کہ "ابھی وہاں جمہوری فضا سازگار نہیں۔ لوگ حکومت کرنے کے اہل نہیں۔ آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ حکومت کے خلاف احتجاجی جلسے کرتے ہیں اور چند نام نہاد لیڈر عوام کو تیغ و تفنگ سے کھیلنے پر اکساتے ہیں" ملایا میں آزادی کے مطالبے کو اس لیے ٹھکرایا جاتا ہے کہ اگر یہاں سے برطانوی اقتدار ختم ہو جائے تو اشتراکی فوجیں ملایا پر قبضہ کر لیں گی۔ چین کو تبت پر متصرف ہونے کی یوں ضرورت پیش آئی، "کہ تبت چین ہی کا ایک حصہ ہے، اسے اس سے علاحدہ رکھنا دانش مندی نہیں بلکہ ایک سیاسی اور معاشی موت ہے" اس طرح ان دونوں گروہوں میں کم سے کم ایک بات ضرور مشترک نظر آتی ہے یعنی دونوں کا مقصد عالمگیر سیاسی اقتدار ہے، اس کے لیے خواہ انہیں ایٹم بم استعمال کرنا پڑے یا ہائیڈروجن بم انسانوں کے گروہ در گروہ تباہ ہو جائیں یا قوموں کی قومیں ہلاک ہو جائیں انہیں اس سے سروکار نہیں، لیکن اس پر طرہ یہ کہ دونوں گروہ قیام امن کے سب سے بڑے داعی ہیں دنیا سے ظلم و جور اور سب و شتم ختم کرنے کے سب سے بڑے مبلغ۔ کیا ان حالات میں یہ دونوں عالمی نظریے انسان کی بہ حیثیت انسان کچھ خدمات انجام دے سکتے ہیں کیا یہ انسان کو ایک روحانی سکون، اخلاقی برتری اور سماجی ہم آہنگی کا تحفہ دے سکتے ہیں۔

ہمارا ملک ایک جمہوری ملک ہے جہاں اشتراکی نہیں جمہوری نظام حیات کی داغ بیل ڈالی جا چکی ہے، اس لیے اشتراکی نظام سے قطع نظر ہم اس جمہوری معاشرے کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیں گے مگر اس سے پہلے کہ اس معاشرے کے بنیادی اصولوں کا تجزیہ کیا جائے، جمہوریت کے اصل و فرع کی تعیین ضروری ہے، جمہوریت کسے کہتے ہیں، جمہوریت کا مفہوم کیا ہے، ایک عام انسان کو اس نظام حیات سے کیا کیا فائدے پہونچ سکتے ہیں، اور بحیثیت مجموعی قوم اس سے کس طرح متمتع ہو سکتی ہے، کیا اس کا یہ دعویٰ درست ہے کہ یہ دنیا کی مختلف سیاسی اور معاشی بیماریوں کا علاج ہے۔

جمہوریت کیا ہے؟ علامہ اقبال نے ایک مغربی مفکر کے قول کو نقل کرتے ہوئے جمہوریت کو ایک ایسا طرز حکومت بتایا ہے جس میں "بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے" کیوں کہ اس نظام میں یہ بھی ممکن ہے کہ اکثریت نے جو فیصلہ کیا ہے غلط ہو اور اس کے مقابلے میں ایک فردِ واحد کی رائے قطعی اور صائب ہو۔ اسی لیے مفکرین اسلام نے مغرب کے جمہوری نظام کو اس کے مغربی رنگ روپ میں قبول کرنے سے ہمیشہ انکار کیا۔

صدیوں کی سیاسی اور معاشی شکست و ریخت کے بعد مغرب نے حکومت کے جو نظام اس وقت دنیا کے سامنے پیش کیے ہیں ان میں جمہوریت ہی انسانی فلاح و بہبود کی سب سے بڑی ضامن نظر آتی ہے، جمہوریت میں اشتراکیت کے برعکس ریاست افراد کے تابع ہوتی ہے، افراد ریاست کے تابع نہیں ہوتے۔ ہر شخص کے لیے ایک آزاد ماحول اور آزاد معاشرہ ہوتا ہے جس میں وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق ترقی کر سکتا ہے۔ لنکن نے اسی لیے جمہوریت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "جمہوریت عوام کے لیے ایک عوامی حکومت ہے" اور غالباً جمہوریت کی اس سے زیادہ جامع تعریف نہیں ہو سکتی۔ اس نظام میں ضرورت کے مطابق ہر عہد میں کچھ تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور آج بھی وقتی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اس میں ردو بدل ہوتے رہتے ہیں، کیوں کہ اس میں ایک ایسی لابدی لچک ہے جو اسے حالات کے مطابق تبدیل کر دیا کرتی ہے، ایک ایسے معاشرے کی تخلیق جس میں ہر شخص اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی شخصیت میں ترقی کا ایک رنگ

بھر سکے۔ بہر صورت ہر دور میں ممکن ہوتا ہے، جمہوریت میں یہ ممکن ہے کہ ایک خاک روب کا بچہ ترقی کرتے کرتے علم و حکمت کی مجلس میں باریابی ہی حاصل نہ کرلے بلکہ صدر انجمن بن جائے اور اس کی مسند نشینی پر واہ و تحسین کے غلغلے بلند ہوں۔ ابراہم لنکن نے اپنا بچپن افلاس میں بسر کیا اور جوانی خوردہ فروشی میں لیکن اس کے باوجود ایک دن صدر مملکت بننے میں اسے کامیابی حاصل ہو گئی پھر انسانی آزادی کے تحفظ کے لیے اس نے خانہ جنگی کی آگ میں کودنے سے بھی گریز نہ کیا، امریکہ میں انسداد غلامی اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے، اگرچہ اس جرم کی پاداش میں ایک شخص نے اسے قتل بھی کر دیا۔ مگر یہ ایک انفرادی فعل تھا، قوم کا دل اور قوم کی دعائیں اس کے ساتھ تھیں۔

جمہوریت ایک ایسا نظام حیات ہے جس میں افراد کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تربیت اس نہج پر کی جاتی ہے جس سے فرد و جماعت میں ایک ایسا رابطہ قائم ہو جائے جس کا مقصد انسانی فلاح و بہبود ہو۔ اسے ہم ایک ایسا سماجی نظام کہہ سکتے ہیں جس میں نہ کوئی طبقاتی تقسیم ہو، نہ کوئی حاکم ہو اور نہ کوئی محکوم، نہ کوئی امیر ہو اور نہ کوئی مفلس، نہ کوئی برہمن ہو اور نہ شودر۔ ہر شخص کے لیے ایک سازگار ماحول اور ایک ہموار رہگذر گاہ ہو، جہاں انسان کی خود ساختہ حد بندیاں مانع سفر نہ ہوں ایک چپراسی کے لڑکے کو بھی بڑا بننے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کسی اونچے سے اونچے افسر کے بیٹے کو، کیوں کہ انسان کے عزائم اور اس کی خواہشات کی کوئی متعین حد نہیں ہوتی یہ لامتناہی اور بے کراں ہیں، ہر شخص بڑی سے بڑی چیز کی آرزو کر سکتا ہے اور اس کے حصول کے لیے ہر جائز ذریعہ استعمال کر سکتا ہے، یہ اس کا حق ہے جسے اس سے چھینا نہیں جا سکتا۔

جمہوریت میں فرد زندگی کا مرکز ہوتا ہے۔ اسے اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہی کا موقع نہیں ہوتا بلکہ معاشرہ خود اس کی تہذیب و تربیت میں حصہ لیتا ہے۔ کیوں کہ ایک فرد کی تعلیم و تربیت اور اس کے کردار ہی پر جمہوری نظام کا انحصار ہوتا ہے اس لیے جمہوریت کا مقصد فرد کے اقدار حیات کا احترام اور اس کی قدر و منزلت ہے۔ قطع نظر اس سے کہ فرد کا تعلق کس خاندان سے ہے، یا اس کی یا اس کے آبا و اجداد کی کوئی سیاسی یا سماجی

حیثیت بھی ہے۔ اگر جمہوریت میں اس انسانی تمکنت کو کوئی مقام حاصل ہو جائے تو اخوت و
مساوات، اور محاسنِ اخلاق کا یہ شیش محل آنِ واحد میں ڈھے جائے۔ یہاں تو آدم کی اولاد کو انسان
سمجھنا ہی جمہوریت ہے۔ اگر معاشرے میں امتیازات کی رسا کشی ہوئی تو ایسے نظام کو ہم ہرگز
جمہوری نظام نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے دراصل جمہوریت ایک ایسا سیاسی، معاشی، اخلاقی اور
سماجی نظام ہے جس میں ہر شخص کو ترقی کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملتا ہے۔ بلکہ مغربی مفکرین
کے مطابق یہ ایک ایسا "معاشری ایمان" ہے جو زندگی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقاصد کے حصول کی
کوشش کرتا ہے، یہ مقاصد اور یہ نظریات صدیوں کے انسانی تجربوں کا نچوڑ ہے، ہر عہد میں
لوگوں نے انسانی رواداری اور مساوات کے تجربے کیے۔ اس عہد کی سیاسی مدنی اور معاشرتی
زندگی کا جائزہ لیا اور ان عوامل کا تجزیہ کیا جو اس وقت معاشرے کی اصل تصور کیے جاتے تھے
اس کے بعد جو معاشرہ وجود میں آیا اور جس سماج کی انسان نے تخلیق کی وہ ایک جمہوری معاشرہ ہے

جمہوریت اور تعلیم

۔ جمہوری معاشرہ جس نظامِ حیات کا ڈول ڈالتا ہے۔ اس کی ترقی اسی وقت
ممکن ہے جب ہر شہری اپنے حقوق و فرائض کی حد بندیوں کو پھلانگ کر
دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ نہ ڈالے بلکہ اسے اپنے حقوق کا احترام اور اپنے فرائض کا شدت سے احساس
ہو، اذیت کوشی، مفاد پرستی، اقربا نوازی اور اپنی ہی ذات کو مجموعہ صفات سمجھنا اس کا منصب نہ
ہو اس سے نفرت بڑھتی ہے اور اقتدار کی رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے جس سے مفادِ عامہ کو بہر صورت
ہر وقت ضرر پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے، اس لیے جمہوریت تو اسی ماحول میں پرورش پا سکتی ہے
جہاں تہذیب و تمدن کی جلوہ گری زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہو، اور محبت و اخلاص، مروت اور
ہمدردی کی نور افشانی ہو۔ لیکن کیا یہ خواص ان افراد میں پیدا ہو سکتے ہیں جنھوں نے ایک ایسے
ماحول میں آنکھ کھولی ملکہ پرورش پائی ہو جو ان اقدارِ حیات سے روشناس ہی نہ ہو بلکہ اس کے
برعکس اسے صرف اپنا ہی مفاد عزیز ہو؟ ۔

انفرادی اور اجتماعی طور پر یہ خوبیاں اسی وقت پیدا ہو سکتی ہیں جب ہر فرد نظری اقدار سے

اپنی ان صلاحیتوں کی جو فطرت نے اس کی ذات میں ودیعت کی ہیں، اس طرح تہذیب وتربیت کرے کہ وہ انسان دوستی میں ڈوب جائے اور حسب موقع دوسروں کے لیے کچھ قربانی کرنے کا جذبہ رکھتا ہو۔ مگر زندگی کی اس منزل تک پہونچنے کے لیے بڑے بڑے دشوار گذار مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ ان دشوار گذار مراحل میں تعلیم ہی ہر سفر کرنے والے کو چراغ راہ کا کام دیتی ہے۔ اسی تعلیم کی روشنی میں ہر شہری کی ایک جمہوری معاشرے میں تہذیب وتربیت ہو سکتی ہے، زندگی کی تڑپ، آگے بڑھنے کا جذبہ، خودکاری کی لگن اور تمدن آفرینی کی دھن اسی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ تعلیم تو جمہوری معاشرے کی خشت اول ہے، جس کے سہارے ایک عظیم الشان سماج کی تعمیر ہو سکتی ہے، لیکن اس سے پہلے کہ تعلیم کے اس افادی پہلو کو یوں ہی تسلیم کر لیا جائے، اس کی افادیت کا تجزیہ بھی ضروری ہے کہ تعلیم جمہوریت کی خشت اول کیوں کر ہے، اس سے اخلاص ومحبت اور فرض شناسی کے جوہر کیسے پیدا ہوتے ہیں، یہ لوگوں کو انسان دوست کس طرح بناتی ہے، اس سے باہمی روابط کیوں کر استوار ہوتے ہیں، اس سے زندگی کی تڑپ اور عمل کی سرگرمی کیسے پیدا ہوتی ہے یہ سوال بظاہر اتنے نظر فریب معلوم ہوتے ہیں جس سے ایک مرتبہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید تعلیم بجائے خود جمہوریت یا اسی قسم کے کسی دوسرے ادارے کی دریوزہ گر ہو، اس میں فی الواقع اتنی افادیت کہاں کہ وہ لوگوں کے ذہنوں کو منور اور روشن کر سکے، لیکن یہ تصور محض نظر فریب ہی ہے، حقائق سے اسے کوئی سروکار نہیں۔

جمہوریت میں ہر شہری کا متمدن اور مہذب ہونا ضروری ہے، کیوں کہ اس کے بغیر کوئی جمہوری معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا، مگر اس سے کہیں زیادہ اہم بات جمہوری نظام حیات کو اپنی معاشرتی زندگی کا جزو بنانا اور اسے دوسرے نظاموں پر فوقیت دینا ہے۔ یعنی ہر شہری یہ محسوس کرے کہ جمہوریت ہی ایک ایسا نظام حیات ہے جس میں انسان، انسان رہ کر کام کر سکتا ہے اور جب یہ احساس پیدا ہو جائے گا تو وہ ایک آزاد انسان کے حقوق کی ذمہ داری خود ہی قبول کر لیتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اگر میں اس ماحول میں رہ کر بلند سے بلند مقام تک پہونچنے کی

آزادو کر سکتا ہوں تو دوسرے کو بھی انہیں خطوط پر سوچنے اور چلنے کا حق حاصل ہے، اگر میں اپنی شخصی آزادی کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں تو دوسرا بھی اسے سینے سے لگا رکھنے کا حق رکھتا ہے، اس طرح باہمی افہام وتفہیم اور احترام حقوق کا صحیح شعور پیدا ہو جاتا ہے، مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب لوگوں کو شروع ہی سے اس قسم کی تعلیم دی جائے اور انہیں ان ذمہ داریوں کے قبول کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کا انحصار افراد کے اعلیٰ کردار محسوسات اور تصورات پر ہوتا ہے۔ اگر ان خواص کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا جائے تو جمہوریت اپنی موت آپ مر جاتی ہے"۔ اندریں حالات نہ وہ ماحول رہتا ہے اور نہ وہ معاشرہ جس میں جمہوریت پنپ یا پھل پھول سکے، چناں چہ جو قومیں جمہوری نظام زندگی کو اپنا رہی ہیں ان میں ان خواص کا پیدا کرنا ازبس ضروری ہے اور یہ اہم خدمت ان جمہوری ممالک کی ثانوی تعلیم گاہیں انجام دے سکتی ہیں، کیوں کہ بچہ مدرسے میں اپنی زندگی کی ابتدائی منزلوں میں آتا ہے اور جب یہاں سے رخصت ہوتا ہے نوجوان ہوتا ہے، وہ اسی ماحول میں اچھا یا برا بن سکتا ہے، جو نقوش اس عمر میں اس کی زندگی پر مرتسم ہوتے ہیں وہ بڑے گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں، ان کے اثرات کو زائل کرنا ممکن نہیں، اس لیے اگر ہر مدرسہ اپنی اس ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے بچوں کی تعلیم و تربیت کو جمہوری سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کرے اور ان میں سے ہر ایک کو یہ احساس دلا دے کہ تمہارے حقوق یہ ہیں اور فرائض یہ۔ سچائی اور حق پرستی تمہاری زندگی کا شعار ہے۔ اگر تم نے اسے اپنی زندگی کا جزو بنا یا تو کامرانی اور کامیابی تمہارے قدم چومے گی، تو اس نے اپنا مشن پورا کر دیا۔

امریکی جمہوریت اور تعلیم

اس وقت دنیا میں امریکہ جمہوریت کا سب سے بڑا داعی ہے اور امریکہ والوں کو اس امر کا پورا پورا احساس ہے کہ جمہوریت کی بقا اور ترقی میں جو اہم پارٹ ہمارے ثانوی مدارس ادا کر سکتے ہیں وہ کسی اور ادارے کے بس کا روگ نہیں، چناں چہ لائف کے ایک اداریے میں ہنری کو لے گرنے "ہماری تعلیم گاہوں نے ہمیں

آزاد رکھا" کے عنوان سے امریکی مدارس کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک اہم تعلیمی مضمون لکھا اس میں اس نے مدارس کی توجہ ان اقدار کی طرف بھی دلائی ہے جو اس بدلے ہوئے ماحول میں ان کی نظر التفات کی سب سے زیادہ محتاج ہیں وہ لکھتا ہے۔

دنیا میں کسی قوم نے امریکہ والوں کی طرح تعلیم کا اتنا شدید مطالبہ نہیں کیا، اور یہ بھی درست ہے کہ امریکی مدارس اور مدرسین کی طرح کسی نے اپنے ملک کی خدمت بھی نہیں کی ہے۔

شروع ہی سے تعلیم کے پیش نظر ایک مقصد اور ایک اہم کام تھا، جمہوریت روشن ضمیر رائے دہندوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ مختلف ریاستیں اور مختلف علاقوں میں یہ یک جہتی اور یہ اتحاد ایک شدید قومی شعور کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا تھا امریکی قوم ہزاروں اور لاکھوں تارکین وطن کو جو دنیا کے مختلف حصوں سے یہاں آکر آباد ہوئے موثر "امریکنائیت" کے بغیر ایک قوم میں مدغم نہیں کر سکتی تھی، اس کے بیچ ایسے ایسے معاشی اور سماجی امتیازات اور ترجیحات کا مقابلہ کرنا پڑا جو جمہوریت کے لیے تباہ کن تھے اور یہ اہم ذمہ داری ہمارے مدرسوں پر عاید کی گئی کہ وہ قوم کے جذبات کو اس طرح ارتعاش میں لائے کہ وہ جمہوریت قومیت امریکنائیت اور ان کے تاریخی اصولوں کے تابع ہو کر ان کا احترام کریں۔" [1]

اس پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے فاضل مدیر نے امریکی مدارس کی نئی ذمہ داریوں کا جائزہ لیا اور اس امر پر زور دیا ہے کہ مستقبل میں بھی وہ اپنی ان ذمہ داریوں کو بطریق احسن انجام دیتے رہیں گے، اس سلسلے میں اس نے جن امور کی طرف توجہ دلائی ہے، وہ یہ ہیں۔

(۱) روشن ضمیر شہریوں کی تخلیق تاکہ حکومت چلتی رہے۔

(۲) قومی اتحاد کی تعمیر

---

[1] لائف ۲۱ نمبر ۱۶ (۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء) اس مضمون کا ترجمہ علیک لاہور (۲ اکتوبر ۱۹۵۱ء) میں چھپا

(۳) امریکنائیزیشن (۱۸۶۰ء کے بعد سے ہر دس سال میں اس صدی تک ۲۰ لاکھ سے ۸۰ لاکھ تک تارکین وطن امریکہ آتے رہے، ان سب کو ایک قوم بنانا)

(۴) سماجی یک جہتی۔

کونے گر نے ان اصولوں کو امریکی جمہوریت کی بنیاد قرار دے کر امریکی مدرسوں سے اپیل کی ہے کہ حسب دستور وہ اپنے مشن کو جاری رکھیں اور جس طرح میسوچیوسٹس کے نظام تعلیم نے صدیوں پہلے آزادی اور حریت کے چراغ کو روشن رکھا، امریکی مدارس اس سنت پر عمل کر کے دوسروں کے لیے مشعل ہدایت ثابت ہوں گے۔ وہ لکھتا ہے۔

موجودہ امریکی معاشرہ جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے مختلف الاوضاع ہے اور جس کا نسلی، مذہبی، سیاسی اور معاشی پس منظر بھی مختلف ہے بالعموم متنازع ترجیحوں اور ناممکن تقسیموں کے مختلف عوامل کا نشکار ہو سکتا تھا لیکن یہاں یہ طاقتیں غالب نہ آسکیں امریکہ کے درسی کمروں اور کھیل کے میدانوں میں انہیں بیخ و بن سے اکھاڑ دیا گیا مدرسوں میں بچوں نے مساوات سیکھی اور اس پر عمل کیا، سارے مضامین کی تدریس اسی ترتیب و تنظیم اور اسی نظم و ضبط کے تابع رہی، کھیلوں کے میدانوں اور ورزش گاہوں میں اسی دستور کی حکومت رہی، جہاں ان کے کارہائے نمایاں پر انہیں انعام و اعزاز دیا جاتا ہے تحسین و آفرین اور قلبی مسرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس سے دوسروں کے دل میں بھی اس کے حصول کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ بعض ریڈیائی تمثیل نگارجن میں دراصل لطیف بذلہ سنجی کا فقدان ہوتا ہے، اکثر ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے نظام الاوقات میں غیر ملکی ناموں کو اعلیٰ مذاق کے منافی سمجھتے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ کوئی شخص فی الواقع جمہوریت کے مقاصد کی تکمیل میں شبہ نہیں کر سکتا۔ جب مرفی۔ شوارز۔ گروگلیو یا لیوڈسکی کے نام پر یکساں طور پر نعرہ ہائے تحسین بلند ہوں"

اس مختصر سے اقتباس میں امریکی مدارس کی داخلی زندگی کی ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہر مدرسہ اپنی عظیم ذمہ داری کو محسوس کرتا ہے جو اس پر عائد کر دی گئی ہے۔ بلکہ وہ قوم کی ہر توقع کو جو اس کے احاطۂ عمل میں ہے پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس وقت امریکہ رنگ و نسل اور مذہب و زبان کے لحاظ سے ایک واحدہ نہیں، یہاں سفید ان فرنگی بھی آباد ہیں اور سیاہ فام زنگی بھی اور یہاں کے پرانے اور اصلی باشندے جنہیں اہل فرنگ ریڈ انڈین یا سرخ ہندوستانی کہتے ہیں ان کی زبان، رنگ اور مذہب میں عظیم اختلاف ہے۔ اہل مغرب جغرافیائی وحدت، رنگ، نسل، زبان کی یکسانی کو تصور قومی کی اساس قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس اعتبار سے امریکہ کو ایک قوم نہیں کہا جا سکتا، اس کی پہلی شرط یعنی جغرافیائی وحدت کی شرط تو پوری ہو جاتی ہے۔ مگر دوسری شرائط کا پورا ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ اس کے باوجود ریاست ہائے متحدہ کے مختلف افراد ایک ہی قوم کے ہیں، ان کا مسلک ایک ان کا تمدن ایک ان کی معاشرت ایک ان کا سیاسی اور اقتصادی نظام ایک۔ اس اختلاف میں جو اتحاد اس معاشرے میں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور جس میں اسے کما حقہ کامیابی بھی حاصل ہو چکی ہے صرف اسی قوم کا کام تھا، صدیوں کے میل جول نے اس قوم کو تنا مربوط اور ہم آہنگ بنا دیا ہے کہ اب اس کی اس یکجہتی اور اس اتحاد کو توڑا نہیں جا سکتا۔ ان کے دل و دماغ میں آزادی و حریت اور زندہ رہنے کا ایک شدید جذبہ ہے جس کی بدولت وہ ہر مشکل آسانی سے مقابلہ کر لیتے ہیں بقول کولے گر یہ شعور اور پختگی ان کے اپنے مدارس کا عطیہ ہے جس کے وہ بہر صورت ممنون ہیں۔

ایک مثال یہاں امریکی قوم کی یہ مثال اس لیے دی گئی ہے کہ ان دنوں پاکستان کی تمدنی زندگی میں امریکی اثرات کا نفوذ بڑی سرعت سے ہو رہا ہے۔ لیکن جس طرح اس سے پہلے ہم نے مغرب کے اس آدرش کو اپنانے کی کوشش نہیں کی جس نے مغربی اقوام کو دنیا میں سیاسی اور معاشی لحاظ سے اس قدر مضبوط بنا دیا ہے، اس طرح آج ہمارے سامنے امریکی تہذیب کی چمک دمک تو ہے مگر ہم نے کچھ ان اقدار حیات کو اپنانے کی کوشش نہیں کی جس نے امریکہ کے

سرپرستی بنیادی سیادت کا تاج رکھ دیا۔ پچھلے دنوں لاہور کے امریکی شعبہ نشریات و تعلیمات نے ایک
امریکی متعلم کے معمولات کی ایک مختصر سی تصویر لاہور کے مختلف مدارس میں دکھائی، اس تصویر میں
ایک امریکی قلمی دوست اپنے پاکستانی قلمی دوست کو خط لکھتا ہے جس میں وہ اپنی روزمرہ زندگی کو
نہایت سادے اور بھولے انداز میں بیان کرتا ہے، یہ بچہ اسکول میں پڑھتا ہے لیکن فرصت
کے اوقات میں تھوڑی دیر کے لیے ایک دکان پر کام بھی کرتا ہے، اپنے والد بزرگوار کے ساتھ
کاروں کی مرمت کا فن بھی سیکھتا ہے، پھر اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ کھیلتا ہے، دونوں ایک
دوسرے کو خوب تنگ کرتے ہیں لیکن کام کے وقت وہ اپنی ماں کی امداد بھی کرتا ہے، چولھے میں
لکڑی ڈالتا ہے اور کھانا چننے سے پہلے پلیٹیں پونچھ کر میز پر لگاتا ہے، کھانے سے پہلے سب لوگ
دعا کرتے ہیں اور پھر کھانا شروع کرتے ہیں، وہ شریر بھی ہے اور اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر
برف کے گالے دوسروں پر پھینکتا ہے وہ کھیلوں میں بھی حصہ لیتا ہے اور پڑھنے میں بھی اچھا
ہے، وہ باقاعدگی سے کلیسا جاتا ہے وہ وقت کا پابند ہے اور اپنے حقوق و فرائض کو اچھی طرح
پہچانتا ہے۔

یہ تصویر بحیثیت مجموعی بہت اچھی ہے، اور اس کا ہمارے طلبہ پر ایک خوش گوار اثر پڑے گا
لیکن رقص و سرود والا حصہ اس کی تعلیمی افادیت کو ختم کر دیتا ہے، امریکی معاشرے میں رقص کرنا
اور گانا ان کی ثقافت اور تمدنی زندگی کا ایک جزو ہے، مگر ہمارے مشرقی معاشرے میں اس طرح
ناچنا خلاف تہذیب ہی نہیں بدعت تصور کیا جاتا ہے، اور مجھے تو اندیشہ بلکہ کسی حد تک یقین ہے کہ
ہمارے نیم پختہ نوجوانوں کے ذہنوں میں صرف یہی حصہ رہ جائے گا اور وہ اس کے دوسرے حصوں
کو فراموش کر دیں گے، کیوں کہ ہمارا متوسط گھرانا بھی اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں شرم محسوس کرتا ہے
بھلا ہمارا نوجوان بچہ اپنے نظام اوقات کو اس طرح کیسے ترتیب دے سکتا ہے، اس کی زندگی تو
ناہموار اور غیر متوازن ہوتی ہے، گھر کا بھی یہی حال اور مدرسے کا بھی یہی شعار، پھر وہ اس ماحول
سے نکل کر ایک آزاد قوم کے طور طریقے کس طرح اختیار کرے، دراصل امریکی مدرسوں اور گھروں میں

بچوں کو اس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ قوم کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے اہل ثابت ہو سکیں اور آگے چل کر فرد اپنی ہی ضروریات کے مکتفی نہ ہوں بلکہ قوم و ملک کی ضروریات بھی پورا کرنے میں ہمہ تن جوش ہوں، دنیا میں قوموں کی ترقی اور ان کی فلاح و بہبود کا یہی ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اور جب تک ہر شخص مل کر قوم کی تعمیر و تشکیل میں حصہ نہیں لیتا اس قوم کا پنپنا اور پھلنا پھولنا معلوم!

نیا ملک اور نئے تقاضے پاکستان ایک نیا ملک ہے اس لیے اس کی ضروریات بھی نئی اور اس کے سیاسی، سماجی اور معاشی تقاضے بھی نئے ہیں، کیا کسی عظیم منصوبے کے بغیر اس نئے ملک کو ترقی پسندی کی شاہ راہوں پر ڈالنا ممکن ہے، کیا تعلیمی ترقی اور سماجی ہم آہنگی کے بغیر ہم ترقی یافتہ قوموں کی ہم چشمی کا دعویٰ کر سکتے ہیں، کیا ہم لمبے ہاتھ پاؤں ہوتے ہوئے "شاہین نسکار" اور "یزداں گیر" بن سکتے ہیں، کیا اس شعور کو پہونچنے کے بعد ہم طوفان سے کھیلنے کا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں، یہ اور اس قسم کے سیکڑوں سوال پیدا ہوتے ہیں۔ جن کا جواب دیے بغیر منزل کی طرف بڑھنا ممکن نہیں۔ کولے گر کا خیال ہے کہ ہماری تعلیم گاہوں نے ہمیں آزاد رکھا اور اس سلسلے میں اس نے میوچیوٹس کے قدیم ادارۂ تعلیم کو امریکہ کی تعلیمی ترقی کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے۔ آج ہم بھی اپنے تعلیمی اداروں کی امداد کے بغیر اپنے ملک میں زندگی کی نئی طرح نہیں ڈال سکتے۔

پاکستان کے قیام میں جو جذبات کارفرما تھے وہ امریکہ کے قدیم و جدید حالات سے بالکل مختلف ہیں، امریکہ میں بالعموم ان آزادی پسندوں نے اپنی نو آبادیاں قائم کیں جو رومن کیتھولک فرماں رواؤں اور کلیساؤں کے مظالم سے تنگ آ کر ترک وطن پر مجبور ہو گئے تھے یا ان میں ایسے نو آبادکار بھی تھے جو بعض سیاسی مصالح کی بنا پر اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔ ان میں بعض مجرم اور بعض صرف زندگی کی کرشمہ سازیوں کا تماشہ دیکھنے کے لیے یہاں پہونچے تھے، لیکن رفتہ رفتہ ان سب نے مل کر ایک سماج اور ایک قوم کے بالغ نظر اور متحد افراد کی حیثیت سے اپنے فطری وسائل سے فائدہ اٹھایا اور ملک کو سیاسی اور معاشی اعتبار سے اتنا مضبوط بنا لیا کہ آج اس کی عالمی سیادت کم و بیش مسلم ہو چکی ہے، لیکن اس کے برعکس پاکستان . . . . کے مطالبے کی تہ میں مسلمانانِ ہند کا وہ سیاسی

اور دینی مسلک کارفرما تھا جن کی بدولت برطانوی سامراج اور داعیوں کی مشترکہ کوششوں کو شکست ہوئی* اور ایک قلیل مدت میں ۔ ۔ ۔ ۔ ایسے روباہ مزاج، تنگ دل، کم کوش اور کوتہ نظر ہو گئے کہ انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی معاشرت کو مٹانا شروع کیا، ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے ان سے وہ سب کچھ چھین لیا جس پر وہ ناز کرتے تھے، اس دار و گیر اور اس دورِ ابتلا میں وقت کے مبصرین سیاست کا یہی خیال تھا کہ اس برصغیر پر ایک ہزار برس حکومت کرنے والی قوم بہت جلد نابود ہو جائے گی، لیکن قدرت کو اسے تباہی و بربادی سے بچانا تھا، اس لیے ان حالات میں مردے از غیب برون آید و کارے بکند کے مصداق سرسید کی شخصیت رونما ہوئی، سرسید وقت کے سب سے بڑے نبض شناس تھے، انہوں نے اپنی اصلاحی مہم کی ابتدا تعلیم سے کی، وہ جانتے تھے کہ جس قوم میں غیرت و حمیت باقی نہ رہی ہو وہ ایک عالم گیر سیاسی زوال کے بعد بڑی آسانی سے نیست و نابود ہو سکتی ہے، اس لیے اس کے جذبۂ خود داری کو بیدار کرنے کے واسطے اس میں تعلیم پھیلانا اہم اور ضروری ہے، علم ہی مسلمانوں کے ذہنوں کو منور اور متنوع بنا سکتا ہے، چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر علی گڑھ میں ایک تعلیمی ادارے کی بنیاد ڈال کر سرسید نے اپنی تعلیمی تحریک کا آغاز کیا، یہ تعلیمی تحریک دراصل خالصتہً تعلیمی نہ تھی بلکہ اس کی تہہ میں سیاسی، اقتصادی، معاشی، سماجی، دینی اور اخلاقی عوامل بھی کار فرما تھے، یہی وجہ ہے کہ رفتہ رفتہ علی گڑھ مسلمانوں کی ہر قسم کی تحریکوں کا مرکز بن گیا۔

* لیکن انگریزوں کی دو سو سالہ حکومت اس برصغیر میں ملی روایات تہذیب و ثقافت حتیٰ کہ ان کے زبان و ادب کو بھی برباد کر دیا۔

استنبول کا ایک زنانہ مدرسہ

اویس احمد

مخصوص قومی روح کی بقا

افراد کی طرح تہذیبیں بھی زندگی کی بے حد حریص واقع ہوتی ہیں ہیں، وہ ہر قیمت پر زندہ رہنا چاہتی ہیں، موت کا تصور ان کے لیے ایسا ہی سوہان روح ہے جیسا افراد کے لیے، اپنی صحت اور توانائی برقرار رکھنے کے لیے وہ اپنی مخصوص روایات اور علامات کو خوب فروغ دیتی ہیں تا آنکہ کم زور تہذیبوں کو یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ غالب تہذیبوں کی صحت و تنومندی کا سارا راز انکی ظاہری علامات ہی میں ہے، وہ اپنی زندگی کو محفوظ رکھنے اور اسے طویل تر بنانے کے لیے اضطراری حالت میں غالب تہذیب کی روایات اور علامات مستعار لینے لگتی ہیں، لیکن چوں کہ ان اجنبی اشیاء کی صحیح اہمیت سے خود واقف نہیں ہوتیں اس لیے عموماً ضروری اور غیر ضروری میں تمیز نہیں کر سکتیں تاریخ میں کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کم زور تہذیبوں نے اپنے آپ کو مضبوط تر بنانے کے ارادے سے دوسروں سے اندھا دھند ہر چیز مستعار لینا شروع کی اور بالآخر اپنی ہستی غالب تہذیب ہی میں کھو دی، لائبیریا کے حبشیوں کی مثال اس امر کا ایک اچھا ثبوت ہے، یہ لوگ سولھویں اور ستر ھویں صدی میں افریقہ کے جنگلوں سے پکڑ کر امریکہ بھیج دیے گئے، جہاں انہیں ایک بے حد غالب تہذیب سے سابقہ پڑا، جسمانی غلامی کے ساتھ انہیں اس تہذیب کی غلامی بھی اختیار کرنی پڑی کوئی دو سو سال بعد انہیں آزادی نصیب ہوئی تو کچھ لوگوں نے اپنے "تاریک وطن" کو واپس جانا پسند کیا اور مغربی افریقہ کے ساحل پر لائبیریا کے نام سے ایک وطن کی بنیاد ڈالی، لیکن یہ سیاسی آزادی لائبیریا کے حبشیوں کو ثقافتی آزادی نہ دلا سکی، ان کی اپنی تہذیب مدتیں گذریں دم توڑ چکی تھی اور وہ اب کئی پشتوں سے ایک نئی تہذیب کے فرزند تھے انہیں اپنی

تہذیب میں سے کوئی قابلِ فخر چیز یاد نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ گو آج لائبیریا ایک جمہوریت ہے، لیکن اسے اپنی آزادی سے زیادہ فخر اپنے مسیحی دین اور اپنی انگریزی زبان پر ہے، آج اسے یہ بات قطعاً یاد نہیں کہ یہ دونوں چیزیں اس نے اپنی آزاد پسندی سے نہیں بلکہ ضرورت سے مجبور ہو کر اختیار کی تھیں۔

اسلام کی اپنی ایک مخصوص ثقافتی زندگی ہے جو صدیوں پرانی روایات سے عبارت ہے، بدقسمتی سے مسلمان قوم نے ایک بہت لمبے عرصے تک اپنی ثقافتی زندگی کی صحت سے تغافل برتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی غالب حیثیت مغلوبیت میں بدل گئی، اس نے دفعتہً دیکھا کہ ایک پرہیبت حریف تہذیب اسے مقابلے کے لیے للکار رہی ہے۔ مگر اس میں سر اٹھانے کی ہمت نہیں، کچھ عرصہ کھسیانی خفگی میں گذارا۔ پھر رفتہ رفتہ اجنبی تہذیب کے طور طریقوں کو اپنایا۔ ان میں سے بعض پسندیدہ ہیں اور بعض ناپسندیدہ، افسوس کہ ہم نے مغرب کی مسیحی تہذیب سے اخذ کرتے وقت کھوٹے کھرے میں زیادہ پرکھ نہیں کی، اس پر مستزاد یہ کہ اجنبی تہذیب سے اچھی چیز بھی اخذ کرتے وقت بھی صحت مند طریقہ یہ تھا کہ ان کو اپنی مخصوص قومی روح سے مطابقت دی جائے تاکہ یہ اس روح کا ایک متناسب جزو بن جائیں اور ان کی اجنبیت نگاہ پر گراں نہ گذرے، ہم نے ان احتیاطوں میں کوئی احتیاط بھی نہیں برتی۔ ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ اسلامی تہذیب پر مغربی مسیحی تہذیب کا جو بدرنگ پیوند لگایا جا رہا ہے اس کا انجام کیا ہوگا، اس میں شک نہیں کہ اس پیوند کی ضرورت ناگزیر ہے۔ مگر ثقافتی روح کی سلامتی کے لیے یہ امر بھی یکساں ناگزیر ہے کہ اس پیوند کو خود رنگ بنایا جائے۔

ترکی وہ مسلمان ملک ہے جس نے اپنی ہستی کو مہلک خطرے سے دوچار پا کر یک دم ہر قسم کے مغربی طور طریقوں کو اپنے اوپر مسلط کر لیا تھا۔ آج اس واقعہ کو چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے، قوموں کی زندگی میں یہ وقفہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ اندھا دھند مغربیت کے خلاف ملک میں پہلے ہی ردّ عمل شروع ہو چکا ہے، امید رکھنی چاہیے کہ وقت گذرنے کے ساتھ یہ ردّ عمل

زور پکڑا جائے گا اور ترک قوم نے مغرب سے جو کچھ ادھار لیا ہے وہ سب ترکی کی مخصوص ثقافتی روح کے رنگ میں رنگا جائے گا۔ بہرحال یہ امید مستقبل سے وابستہ ہے۔ اب تک ترک قوم کی بیشتر زندگی مغربی خطوط پر استوار کی گئی ہے۔ ذیل میں جدید ترکی کی نوجوان طالبات کی وہ جھلک پیش کی جاتی ہے جس کا خواب اتاترک نے دیکھا تھا۔

انگلز کز مکتب (زنانہ انگریزی مدرسہ)

کوئی ایک صدی گذری استنبول کے انگریزی سفارت خانے میں ایک شام پر تکلف دعوت دی گئی جس میں مسلمانوں کے خلیفہ یعنی سلطان ترکی نے بھی شرکت کی۔ دوران گفتگو میں سلطان نے کہا میری خواہش ہے کہ اس شہر میں اچھے گھرانوں کی ترک لڑکیوں کے لیے ایک مدرسہ کھولا جائے جہاں انہیں اسی قسم کی تعلیم ملے جو برطانوی لڑکیوں کو دی جاتی ہے۔ سلطان نے اس مطلب کے لیے شہر کے غیر ملکی حصہ میں زمین کا ایک قطعہ بھی پیش کیا، چنانچہ اس مقام پر "انگلش ہائی اسکول فار گرلز" تعمیر ہوا۔ زمانے کے انقلاب کے باوجود یہ زنانہ مدرسہ آج تک موجود ہے اور اپنا کام کر رہا ہے۔

استنبول کا یہ مشہور زنانہ مدرسہ شہر کی سب سے پر شور شاہراہ پر واقع ہے۔ مدرسے کی پچھلی کھڑکیاں استنبول کی پرہجوم سڑک گرانڈ رد پارا، کی طرف جا نکلتی ہیں۔ یہ کھڑکیاں اگر کھول دی جائیں تو ٹراموں، موٹر کاروں اور سودا فروشوں کے شور سے کمروں میں کان پڑی آواز سنائی نہ دے اس لیے یہ بند رکھی جاتی ہیں۔ مدرسے کا بڑا دروازہ ایک چھوٹی گلی میں کھلتا ہے جو بالکل پرسکون ہے اور جس سے آگے شاخ زریں کے پار تک گنبد اور مینار سر اٹھائے دکھائی دیتے ہیں، بہت سال نہیں گذرے کہ مدرسہ میں پڑھنے والی طالبات سر سے پاؤں تک پردے میں چھپی آتی تھیں، وفادار خواجہ سرا ان کے بستے اٹھائے ہوتے تھے بیرونی دروازے کی بغل میں آج تک وہ تاریک کمرہ موجود ہے جہاں بیٹھ کر خواجہ سرا اپنی نوعمر خانموں کا انتظار کیا کرتے تھے۔ مدرسے میں داخل ہونے کے بعد پردہ اتار دیا جاتا تھا، کیوں کہ

کھڑکیاں اور روشن دان آہنی بلندی پر تعمیر کیے گئے تھے کہ باہر سے کسی نگاہ کے اندر آنے کا کھٹکا باقی نہ رہا تھا، آج اس مدرسے کی دنیا سرے سے بدل چکی ہے، ان پردہ دار حسن کی شہزادیوں کی بیٹیاں اور نواسیاں نیم برہنہ جسم میں ہنستی، باتیں کرتیں مدرسے میں داخل ہوتی ہیں، ان کی وردی خوبصورت نیلے رنگ کے کپڑے کی بنی ہے اور وہ کسی برطانوی مدرسے کی طالبات معلوم دیتی ہیں۔

قومی روح کا تحفظ

ترکی میں مذہب اور ریاست کو الگ الگ کر کے لادین ریاست ضرور قائم کی گئی ہے لیکن ترکی جمہوریت کے معمار قومی روح کے تحفظ کے معاملے میں لاپرواہ نہیں تھے، انہوں نے پرانی جامد روایات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے بعد ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہا جو مغرب کی سائنسی تہذیب کا لباس پہنے ہو لیکن جس کا دل ترک قوم کی قابل فخر روایات کا خزانہ ہو، یہ مطلب حاصل کرنے کے لیے بعض دور رس احتیاطیں برتی گئی ہیں، ان میں سے ایک مثبت احتیاط یہ ہے کہ ترکی کے معاشرتی انقلاب کی تاریخ مدرسوں کے نصاب کا لازمی جزو ہے دوسری احتیاط جو منفی قسم کی ہے یہ ہے کہ ترکی میں مسیحی مشنوں اور دوسرے مذاہب کے تبلیغی اداروں کو کھلے بندوں تبلیغ کی اجازت نہیں کیوں کہ ترک اور اسلام دو ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے ہیں، ترک کے لیے کسی اور دین کا پیرو ہونا گویا اپنی قومیت سے انکار کرنا ہے، اس ضمن میں راقم کو ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ ایک بین الاقوامی جماعت میں ایک ادھیڑ عمر یونانی خاتون بھی شامل تھیں۔ انکی پیدائش استنبول کی تھی۔ اب تک ان کا ذاتی مکان اس شہر میں موجود تھا اور وہ بلا تکلف ترکی زبان بولتی تھیں ایک روز شہریت کے مسئلہ پر بات چیت چل نکلی، انہوں نے کہا، میں بیک وقت ترکی شہری بھی ہوں اور یونانی شہری بھی، یہ دوہری شہریت مجھے ترک افسروں کی مہربانی کی بدولت حاصل ہے جنہوں نے غیر معمولی مروت سے کام لے کر میری ترکی شہریت کو برقرار رہنے دیا تاکہ میری استنبول والی جائداد پر کسی قسم کی زد نہ پڑے، اس پر گروہ کے بعض افراد نے کہا جب آپ کی غیر منقولہ جائداد استنبول میں موجود ہے، آپ ترکی زبان فرفر بولتی ہیں اور ترکی شہری حقوق بھی رکھتی ہیں تو پھر آپ اپنے آپ کو ترک کیوں نہیں کہلاتیں؛ تاکہ اس گروہ کے ترک افراد میں ایک اور کا اضافہ ہو جائے۔

اس سوال پر یونانی خاتون کچھ جھینپ سی گئیں لیکن جب یہ سوال دو تین دفعہ دہرایا گیا تو انہوں نے گروہ کے ترک افراد کی طرف معذرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور بولیں، آپ حضرات کی اجازت سے میں اپنے دوستوں کے لیے یہ نکتہ صاف کرنا چاہتی ہوں، بات اصل میں یہ ہے کہ گو میں ترکی شہری ہوں لیکن میں ترک نہیں، اگر میں اپنے آپ کو ترک کہلاؤں تو اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ میں مسلمان ہوں، حالاں کہ میں عیسائی ہوں، یہی وجہ ہے کہ ترکی شہری حقوق رکھتے ہوئے ترکی زبان بولتے ہوئے اور ترکی میں غیر منقولہ جائداد کی مالکہ ہوتے ہوئے بھی میں اپنے آپ کو یونانی کہلانے پر اصرار کرتی ہوں۔

قومی اوج کے تحفظ کے لیے جو تیسری احتیاط برتی گئی ہے وہ بھی منفی قسم کی ہے، لیکن نتائج کے لحاظ سے وہ دوسری احتیاط کی طرح اہم ہے۔ ہمارے یہاں درجنوں مسیحی تعلیمی ادارے قائم ہیں جو اچھے کھاتے پیتے پاکستانی گھرانوں کے بچوں کو ہوش سنبھالتے ہی اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں، یہ کنڈرگارٹن مدرسے پہلے دن ہی سے انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بناتے ہیں، چوں کہ انگریزی زبان میں مہارت پیدا کرنا بہت بڑی کامیابی سمجھی جاتی ہے اس لیے والدین اپنے بچوں کو ان مدرسوں میں داخل کرانے کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ کر کوشش کرتے ہیں اور اس غرض کے لیے لمبی انتظاری فہرستیں تیار رہتی ہیں، یہاں ان مدرسوں کی تعلیم کے متعلق کچھ کہنا مقصود نہیں لیکن یہ وضاحت کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادارے سب کے سب تبلیغی ادارے ہیں جن کی پہلی غرض مسیحی دین کی اشاعت ہے، راقم نے بعض مسلمان والدین کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہمارے سب بچے ان مدرسوں میں سے گذرے لیکن ان میں سے کوئی بھی عیسائی نہیں ہوا۔ لیکن یہ سادہ لوح ماں باپ یہ نہیں سمجھتے کہ ایک خالص مسلمان معاشرے میں عیسائیت کو بہ جبر بچوں پر ٹھونسنا ممکن ہی نہیں، یہاں صرف اسی قدر ممکن ہے کہ بچوں کو مسیحی تصورات سے روشناس کرا دیا جائے اور اس تخم پاشی کے بعد نتائج کا صبر کے ساتھ کچھ پشتوں تک انتظار کیا جائے، راقم نے اپنے عزیزوں میں سے دو چھوٹی بچیوں کو دیکھا کہ کہ مل کر یہ مسیحی دعا گنگنا رہی ہیں: "اے ہمارے آسمانی باپ، ہمیں ہمارا روزانہ رزق عطا کر......"

"آسمانی باپ" اور "ربّ العالمین" کے تصوّرات میں جو فرق ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لَم یلد وَلَم یولد میں ایمان رکھنے والی قوم کا "آسمانی باپ" کے تصوّر کو قبول کر لینا ہی عیسائیت کے لیے بڑی کامیابی ہے۔
یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ جن بچیوں کا ذکر کیا ہے ان کے ماں باپ روشن خیال اور تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند ہیں، مگر کیا یہ بچیاں بھی بڑی ہو کر ماں باپ کے نقش قدم پر چلیں گی؟ یہ وہ سوال ہے جس کے متعلق اس قوم کو اچھی طرح سوچنا چاہیے جس نے محض دینی اختلاف کی بنا پر صدیوں پرانے ہمسائیوں سے علیحدگی اختیار کی اور اس علیحدگی کی قیمت خون کی ندیوں اور لاکھوں معصوم عورتوں کی عصمت کی شکل میں ادا کی، قومی کردار کی یک جہتی اور قومی روح کے تحفظ و بقا کے لیے یہ بات از حد ضروری ہے کہ شہریوں کے بنیادی تصوّرات میں ہم آہنگی اور یک جہتی موجود ہو۔

استنبول کے زنانہ انگریزی مدرسے میں پڑھائی کنڈرگارٹن جماعتوں سے شروع ہوتی ہے لیکن ان جماعتوں میں ایک بھی ترک لڑکی نظر نہیں آتی، اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا اعلیٰ طبقہ کے ترک والدین میں سے کسی کے دل میں یہ خواہش پیدا نہیں ہوتی کہ ان کی بچیاں پڑھائی کا آغاز ہی انگریزی زبان اور انگریزی ماحول میں کریں۔ غالباً کئی والدین ایسے ہوں گے جو یہ خواہش رکھتے ہوں مگر ترک حکومت اس چیز کو قومی یک جہتی اور ملکی سالمیت کے منافی سمجھتی ہے، دس گیارہ برس کی عمر تک بچوں کے لیے لازمی ہے کہ وہ سرکاری مدرسوں میں تعلیم حاصل کریں تاکہ ان میں بنیادی قومی شعور پیدا ہو جائے اس کے بعد والدین کو اجازت ہے کہ بچوں کو جس مدرسے میں چاہیں بھیجیں۔
استنبول کے زنانہ انگریزی مدرسہ کے کنڈرگارٹن درجہ میں کوئی درجن سوا درجن لڑکیاں پڑھتی ہیں اور وہ تقریباً اتنی ہی مختلف قوموں سے تعلق رکھتی ہیں، کچھ سال گذرے ان میں ایک سات سالہ ہسپانوی لڑکی بھی تھی جس کے چمکیلے سیاہ بال اور نشیلی آنکھیں ہر نووارد کی نگاہ کو کھینچتی تھیں، لیکن یہ بچی ہمیشہ کھوئی کھوئی نظر آتی تھی۔ پڑھائی سے اسے ہرگز رغبت نہ تھی، ایک روز مدرسے میں یہ خوفناک افواہ گشت لگانے لگی کہ یہ کمسن ہسپانوی بچی ہر رات استنبول کے ایک مشہور اوپرا میں رقص کے

کمالات دکھاتی ہے۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ بات بالکل درست ہے۔ مدرسے کی برطانوی صدر معلمہ نے لڑکی کے والدین کو بلایا اور کہا کہ آپ کو ناچ اور مدرسہ کی پڑھائی میں سے ایک چیز کو پسند کرنا ہوگا کیوں کہ میرے پاس ایک لمبی انتظاری فہرست موجود ہے۔ والدین نے بلا تامل ناچ کو ترجیح دی ان کا یہ انتخاب بڑا دانش مندانہ ثابت ہوا کیوں کہ کچھ سال بعد چمکیلی سیاہ زلفوں اور نشیلی آنکھوں والی یہ لڑکی پیرس کی رقص و سرود کی محفلوں میں ستاروں کی صف اول میں جگہ حاصل کر گئی۔

قوم پرستی کا جذبہ جدید ترکی میں قوم پرستی کے جذبے کو بالکل وہی مقام حاصل ہے جو قدیم ترکی میں مذہب کو حاصل تھا، اگر قبل از انقلاب قومی زندگی کا مرکزی نقطہ مذہب تھا تو آج اس کا محور قومیت اور وطن پرستی ہے۔ ترکی زندگی کے اس نئے مرکزی نقطہ کی متنفذ علامت کمال اتاترک ہے جس نے زندگی سے مایوس ترکی قوم کو وطن پرستی کی راہ دکھا کر اسے مکمل تباہی سے بچایا تھا، کمال اتاترک کے مجسمے ملک میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں اور سرکاری دفتروں اور مدرسوں میں اس کی تصویریں دیواروں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔

ترکی میں جو غیر ملکی ہسپتال اور مدرسے یا کالج کام کرتے ہیں، ترکی جذبہ قوم پرستی نے ان پر چند در چند پابندیاں عاید کر رکھی ہیں، مثلاً استنبول کا انگریزی زنانہ اسکول اس بات پر مجبور ہے کہ دو صدر معلمات رکھے ان میں سے ایک انگریز ہے اور دوسری ترک، اسی طرح پڑھانے والا عملہ بھی دو متوازی گروہوں پر مشتمل ہے جن میں سے ایک انگریز ہے تو دوسرا ترک، بعد دوپہر مدرسہ کلیتہً ترک عملہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے، عملہ کے دونوں گروہوں کو اکٹھے مل بیٹھنے کے مواقع خاص تقریبوں کے علاوہ کم ملتے ہیں اور ایسے مواقع پر بھی زبان کی دشواری باہمی ارتباط کو بہت کچھ محدود رکھتی ہے۔

اوپر کہا گیا ہے کہ اس مدرسہ میں ترکی طالبات دس گیارہ برس کی عمر سے پہلے داخل نہیں ہوتیں، وہ داخلہ کے وقت انگریزی سے بالکل نابلد ہوتی ہیں، وہ مدرسہ کی ان غیر ملکی طالبات کے مقابلہ میں انگریزی میں بہت پیچھے ہوتی ہیں جو کنڈر گارٹن درجہ سے انگریزی پڑھ رہی ہوتی ہیں۔

—— مدرسہ ترک طالبات کے لیے دو سال تک انگریزی زبان کے خصوصی نصاب کا اہتمام کرتا ہے تاکہ یہ باقی طالبات کے ساتھ چلنے کے قابل ہو جاتی ہیں

ترکی جذبہ وطن پرستی صرف اسی بات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ چند قدم اور آگے جاتا ہے۔ غیر ملکی مدرسے قانوناً اس بات پر مجبور ہیں کہ ملکی تاریخ و جغرافیہ کو اپنے نصابوں میں شامل کریں، یہ مضامین خالص قومی نقطہ نگاہ سے پڑھائے جاتے ہیں۔ ان مضامین کی تدریس غیر ملکی استادوں کے ذمہ نہیں بلکہ ترک استادوں کے ہاتھ میں ہے، اس کے علاوہ نصاب مدرسہ میں بعض ایسے مضامین بھی شامل ہیں جو برطانوی مدرسوں کے نصاب میں دکھائی نہیں دیتے، مثلاً ترکی مجلسی انقلاب کی تاریخ اور بری و بحری فوج کی تربیت ایسے امتحانی مضامین ہیں جن میں پاس ہونا ضروری ہے، مدرسے کے سارے نصاب کو ایک نمایاں قومی رنگ دیا گیا ہے، مثلاً پہلی کتاب کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

"کمال اتاترک ہمارے ملک کے باپ تھے انہیں بچوں سے بے حد محبت تھی، ہم ترک بچے بھی ان سے محبت کرتے ہیں۔ اتاترک زندہ باد"

اتاترک کی تصویر مدرسے کے ہر کمرے میں دکھائی دیتی ہے، اس کے اقوال تمام کتابوں میں بکھرے نظر آتے ہیں، اس کی وفات کا دن قومی سوگ کا دن ہے، اس روز انگریزی مدرسہ کے ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوتا ہے جس میں تمام طالبات اور استانیاں شامل ہوتی ہیں، ایک ترک استانی مجمع کو خطاب کرتی ہے اور سامعین کو دل گداز الفاظ میں بتاتی ہے کہ اتاترک نے اپنے ملک [illegible] کی صورتوں کے لیے کیا کچھ کیا ہے، آخر الامر جذبہ باقی نہ تھا و اس حد کو جا پہنچتا ہے کہ تقریر [illegible] تمام ہچکیاں لے لے کر آنسوؤں کے دریا بہانے لگتی ہیں۔

اگرچہ یہ [illegible] زنانہ مدرسہ میں صرف [illegible] اور نیچے طبقے کی ترک لڑکیاں [illegible] پڑھتی ہیں، اس طبقے کی گھریلو زندگی کے متعلق ایک انگر[illegible] [illegible] پہلی جنگ [illegible] دوسری عالمی جنگ کے دنوں میں یہاں پڑھانے [illegible]

مامور تھی، اسے مدرسہ میں آئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ اس سے پوچھا گیا کہ آیا وہ
ایک ترک لڑکی کی نجی معلمی اختیار کرنا پسند کرے گی، اس سے نہ صرف اس کی آمدنی میں اضافہ
ہو جائے گا بلکہ چند ترک گھرانوں کے ساتھ مراسم بھی قائم ہو جائیں گے۔ معلمہ نے اس دعوت کو قبول
کرلیا۔

اسے ایک نوجوان ترک لڑکی کو پڑھانے کے لیے کہا گیا جس کا نام سیوم تھا۔ سیوم ایک
امیر سوداگر کی لاڈلی بیٹی تھی۔ انگریز معلمہ ہفتہ میں دو بار اس کے گھر پڑھانے جایا کرتی تھی۔
سیوم ہائی اسکول کی پڑھائی ختم کر چکی تھی، ابھی اس کی شادی میں کوئی دو سال کا عرصہ باقی
تھا اور وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر کچھ انگریزی اور نفیس سلائی سیکھنا چاہتی تھی۔

سیوم کا گھر نہایت قیمتی سامان آرائش سے مزین تھا، کمروں میں بھاری غالیچے بچھے تھے
جوں ہی انگریز استانی آتی نوکر قہوہ یا چائے لے کر آتا، قہوے یا چائے کے دور کے ساتھ ہی
ہلکی پھلکی گفتگو شروع ہو جاتی۔ نجی معلمی کا یہ سلسلہ کوئی دو سال جاری رہا۔ لیکن اس عرصہ میں
سیوم نے شیکسپیر کے ڈرامہ رومیو جولیٹ کے سوا اور کچھ نہ پڑھا، دراصل اسے پڑھائی
سے چنداں رغبت نہ تھی۔ انگریز معلمہ کا، آنا جانا محض ایک دل لگی کا سامان پیدا کر دیتا تھا
اور بس۔ اس دو سال کے عرصہ میں استانی صرف ایک بار سیوم کی والدہ سے ملاقات کر سکی
یہ ایک بھاری بھرکم ترک خاتون تھیں جو طلائی کرسی پر قیمتی لباس پہنے بیٹھی تھیں، لیکن چونکہ
وہ انگریزی سے بالکل نابلد تھیں اور استانی کو ترکی زبان کے چند الفاظ کے سوا اور کچھ نہ آتا
تھا، اس لیے دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہو سکی۔ سیوم کے والد نے استانی سے کبھی ملاقات
نہیں کی، حالاں کہ وہ کئی مرتبہ اس کی موجودگی میں گھر پر ہوتا تھا

سیوم اور انگریز استانی جس کمرے میں بیٹھا کرتی تھیں، اس سے اگلے کمرے میں اکثر آوازیں
[illegible] سنائی دیتی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ سیوم کا بھائی احمت ہے جو اپنے جرمن معلم سے شیکسپیر
[illegible] پڑھ رہا ہے، چوں کہ ان دنوں انگریزوں اور جرمنوں کے درمیان جنگ

— مدرسہ ترک طالبات کے لیے دو سال تک انگریزی زبان کے خصوصی نصاب کا اہتمام کرتا ہے
تا کہ یہ باقی طالبات کے ساتھ چلنے کے قابل ہو جاتی ہیں
ترکی جذبہ وطن پرستی صرف اسی بات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ چند قدم اور آگے جاتا ہے۔
غیر ملکی مدرسے قانوناً اس بات پر مجبور ہیں کہ ملکی تاریخ و جغرافیہ کو اپنے نصابوں میں شامل
کریں، یہ مضامین خالص قومی نقطہ نگاہ سے پڑھائے جاتے ہیں۔ ان مضامین کی تدریس غیر ملکی
استادوں کے ذمہ نہیں بلکہ ترک استادوں کے ہاتھ میں ہے، اس کے علاوہ نصاب مدرسہ میں
بعض ایسے مضامین بھی شامل ہیں جو برطانوی مدرسوں کے نصاب میں دکھائی نہیں دیتے، مثلاً
ترکی مجلسی انقلاب کی تاریخ اور بری و بحری فوج کی تربیت ایسے امتحانی مضامین ہیں جن میں
پاس ہونا ضروری ہے، مدرسے کے سارے نصاب کو ایک نمایاں قومی رنگ دیا گیا ہے، مثلاً
پہلی کتاب کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔
"کمال اتاترک ہمارے ملک کے باپ تھے انہیں بچوں سے بے حد محبت تھی، ہم ترک بچے
بھی ان سے محبت کرتے ہیں۔ اتاترک زندہ باد"
اتاترک کی تصویر مدرسے کے ہر کمرے میں دکھائی دیتی ہے، اس کے اقوال تمام کتابوں میں
بکھرے نظر آتے ہیں، اس کی وفات کا دن قومی سوگ کا دن ہے، اس روز انگریزی مدرسہ کے
ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوتا ہے جس میں تمام طالبات اور استانیاں شامل ہوتی ہیں، ایک ترک
استانی مجمع کو خطاب کرتی ہے اور سامعین کو دل گداز الفاظ میں بتاتی ہے کہ اتاترک نے اپنے
ملک اور اس کی عورتوں کے لیے کیا کچھ کیا۔ آخر الامر جذباتی تناؤ اس حد کو جا پہنچتا ہے کہ تقریر
کرنے والی اور سننے والیاں تمام ہچکیاں لے لے کر آنسوؤں کے دریا بہانے لگتی ہیں۔

ترکی زندگی کی ایک جھلک

انگریزی زنانہ مدرسہ میں صرف اونچے طبقے کی ترک لڑکیاں
پڑھتی ہیں، اس طبقے کی گھریلو زندگی کے متعلق ایک انگریز
معلمہ نے اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں جو دوسری عالمی جنگ کے دنوں میں یہاں پڑھانے پر

مامور تھی، اسے مدرسہ میں آئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ اس سے پوچھا گیا کہ آیا وہ ایک ترک لڑکی کی نجی معلمی اختیار کرنا پسند کرے گی، اس سے نہ صرف اس کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا بلکہ چند ترک گھرانوں کے ساتھ مراسم بھی قائم ہو جائیں گے۔ معلمہ نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔

اسے ایک نوجوان ترک لڑکی کو پڑھانے کے لیے کہا گیا جس کا نام سیوم تھا۔ سیوم ایک امیر سوداگر کی لاڈلی بیٹی تھی۔ انگریز معلمہ ہفتہ میں دو بار اس کے گھر پڑھانے جایا کرتی تھی۔ سیوم ہائی اسکول کی پڑھائی ختم کر چکی تھی، ابھی اس کی شادی میں کوئی دو سال کا عرصہ باقی تھا اور وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر کچھ انگریزی اور نفیس سلائی سیکھنا چاہتی تھی۔

سیوم کا گھر نہایت قیمتی سامان آرائش سے مزین تھا، کمروں میں بھاری غالیچے بچھے تھے جوں ہی انگریز استانی آتی نوکر قہوہ یا چائے لے کر آتا، تھوڑے یا چائے کے دور کے ساتھ ہی ہلکی پھلکی گفتگو شروع ہو جاتی، نجی معلمی کا یہ سلسلہ کوئی دو سال جاری رہا۔ لیکن اس عرصہ میں سیوم نے شیکسپیر کے ڈرامہ رومیو جولیٹ کے سوا اور کچھ نہ پڑھا، دراصل اسے پڑھائی سے چنداں رغبت نہ تھی۔ انگریز معلمہ کا آنا جانا محض ایک دل لگی کا سامان پیدا کر دیتا تھا اور بس۔ اس دو سال کے عرصہ میں استانی صرف ایک بار سیوم کی والدہ سے ملاقات کر سکی یہ ایک بھاری بھرکم ترک خاتون تھیں جو طلائی کرسی پر قیمتی لباس پہنے بیٹھی تھیں، لیکن چونکہ وہ انگریزی سے بالکل نابلد تھیں اور استانی کو ترکی زبان کے چند الفاظ کے سوا اور کچھ نہ آتا تھا، اس لیے دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہو سکی، سیوم کے والد نے استانی سے کبھی ملاقات نہیں کی، حالاں کہ وہ کئی مرتبہ اس کی موجودگی میں گھر پر ہوتا تھا

سیوم اور انگریز استانی جس کمرے میں بیٹھا کرتی تھیں، اس سے اگلے کمرے میں اکثر آواز و نگی بڑبڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ سیوم کا بھائی احمت ہے جو اپنے جرمن معلم سے شیکسپیر کا ڈرامہ میکبتھ پڑھ رہا ہے، چوں کہ ان دنوں انگریزوں اور جرمنوں کے درمیان جنگ

جاری تھی، اس لیے اہل خانہ اس بات کا خاص اہتمام کرتے تھے کہ انگریز معلمہ اور جرمن معلم کی آپس میں مڈبھیڑ نہ ہونے پائے، یہ کوشش پوری طرح کامیاب رہی، استانی نے دو سال کے عرصہ میں احمت کے جرمن استاد کی شکل تک نہ دیکھی، بلکہ اس نے خود احمت کو ایک بار بھی نہیں دیکھا۔

عام ترک نوجوانوں کی طرح احمت اپنے گھر پر خوب مسلط تھا، اگرچہ اس کی عمر صرف سولہ سال کی تھی پھر بھی گھر میں اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہ ہو سکتا تھا، سیوم کو کسی تقریب پہ گھر سے باہر جانا ہوتا تو احمت اس کے ساتھ جاتا، کیوں کہ ایک نوجوان لڑکی کا کسی قریبی رشتہ دار کے بغیر اکیلے گھر سے نکلنا معیوب خیال کیا جاتا ہے، ایک روز سیوم کو کسی شادی میں شمولیت کے لیے جانا تھا، احمت نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا، سیوم رو دھو کر چپ ہو رہی، مگر احمت نے اپنا ارادہ نہ بدلا۔ ایک اور روز سیوم اور اس کی ماں ایک چائے کی دعوت پر جانے کو تیار تھیں احمت کو ان کا جانا پسند نہ تھا، اس نے ان کے تمام جوتے چھپا دیے۔ اس طرح ماں بیٹی اس دعوت میں شریک نہ ہو سکیں، انگریز معلمہ کو اس ترک خاندان کے متعلق اس سے زیادہ اور کوئی معلومات ہاتھ نہ لگ سکیں حالاں کہ وہ پورے دو سال تک سیوم کی معلمہ اور سہیلی بنی رہی۔

حرف آخر ترکوں کی مغرب زدگی کے متعلق ہم عجیب و غریب قیاس آرائیوں کے عادی ہیں، مگر اوپر جو حقائق دیے گئے ہیں، انہیں دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ترکوں نے مغرب کی سچی تہذیب کے ظواہر کو غیر مشروط طور پر اپنایا ہے، ان ظواہر میں سے بعض یقینی طور پر ناپسندیدہ ہیں لیکن بایں ہمہ یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ مغربی تہذیب کو اپنانے کے ساتھ ہی ترکوں نے اس امر کی کافی کوشش کی ہے کہ ان کی مخصوص قومی روح مٹنے نہ پائے۔ یہ کوشش انفرادی سطح پر نہیں بلکہ قومی اور حکومتی سطح پر کی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے نتائج اکثر حالتوں میں تسلی بخش ہیں۔

آج پاکستان کو بھی اس مسئلہ کا سامنا ہے کہ وہ اپنے یہاں مغربی طور طریقوں کو کس طرح رواج دے، اس ضمن میں آج تک کوئی قومی منصوبہ منظر عام پر نہیں آیا، افراد کو کھلی چھٹی ہے کہ وہ جس حد تک چاہیں مغرب

اثرات قبول کریں. طواہر کے معاملہ میں شاید یہ اجازت اتنے دوررس نتائج کی حامل نہیں جتنی کہ ذہنی اور اخلاقی امور میں. ہر قوم اور ہر تہذیب اپنے مخصوص قومی کردار کے بل بوتے پر جیا کرتی ہے. یہ کردار چند ذہنی، اخلاقی اور روحانی اقدار کے سوا کچھ نہیں. اگر کوئی قوم اجتماعی سطح پر اس بات کا اہتمام نہیں کرتی کہ اسکی مخصوص ذہنی، اخلاقی اور روحانی اقدار نئی پود کے دل و دماغ میں جڑ پکڑیں اور پھلیں پھولیں تو وہ قوم اپنی یکجہتی اور سالمیت کے بارے میں مطمئن نہیں رہ سکتی. ان اقدار کی بقا و اشاعت کے لیے تعلیم ہی کو ذریعہ بنایا جا سکتا ہے. تعلیم ہی وہ آلہ ہے جس کی مدد سے کوئی قوم اپنی آنے والی نسلوں کو اپنی مخصوص روایات منتقل کر سکتی ہے. اس آلے کا استعمال کلی طور پر قوم کے اپنے ہاتھوں میں ہونا چاہیے اسے غیروں کے ہاتھ میں دے دینا ایک بہت بڑے خطرے کا دروازہ کھولنا ہے. اس معاملہ میں ترکی کی مثال ہمارے لیے بہت سبق آموز ہے. ہمیں چاہیے کہ غیر ملکی تعلیمی اداروں اور ہسپتالوں کے متعلق اپنی حکمت عملی پر پہلی فرصت میں نظر ثانی کریں اور ان اداروں کو مکمل طور پر بنیادی قومی مقاصد کے تابع بنائیں۔

معلم اور تعلیم

شبیر احمد قاری

اس سے غالباً کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ قوم اور ملک کے مفاد کے لیے تعلیم اسی قدر ضروری ہے جتنی کسی فرد کے لیے، دراصل تعلیم ہی قومی ترقی کا سنگ بنیاد ہے۔ قیام پاکستان کے بعد تعلیم کا مسئلہ پہلے سے بہت زیادہ اہم ہوگیا ہے، اور معلمین کی ذمہ داریاں بھی بہت بڑھ گئی ہیں، اگر ہمیں اقوام عالم کی برادری میں ایک باعزت اور مناسب مقام حاصل کرنا ہے تو ہمیں اپنے نظام تعلیم اور طریقۂ تعلیم پر پوری توجہ دینی ہوگی۔ اب تک اس سلسلہ میں ہمارے یہاں جو کچھ ہو چکا ہے، بادی النظر میں وہ بہت کچھ معلوم ہوتا ہے، اگر مدرسوں کی تعداد کا جائزہ لیجیے تو وہ کچھ ایسی کم نہیں اور الحمدللہ مدرسین کی تعداد بھی کافی ہے۔ پھر وہ کیا چیز ہے جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے؟ دراصل مدرسوں اور مدرسین کی تعداد "نام" کی چیزیں ہیں اور ظاہر ہے کہ صرف "از نام" سے مقصد نہیں حاصل ہوا کرتا۔ حصول مقصد کے لیے "کام" کی ضرورت ہے۔

اس سے مجھے بھی انکار نہیں کہ محض مدرسوں اور طالب علموں کے، اعداد و شمار پیش کر کے ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ پاکستان بھی تعلیم کے معاملہ میں اکثر مہذب قوموں سے پیچھے نہیں۔ مگر اس کا جواب صرف ہمارے ضمیر ہی دے سکتے ہیں کہ آیا وہ مقصد جس کے لیے مدرس اور مدرسہ کی ضرورت ہوتی ہے ہمارے موجودہ اسکولوں سے پورا ہو رہا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو پھر وہ کیا تدابیر ہیں جو ہمیں حصول مقصد کے لیے اختیار کرنی ہوں گی۔ میرے خیال میں ہمارے نظام تعلیم اور طریقۂ تعلیم دونوں اصلاح چاہتے ہیں اور ان دونوں کی اصلاح تب ہی ممکن ہے جب ہمارے پاس نہ صرف اچھے استاد کافی تعداد میں موجود ہوں بلکہ وہ اپنے پیشے میں دلچسپی بھی لیتے ہوں۔ میں اس مضمون میں آپ کی توجہ صرف "اچھے استاد" کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اچھے استاد

نظامِ تعلیم اور طریقۂ تعلیم دونوں میں انقلابِ عظیم پیدا کر سکتے ہیں۔

ہمارے یہاں بدقسمتی سے معلمی کا پیشہ آسان ترین پیشہ سمجھ لیا گیا ہے تعلیمی اداروں کی کس مپرسی اور ملک میں اس اعلیٰ پیشہ کی بے وقعتی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جنہیں دوسرے پیشوں سے ناکامی ہوتی ہے مجبوراً حصولِ معاش کے لیے اس طرف رخ کرتے ہیں، یہ بات بالکل وضاحت طلب نہیں کہ ہر دروازے سے ناکام لوٹنے والے اصحاب اس پیشے سے کتنی دلچسپی رکھتے ہوں گے البتہ غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ اگر چند روز یہی حالت رہی تو ہمارے ملک میں تعلیم و تعلم کا کیا حشر ہوگا! میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ "کارِ طفلاں تمام خواہد شد"

معلمی ایک بہت مشکل فن ہے اور معلمی کا پیشہ ایک ایسا پیشہ ہے جس کا مقصد صرف حصولِ زر نہیں کچھ اور بھی ہے، مجھے اس وقت لندن کے ایک صحافی کا واقعہ یاد آیا، صاحبِ موصوف کا نام مسٹر ویکہم اسٹینڈ تھا وہ عرصہ تک لندن کے مشہور اخبار "ٹائمز" کے ایڈیٹر رہے تھے کسی وجہ سے ان کا اخبار کے مالک سے پالیسی کے معاملہ میں اختلاف ہوگیا جس کی بنا پر انہیں استعفیٰ دینا پڑا۔ اخبار کے مالک نے ان کی خدمات کے صلہ میں دو لاکھ پونڈ کا چیک پیش کیا، جسے انہوں نے وصول کرانے کے بجائے فریم کرکے اپنی میز پر رکھ لیا، ان کی حمیت نے اس کو گوارا نہ کیا کہ معاوضہ لے کر اپنے اعلیٰ پیشہ کے دامن کو داغدار کرلیں۔ اتنا ضرور ہے کہ "مرد دو بر خوش دل کنند کار دنیا" انسانی مادی ضروریات کی اہمیت بہت زیادہ ہے، اساتذہ کی مالی مشکلات ضرور رفع کی جانی چاہئیں کیوں کہ ان کا کام زیادہ ذہنی سکون چاہتا ہے، مگر جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے معلمی ایک ایسا پیشہ ہے جس کا مقصد حصولِ معاش کے علاوہ کچھ اور بھی ہے، اساتذہ کی مالی حالت بہتر ہونے کے بعد بھی یقیناً بہت زیادہ تعداد ایسے اساتذہ کی ہوگی جو اس پیشہ کو صرف حصولِ معاش کی خاطر اختیار کریں گے، اور بہت سے اصحاب جن کی تمناؤں کا مرکز اب دوسرے پیشے ہیں اس پیشے کو صرف اس لیے قابلِ اعتنا سمجھیں گے کہ اب یہاں بھی ترقی کے مواقع بہت ہیں اور پھر کام واجبی۔۔۔۔؟ میرا یہ اندیشہ غلط نہیں ہے، اس کی جھلک فی الحال کالج کے اساتذہ کے نئے گریڈوں میں نظر آرہی ہے — لہٰذا

تعلیم دینے والوں کی معاشی حالت سدھارنے کے بعد بھی یہ ضروری نہیں کہ تعلیمی اداروں اور معیارِ تعلیم
پر بھی اس کا اثر پڑے گا، ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پیشے کی پوری نزاکتوں کو پیشِ نظر رکھا جائے اور صرف
ان اصحاب کو ترجیح دیا جائے جو تعلیم و تعلم سے فطری مناسبت رکھتے ہوں اور جو معاشی ضروریات کے
حصول کے لیے نہیں بلکہ ذہنی اور روحانی سکون کے لیے یہ پیشہ اختیار کریں - جو اسے "واجبی کام"
اور "علیٰ تنخواہ" والی زندگی سمجھنے کے بجائے اپنی پوری ذمہ داریوں کا احساس رکھتے ہوں جنہیں اس
بات کا پورا احساس ہو کہ تعمیرِ قومی کی جو عظیم ذمہ داری اور سماجی بہبود کا جو بارِ گراں ان کے سپرد ہوا ہے
کہیں وہ اسے اٹھانے کے سلسلہ میں کوتاہی تو نہیں کر رہے جو اپنے افسر کے سامنے جوابدہ ہونے کے
بجائے اپنے ضمیروں کے سامنے جواب دہ ہوں۔

اس سلسلہ میں ایک صاحب کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان کا فرضی نام زید سمجھ لیجیے۔ زید کے
والد اس زمانے کے ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر تھے جب انگریزی دورِ حکومت اپنے شباب پر تھا اور انسپکٹر
ہونا ایک دیسی کے لیے معراجِ کمال سمجھا جاتا تھا۔ زید کے بھائی انجینیر تھے۔ اس زمانہ میں متحدہ
ہندوستان میں صرف ایک انجینیرنگ کالج تھا جو رڑکی میں واقع تھا، زید کے بھائی کی خواہش تھی کہ
وہ ایف۔ ایس سی کے بعد انجینیرنگ کلاس میں داخل ہو، مگر زید کی دلچسپیوں کا مرکز کچھ اور ہی تھا۔
وہ اپنے تخیل کی دنیا میں کبھی اسکول کے لڑکوں کو سائنس کبھی جغرافیہ اور کبھی تاریخ پڑھاتا۔ ایف۔
ایس سی کرنے کے بعد اس نے اپنے بھائی کو لکھ بھیجا کہ انجینیرنگ کے داخلہ کے لیے مقابلہ میں زیادہ
تعداد ان لوگوں کی کامیاب ہوتی ہے جو بی۔ ایس سی کر چکے ہوں، چنانچہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب
ہوگیا اور وہ بی۔ ایس سی میں داخل ہوگیا۔ بی۔ ایس سی کرنے کے بعد اس نے اپنے بھائی کو لکھا کہ "میں
ایم اے یا ایم۔ ایس سی کرکے کالج میں لکچرار ہونا چاہتا ہوں"۔ چنانچہ اسے ایم۔ ایس سی میں
داخل کرا دیا گیا، اس کے والد اسے پولیس میں بھیجنا چاہتے تھے کیوں کہ وہ فوجی تربیت
حاصل کرنے کا دلدادہ تھا، مگر اس نے پولیس میں جانے سے انکار کر دیا، اس کے بھائی
نے یہ دیکھتے ہوئے کہ اسے انجینیرنگ سے دلچسپی نہیں ہے اسے محکمہ جنگلات اور

دوسرے مقابلے کے امتحانات میں شرکت کا مشورہ دیا۔ مگر زید کے لیے ان میں کوئی دلچسپی نہ تھی، چنانچہ بھائی کے حکم کی خاطر وہ امتحان میں تو شریک ہوا، مگر ایسی بے دلی سے کہ وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہی ہوا کہ اس نے اپنے پلان کے مطابق ایم۔ ایس سی کر لیا اور باوجود اس کے کہ اس کے بھائی اسے انگلستان سے پی۔ ایچ۔ ڈی کرانا چاہتے تھے اس نے بی۔ ٹی کیا اور کالج میں لیکچرار ہو گیا۔ اس مثال سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ صحیح معنوں میں معلم وہی بن سکتا ہے جو زید کی طرح ہر پیشے کو نظر انداز کر کے فقط معلمی ہی کو منتہائے مقصود سمجھے۔ ایسے استاد ہی "معمار قوم" کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

ہمارے نوجوانوں کو معلمی کا پیشہ اختیار کرنے سے پہلے اس کی پوری ذمہ داریوں کو نظر میں رکھ کر یہ غور کرنا چاہیے کہ کیا ان کے دل میں اس پیشے کے لیے سچی تڑپ ہے؟ کیا وہ اس بار گراں کو اٹھا سکیں گے؟ کیا ان میں اس قدر قربانی کا مادہ ہے کہ قوم کے لیے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیں؟ انہیں سوچنا چاہیے کہ وہ اس پیشے کی سطحی آسانی کی وجہ سے تو اسے پسند نہیں کر رہے؟ ——— میں نے یہ بات اس لیے کہی کہ نوجوان پیشے کے انتخاب میں عموماً جلد بازی سے کام لیتے ہیں، وہ خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں اور اپنی فطری سہل انگاری کے طفیل مشکل سے مشکل کام کو آسان سمجھ لیتے ہیں، یوں بھی عموماً لوگ کسی کام میں عملی حصہ لینے سے پہلے اس کی نزاکتوں سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اگر کسی نوجوان نے اپنے فطری میلان کے خلاف معلمی کا پیشہ صرف اس کی ظاہری رنگینی سے متاثر ہو کر اختیار کر لیا تو یہ نہ صرف اس کے لیے دردِ سر بن جائے گا بلکہ ملک اور قوم کے لیے بھی مضرت رساں ثابت ہوگا۔

معلمی ایک عجیب فن ہے، کوئی آدمی ایک بہت بڑا عالم ہو سکتا ہے، مگر ضروری نہیں کہ وہ ایک اچھا استاد بھی ہو (میرے ایک استاد جو کیمرج اور کاٹنجن دونوں سے فزکس اور ریاضی میں پی ایچ۔ ڈی، اور ڈی ایس سی کر چکے تھے بطور معلم کے ناکام تھے۔ اور

حیثیت طالب علم ہم لوگ ان سے کچھ استفادہ نہ کر سکے، برخلاف اس کے اگر عالم میں معلم کی خوبیاں بھی شامل ہو جائیں تو یہ ایک بڑی نعمت ہے جس طرح ہر فن کے لیے انسان کی افتادِ طبع اور میلانِ فطری کی ضرورت ہے، اسی طرح معلم کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان فطرتاً اس سے مطابقت رکھتا ہو اور پھر بطورِ فن کے اس کا اکتساب کرے، کوئی شخص صرف مصوری کے اصولوں سے واقف ہو کر مصور ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، تاوقتیکہ اس کے علم کے ساتھ اس کی فطری صلاحیتیں بھی کارفرما ہوں، اسی طرح صرف اصولِ تعلیم سے واقف ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ایسا کرنے سے آدمی اچھا استاد بن جائے گا۔

استاد کے لیے ایک خاص قسم کی شخصیت ضروری ہے، اسے ایک مکمل انسان ہونا چاہیے۔ اس کے اطوار و اوصاف ایسے دلنشین ہونے چاہئیں کہ لوگ خواہ مخواہ اس کی طرف کھنچنے پر مجبور ہوں، وہ اپنے طالب علموں کے لیے وبالِ جان ہونے کے بجائے ان کا ہمدرد اور دوست ہو، اس کی باتوں میں ایسی کشش ہو کہ طلبا اس کی نصیحتوں سے اکتانے نہ پائیں، اس کے انداز میں وہ دلکشی ہو کہ طالب علم خود بخود اس سے محبت کرنے اور اس کا کہنا ماننے پر مجبور ہوں، وہ جس بات کو اچھا کہے اسی کو اچھا سمجھا جائے اور جس کی برائی کرے وہ بری قرار پائے، اس کا اخلاق اتنا بلند ہو کہ بچے اس سے گستاخی کر کے خود ہی شرمندہ ہو جائیں، اس کی مجموعی شخصیت ایسی دلکش اور قابلِ پرستش ہو کہ طلباء کے لیے مثال بن جائے، مختصر یہ کہ اس کے اوصاف اتنے متاثر کرنے والے ہوں کہ جن اچھی باتوں کا وہ سبق نہ بھی دے طلبا خود بخود اس سے سیکھ لیں، درسگاہیں صرف کتابیں پڑھانے ہی کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ اس سے بہت زیادہ ارفع و اعلیٰ مقاصد ان سے وابستہ ہوتے ہیں، استاد کی شخصیت مدرسے میں وہ ماحول پیدا کر سکتی ہے جو بچوں کو اپنی سماجی زندگی کی تشکیل و تعمیر کے قابل بنا سکے اور ایسے شہری پیدا کر سکے جو اپنے فرائض اور حقوق سے پوری طرح واقف ہوں، تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ طلباء میں صحیح قوتِ فیصلہ پیدا کی جائے وہ اچھی اور بری چیزوں میں تمیز کرنے اور صحیح نتائج پر پہنچنے کے قابل ہوں۔ (۱)

اتنی اخلاقی جرأت ہو کہ اپنے فیصلوں پر ہر حال میں قائم رہ سکیں۔ مختصر یہ کہ درس گاہوں کا مقصد امتحان پاس کرانے کی بجائے انسان پیدا کرنا ہونا چاہیے، اور اگر ہماری درس گاہیں اس مقصد میں کامیاب ہو جائیں تو ہماری قوم کی خوش قسمتی کی انتہا نہ رہے۔

استادوں کی تعلیم کے لیے جو درس گاہیں مخصوص ہیں ان پر بھی اچھے اساتذہ پیدا کرنے کے سلسلہ کئی اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ استادوں کی تعلیم کے طریقوں کو بہتر بنانے کے علاوہ انہیں داخلہ کے لیے آنے والے اساتذہ کا پوری طرح جائزہ لینا چاہیے۔ ہمارے یہاں استادوں کی اکثریت اعصابی امراض کی شکار ہے، وہ بہت جلد پریشان ہو جاتے ہیں اور اکثر اپنی گھبراہٹ اور غصہ پر قابو نہیں پا سکتے۔ ایک اچھے استاد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سنجیدہ اور متوازن رہے۔ اس میں اتنی قوت برداشت ہونا چاہیے کہ وہ بچوں کے احمقانہ سوالات پر ناراض ہونے کے بجائے ان سے ہمدردی سے پیش آ سکے، ان کی شرارتوں سے بد دل ہونے کی بجائے ان سے امیدیں وابستہ رکھ کر اصلاح کی کوشش کر سکے اور ان کی بد تمیزیوں سے رنجیدہ نہ ہوتے ہوئے انہیں تہذیب کی خوبیوں سے واقف کر سکے۔

بی۔ ٹی اور دوسری جماعتوں میں داخل ہونے والے اصحاب کی ایک مخصوص تعلیمی بنیاد ہونی چاہیے وہ ملکی مسائل سے اچھی طرح واقف ہوں، انہیں اپنی تہذیب اور تمدن سے کافی لگاؤ ہونا چاہیے۔ ان کے دل میں قوم کا درد اور جذبۂ خدمت ہونا ضروری ہے، انہیں علمی کے پیشے سے فطری مناسبت ہونی چاہیے ان کا علمی اور اخلاقی بے داغ اور قابل تقلید ہونا چاہیے۔ ٹریننگ کالج کے ارباب اختیار اور محکمۂ تعلیم کو اس امر پر پوری توجہ دینی چاہیے کہ وہ لوگ جو اخلاقی کمزوریوں کا شکار رہیں جو نفسیاتی طور پر غیر صحت مند ہیں اور جن کی تعلیمی بنیاد مضبوط نہیں ہے، انہیں ہرگز اس پیشہ میں نہ آنے دیا جائے۔ اس سلسلہ میں داخلہ کے لیے امیدوار طلبا کا کسی طرح امتحان لینا ہوگا جس میں میرے نزدیک نفسیاتی معائنہ سب سے زیادہ ہے اس کے لیے ایک ماہر نفسیات کی خدمات درکار ہوں گی، جو داخلہ کے لیے آنے والے طلبا کا تجزیہ نفسی کر کے یہ معلوم کرے کہ کیا ذہنی اعتبار سے وہ اس قابل ہیں کہ استاد بن سکیں، بالکل ایسا ہی معائنہ

فوج میں کمیشن دینے سے پہلے کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام باتوں سے مقصد یہ ہے کہ ہمارے یہاں ایسے معلم پیدا ہو سکیں جن کا وجود قوم کے لیے خوش قسمتی کی علامت ہوا کرتا ہے۔ ہمیں مدرس نہیں بلکہ "معلم" اور تعلیمی مفکر درکار ہیں ہمیں وہ مدرس نہیں چاہییں جو لکیر کے فقیر ہو کر ٹریننگ کالج میں سیکھے اصولوں پر کولھو کے بیل کی طرح چکر لگاتے رہیں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے تعلیم ایک فن ہے اور معلم ایک فنکار ــــ ہر فنکار ایک الگ فلسفہ رکھتا ہے اور تمام بڑے فنکاروں کی طرح ایک اچھا معلم ایک مخصوص فلسفۂ تعلیم رکھتا ہے۔ جس کا خالق وہ خود ہوتا ہے۔ اسے وہ عام شاہراہ سے ہٹ کر اپنے لیے وضع کرتا ہے۔ اسی سے وہ اپنے کام کے سلسلہ میں نت نئے سوالات حل کرتا ہے اور یہی اس کی روح کو تسکین دیتا ہے، ٹریننگ کالج کی تعلیم کا یہ مقصد ہرگز نہیں لیا جانا چاہیے کہ وہاں استادوں کو زندگی بھر کے لیے ایک ڈگری دے دی جاتی ہے بلکہ وہاں صرف منزل کا سراغ بتایا جاتا ہے، تلاش منزل خود استاد کا کام ہے۔ معلم میں نابغہ (GENIUS) کی خصوصیات ہونی چاہییں۔ اسے اپنی ذہانت سے خود نئے راستے دریافت کرنے کے قابل ہونا چاہیے اور یہ طریقۂ تعلیم قوم کے فلسفۂ تعلیم سے ہم آہنگی رکھتا ہو۔ اس مقام پر بعض قارئین کے دل میں غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہو سکتا ہے۔ ان کے ذہن میں فوراً یہ خیال پیدا ہوگا کہ وہ ملک جہاں معلمین کو نہایت ناکافی تنخواہیں دی جاتی ہیں کس طرح . . . یہ امید کر سکتا ہے کہ نابغہ کی خصوصیات رکھنے والے حضرات معلمی کو اپنے حصولِ معاش کا ذریعہ بنائیں گے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ وہ نابغے جسے (GENIUS) کہا جاتا ہے شاید قدرتی ہوتی ہو لیکن جس چیز میں کسی کو قدرتی دلچسپی ہو، وہ اس کام میں ایسے ایسے ذرائع اور طریقے استعمال کر لیتا ہے جس کا دوسروں کو خیال نہیں آتا، نہ صرف خیال نہیں آتا بلکہ اگر ان کو بتایا جائے کہ فلاں شخص ایسا کر رہا ہے تو وہ اس کے خلاف دلائل دینے لگتے ہیں، حالاں کہ چاہیے یہ کہ دانایانِ سائنس کی طرح شانہ کر کے نتائج کا انتظار کریں، اور اگر نتائج عمدہ ہوں تو ان طریقوں کو اپنا لیا جائے۔ مثلاً یہ ایک عام خیال ہے کہ بی۔ ٹی کی تعلیم اسکولوں میں پڑھانے والے معلمین کے لیے تو بالکل ضروری ہے،

مگر کالجوں میں پڑھانے والے معلمین کے لیے بالکل غیر ضروری۔ بعض حضرات تو ایک قدم اور
آگے بڑھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بی۔ ٹی کرنے والا شخص کالج میں تعلیم دینے کی قابلیت کھو
بیٹھتا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کالج میں پڑھانے والے کو اگر سائیکالوجی آتی ہو اور طلبا
سے باقاعدہ کام کرانے کا ڈھنگ آتا ہو تو وہ طلبا سے زیادہ کام لے سکتا ہے۔ پروفیسر
اپنا لکچر فرفر دے کر چلا جاتا ہے تو کتنے طلبا ایسے ہوتے ہیں جنہیں لکچر کا چوتھائی حصہ سمجھ میں آگیا
ہو یا دسواں حصہ یاد رہ گیا ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کے امتحان میں پاس ہونے
والوں کی تعداد پچاس ساٹھ فی صدی کے قریب رہتی ہے، اور پھر اخباروں میں شور مچتا ہے
کہ نونہالان قوم کا روپیہ اور وقت ضائع ہو رہا ہے اور اس کا سبب یونیورسٹی سلیبس کا ناقص
ہونا قرار دیا جاتا ہے۔ زید بی۔ ٹی تھا۔ کالج میں پڑھاتا تھا۔ طلبا اس کی کلاس میں دلچسپی لیتے
تھے اور وہ لڑکوں سے اچھی طرح کام لیتا تھا۔ بی۔ ٹی ہی کی وجہ سے اس میں یہ صفت پیدا ہوگئی
تھی، یا اگر پہلے سے موجود تھی تو اجاگر ہوگئی تھی کہ مضمون کو دلچسپ بنا کر پیش کرنا چاہیے۔ اگر
مضمون کا موضوع ایسا ہو کہ اسے دلچسپ نہ بنایا جا سکتا تھا تو وہ کلاس روم، کو دلچسپ
بنا دیتا تھا، وہ اپنے آپ کو اپنے مضمون تک محدود نہ رکھتا تھا، بلکہ موقع بہ موقع ایسی معلومات
بھی بہم پہونچا دیتا تھا جس کا اس مضمون سے کوئی تعلق نہ ہوتا، مثلاً حاضری لیتے ہوئے دیکھتا
کہ ایک لڑکا متواتر پانچ چھ روز سے غیر حاضر ہے تو پوچھتا کہ کوئی اس کی غیر حاضری کا سبب بتا
سکتا ہے، کوئی لڑکا بول اٹھتا کہ اسے کھانسی اور بخار ہے، تو وہ سب کو اس بات پر لکچر پلا
دیتا کہ کھانسی بخار کی وجہ دراصل معدے کی خرابی ہے اور معدہ غیر متوازن غذا کی وجہ سے
خراب ہوتا ہے، اس کی جماعت میں ایک "بلی" بولی اور ساری جماعت ہنس پڑی تو اس نے کلاس
غصہ نہیں دکھایا نہ اس نامعلوم "بلی" کی شخصیت کی تلاش کی، بلکہ اپنا سبق یا لکچر جو کچھ بھی
تھا چھوڑ کر ایک عجیب و غریب بلّے کی کہانی سنا دی جو دراصل ایک جن تھا اور بلّے کی جون میں
ایک تنہا رہنے والے شخص کے پاس رہتا تھا، اور اس شخص کی آنکھ بچا کر اپنی دم سے بانسری بجایا

کرتا تھا، چناں چہ طلباء کی دہنی جو معلم کی شخصیت کی طرف رجوع کر رہی تھی، اس "نامعلوم" بلی ہی کی طرف منحرف ہو گئی۔

مذکورہ بالا مثال سے میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جو معلم اپنے کام اور طلباء میں دلچسپی لیتا ہو اور طلباء کو اپنے کام میں دل چسپی دلا سکتا ہو اور ان کو امتحان میں زیادہ تعداد میں پاس کرا سکتا ہو، میرے نزدیک وہی معلم ایک نابغہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمیں ایسے معلموں کی ضرورت نہیں ہے جو یہ جانتے ہوں کہ "ایسا ہونا چاہیے" بلکہ ایسے معلمین کی ضرورت ہے جو دوسرے معلمین کو یہ بتا سکیں کہ "میں نے ایسا کیا اور اس کا یہ نتیجہ نکلا"۔

تعلیم کہاں لے جا رہی ہے؟

ادریس احمد

ایک صاحب نظر عالم کا قول ہے کہ لکھنا پڑھنا تعلیم کے مترادف نہیں، اکثر حالتوں میں یہ تعلیم کی طرف پہلا قدم ضرور ہے، لیکن یہ لازمی قدم نہیں، لکھنا پڑھنا سیکھنے یا سکھانے سے پہلے یہ طے کر لینا چاہیے کہ ان مہارتوں سے کیا کام لینا مقصود ہے۔

تعلیم کس چیز کا نام ہے؟ یہ تجربے کی اس تعمیر نو کا نام ہے جس سے اس کے معانی میں اضافہ ہو جائے اور آئندہ تجربہ کا رخ معین کرنے کی صلاحیت بڑھ جائے۔ تعلیم نگاہ میں نئی وسعتیں اور دل میں نئی گہرائیاں پیدا کرتی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد کائنات کے ہر ذرے میں نیا حسن نظر آنے لگتا ہے، لکھائی پڑھائی محض دو آلے ہیں جن کی مدد سے نوع انسان کے جمع کردہ علم و حکمت کے ذخیروں تک پہونچا جا سکتا ہے، لکھائی پڑھائی بذات خود مقصود نہیں، یہ ایک بلند تر منزل کی طرف بڑھنے کے لیے زینہ ہے۔

جدید تعلیم کے سامنے مشکل سوال

جدید ریاست کی ذمہ داریوں میں یہ بھی شامل ہے کہ اپنے شہریوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے، پہلے صرف وہی لوگ لکھنا پڑھنا سیکھتے تھے جنہیں حکومتی ذمہ داری، دفتر کا کام یا ذمہ دارانہ کاروباری فرائض انجام دینے ہوتے تھے۔ آج ریاست کا ہر شہری پڑھنا لکھنا سیکھ رہا ہے۔ وہ اس صلاحیت سے کیا کام لے گا؟ اس جواب کے تسلی بخش ہونے پر جدید ریاست کی آئندہ فلاح کا مدار ہے۔ دنیا آج ایک ہمہ گیر سائنسی انقلاب میں سے گذر رہی ہے۔ یہ انقلاب انسانوں کے ہاتھ میں خیر و شر کی بے پناہ قوتیں عطا کر رہا ہے، جو بچے آج مدرسوں میں پڑھ رہے ہیں بڑے ہونے پر وہ ان بے پناہ قوتوں کے امین ہوں گے۔ وہ انہیں بھلائی یا برائی جس کے لیے چاہیں

استعمال کر سکیں گے۔ نوع انسان کی اجتماعی بہبود کے لیے یہ امر بے حد ضروری ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کو لکھائی پڑھائی سے پسندیدہ کام لینا سکھایا جائے۔ اگر اس کے برعکس پڑھنا لکھنا سیکھ کر وہ ناپسندیدہ لٹریچر اور غلیظ قسم کی کتابوں اور رسالوں میں دلچسپی پیدا کر لیتے ہیں تو لکھنا پڑھنا بجائے سودمند ہونے کے نقصان دہ ثابت ہوگا، وہ وسائل جو تعمیری کام پر صرف ہو سکتے تھے تخریب کی نذر ہو جائیں گے۔

انگلستان کی حالت

تعلیم اور رائے عامہ کی بیداری کے معاملہ میں انگلستان کا شمار دنیا کے راہ نماؤں میں ہوتا ہے۔ ناخواندگی اس ملک سے قریباً قریباً ناپید ہو چکی ہے۔ لیکن بچوں اور نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کے اطوار و کردار اس کی بدولت جن تباہ کن اثرات کا نشانہ بن رہے ہیں ان کے متعلق نیشنل یونین آف ٹیچرز نے گذشتہ موسم خزاں میں ایک نمائش منعقد کر کے دفعتاً ملک کے سنجیدہ طبقوں کو چونکا دیا۔ یہ نمائش جسے پارلیمنٹ کے کئی ممبروں نے بھی دیکھا مخرب اخلاق مزاحیہ لٹریچر کے متعلق تھی۔ بے شمار ناشروں نے روپیہ کمانے کا یہ سا ذریعہ اختیار کر رکھا ہے کہ وہ نام نہاد مزاحیہ تصویری کہانیاں شائع کرتے ہیں، یہ کہانیاں تمام تر سنسنی خیز جرم اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی تباہی کی تصویر کشی کرتی ہیں، مثلاً کہیں ایٹمی دھماکوں سے دنیا کو تہ و بالا ہوتے دکھایا گیا ہے تو کہیں قتل و غارت کے منظر پیش کیے گئے ہیں، غرض گندگی ایسے گھناؤنے رنگ میں دکھایا جاتا ہے کہ بھولے بھالے بچے اور ناتجربہ کار نوجوان اسے دیکھ کر مفعولیت اور جرم پسندی کے سوا اور کوئی سبق نہیں سیکھ سکتے، جو بچے شائستہ گھریلو ماحول میں رہتے ہیں وہ عموماً اس وبا کی زد میں نہیں آتے، لیکن دوسرے بچے اور نوجوان جن کی رہ نمائی اور نگرانی تسلی بخش طور پر نہیں ہوتی وہ بڑی آسانی سے اس کی گرفت میں آ جاتے ہیں۔

نیشنل یونین آف ٹیچرز کی اس نمائش نے ملک میں ایک آگ سی لگا دی، استادوں نے پرزور طور پر مطالبہ کیا کہ ان خوفناک طور پر غلیظ مطبوعات کو کچلنا حکومت کی ذمہ داری ہے، اتنا بہترین کوششوں کے باوجود اس معاملہ میں کچھ نہیں کر سکتے، بچے اور نوجوان خفیہ ان خوفناک

کتابچوں کو خرید لیتے ہیں اور ایک دوسرے کو دے دیتے ہیں، جب تک قانون کا ہاتھ غلاظت کے اس طوفان کو اس کے اصل سرچشمہ ہی پر ختم نہیں کرتا اس وقت تک اس کی ہلاکت آفرینی میں کمی ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

رائے عامہ کے بڑھتے ہوئے دباؤ نے برطانوی حکومت کو مجبور کیا کہ وہ پارلیمنٹ میں ایک مسودہ قانون پیش کرے، چنانچہ وزیر داخلہ نے "بچوں اور نوجوانوں کو نقصان دینے والی مطبوعات کے متعلق مسودہ قانون" دارالعوام میں پیش کر دیا، دوسری خواندگی کے بعد اب یہ مسودہ کمیٹی کے سپرد ہو چکا ہے، پارلیمنٹ میں اس پر خوب گرما گرم بحث ہوئی، حکومت اور حزب مخالف دونوں اس بات پر متفق تھے کہ بچوں اور نوجوانوں کو ایسے خود غرض کتب فروشوں کے چنگل سے نجات دلانی چاہیے جو پیٹ کی خاطر ان کے اخلاق و کردار کو تباہ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے بعض ممبروں نے یہ نکتہ اٹھایا کہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ قانون منظور ہو جانے پر اس کی زد ایسے مصنفوں، ناشروں اور آرٹسٹوں پر بھی پڑنے لگے جن کی نیت بالکل نیک ہو، ممکن ہے کہ کوئی مصنف یا آرٹسٹ خالص علمی اور فنی غرض سے کوئی کتاب تیار کرے، یہ کتاب بالغوں کے لیے لکھی جائے، اگر یہ کتاب بچوں یا نوجوانوں کے ہاتھ لگ جائے تو بے چارہ مصنف مخرب اخلاق مواد کی اشاعت کے جرم میں دھر لیا جائے گا، لمبی چوڑی بحث کے بعد پارلیمنٹ کی اکثریت کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ نیت کا فیصلہ صرف نتائج ہی کر سکتے ہیں۔ اگر کسی شخص کی لکھی ہوئی یا طبع کردہ کتاب نے بچوں اور نوجوانوں کے اخلاق پر برا اثر ڈالا ہے تو اس شخص کا یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ میری نیت یہ نہ تھی۔

بحث کے دوران میں اس بات کی وضاحت بھی کی گئی کہ حکومت کا یہ اقدام ایک عارضی علاج کی حیثیت رکھتا ہے، ناپسندیدہ کتابوں اور رسالوں کی اشاعت کو مستقل طور پر روکنا عوامی ضمیر کا کام ہے، لیکن جب تک عوامی ضمیر میں اتنی قوت نہیں پیدا ہوتی اس وقت تک قانون مجبور ہے کہ عوامی ضمیر کا کام اپنے ذمہ لے، پارلیمنٹ کے ایک رکن نے ایوان میں یہ انکشاف کیا کہ ایک ناشر نے اسے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ اگر حکومت نے کوئی قانونی پابندی عائد کی

تو وہ خوفناک مزاحیہ کتابچوں کی اشاعت کا کام جو وقتی طور پر روک دیا گیا ہے دوبارہ شروع کر دے گا، اس انتباہ اور دوسرے وزنی اسباب کی بنا پر پارلیمنٹ نے اس مسودہ قانون کی دوسری خواندگی کا مرحلہ ختم کیا اور اسے کمیٹی کے حوالے کر دیا، عنقریب یہ مسودہ قانون باقاعدہ قانون کی شکل اختیار کرے گا اور برطانوی بچے اور نوجوان خود غرض ناشروں کی اس یورش سے بچ جائیں گے جو انہوں نے ان کے اخلاق پر کر رکھی ہے۔

پارلیمنٹ کی بحث میں اس اہم نکتہ پر بھی زور دیا گیا کہ مرض کا شافی علاج یہ ہے کہ بچوں اور نوجوانوں میں اچھی کتابیں پڑھنے کا ذوق پیدا کیا جائے تاکہ وہ خوفناک مزاحیہ کتابچوں کی طرف مائل ہی نہ ہوں، وزیر تعلیم نے ایوان کو تیقن دلایا کہ ماڈرن ہائی اسکولوں کی لائبریریوں میں پسندیدہ قسم کی کتابیں کافی تعداد میں فراہم کی جائیں گی، مگر اس مطلب کے لیے بہت خطیر رقم کی ضرورت ہوگی۔

پاکستان میں صورت حال

پچھلے سال آموزش میں ایک مضمون چھپا تھا جس میں فلمی رسالوں کی غیر معمولی مقبولیت کی تفصیل دینے کے ساتھ ان رسالوں کے عام مندرجات کے نمونے بھی درج تھے، صورت حال یہ ہے کہ پنجاب میں (اور غالباً اسی طرح ملک کے دوسرے حصوں میں) سب سے زیادہ بکری فلمی رسالوں کی ہے، ان رسالوں کے اوراق فلمی تاروں کے ہیجان خیز رومانوں سے اٹے پڑے ہوتے ہیں، نوجوان پڑھنے والوں اور پڑھنے والیوں کے جو سوالات ان میں شائع ہوتے ہیں ان پر صرف ایک نگاہ ڈال لینے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ان رسالوں کے مندرجات نوجوانوں کے خام جذبات میں چنگاری کا

چلی آتی ہے، اسے پڑھنا لکھنا آئے نہ آئے لیکن اس کے اخلاق کی بلندی مسلمہ ہے، آزادی ملنے کے بعد ہم ملک کے گوشے گوشے میں تعلیم کی روشنی پھیلا دینا چاہتے ہیں۔ ہمارا تعلیمی نصب العین یہ ہے کہ ناخواندگی کو ملک بدر کر دیا جائے، بے شک یہ ایک اچھا نصب العین ہے لیکن اس کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے ہمیں یہ اطمینان کر لینا چاہیے کہ ہمارے پڑھے لکھے بچے اور نوجوان پسندیدہ قسم کی کتابیں پڑھیں گے، وہ پڑھنا لکھنا سیکھ کر فلمی دنیا کے گھٹیا رومانوں میں نہیں کھو جائیں گے۔

ہمارے ملک میں پڑھے جانے والے فلمی رسالوں میں سے بعض ہندوستان سے آتے ہیں، اخلاق کے علاوہ یہ ہمارے زرمبادلہ پر بھی ڈاکہ ڈالتے ہیں، اکثر فلمی رسالوں نے معموں کا ڈھونگ رچا رکھا ہے جس کی نوعیت اکثر و بیشتر جوئے کے سوا کچھ نہیں، غرض انگلستان میں جو تباہی خوفناک مزاحیہ رسالوں نے مچا رکھی ہے اسی پیمانے پر یہ تباہی ہمارے یہاں فلمی رسالوں نے مچائی ہوئی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اساتذہ کی کوئی تنظیم ان رسالوں کی نمائش کا اہتمام کرے تاکہ رائے عامہ کے رہنما اور قانون ساز حضرات اپنی آنکھوں سے اس خوفناک کھیل کی ایک جھلک دیکھ لیں جو آنے والی نسل کے اخلاق کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے، اگر استادوں کی کسی تنظیم کو یہ توفیق نصیب نہ ہو تو پھر کسی صاحب نظر رکن اسمبلی کو چاہیے کہ اس مسئلہ کو اسمبلی میں اٹھائے ❊

تو وہ خوفناک مزاحیہ کتابچوں کی اشاعت کا کام جو وقتی طور پر روک دیا گیا ہے دوبارہ شروع کر دے گا۔ اس انتباہ اور دوسرے وزنی اسباب کی بنا پر پارلیمنٹ نے اس مسودہ قانون کی دوسری خواندگی کا مرحلہ ختم کیا اور اسے کمیٹی کے حوالے کر دیا۔ عنقریب یہ مسودہ قانون باقاعدہ قانون کی شکل اختیار کرے گا اور برطانوی بچے اور نوجوان خود غرض ناشروں کی اس یورش سے بچ جائیں گے جو انہوں نے ان کے اخلاق پر کر رکھی ہے۔

پارلیمنٹ کی بحث میں اس اہم نکتہ پر بھی زور دیا گیا کہ مرض کا شافی علاج یہ ہے کہ بچوں اور نوجوانوں میں اچھی کتابیں پڑھنے کا ذوق پیدا کیا جائے تاکہ وہ خوفناک مزاحیہ کتابچوں کی طرف مائل ہی نہ ہوں۔ وزیر تعلیم نے ایوان کو یقین دلایا کہ ماڈرن ہائی اسکولوں کی لائبریریوں میں پسندیدہ قسم کی کتابیں کافی تعداد میں فراہم کی جائیں گی، مگر اس مطلب کے لیے بہت خطیر رقم کی ضرورت ہو گی۔

پاکستان میں صورت حال پچھلے سال آموزش میں ایک مضمون چھپا تھا جس میں فلمی رسالوں کی غیر معمولی مقبولیت کی تفصیل دینے کے ساتھ ان رسالوں کے عام مندرجات کے نمونے بھی درج تھے۔ صورت حال یہ ہے کہ پنجاب میں (اور غالباً اسی طرح ملک کے دوسرے حصوں میں) سب سے زیادہ بکری فلمی رسالوں کی ہے۔ ان رسالوں کے اوراق فلمی ستاروں کے ہیجان خیز رومانوں سے اٹے پڑے ہوتے ہیں۔ نوجوان پڑھنے والوں اور پڑھنے والیوں کے جو سوالات ان میں شائع ہوتے ہیں ان پر صرف ایک نگاہ ڈال لینے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ان رسالوں کے مندرجات نوجوانوں کے خام جذبات میں چنگاری کا کام کرتے ہیں۔

فلمی رسالوں کی اشاعت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر پاکستان کی نئی پود پڑھنا لکھنا سیکھ کر صرف اسی قسم کی ذہنی غذا کی عادی بنتی جائے گی تو اس کے اخلاق و کردار کے متعلق کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہ رہنا چاہیے۔ ہماری دیہاتی آبادی اپنی اخلاقی صحت مندی کے لیے مدتوں سے مشہور

چلی آتی ہے، اسے پڑھنا لکھنا آئے نہ آئے لیکن اس کے اخلاق کی بلندی مسلمہ ہے، آزادی ملنے کے بعد ہم ملک کے گوشے گوشے میں تعلیم کی روشنی پھیلا دینا چاہتے ہیں۔ ہمارا تعلیمی نصب العین یہ ہے کہ ناخواندگی کو ملک بدر کر دیا جائے، بے شک یہ ایک اچھا نصب العین ہے لیکن اس کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے ہمیں یہ اطمینان کر لینا چاہیے کہ ہمارے پڑھے لکھے بچے اور نوجوان پسندیدہ قسم کی کتابیں پڑھیں گے، وہ پڑھنا لکھنا سیکھ کر فلمی دنیا کے گھٹیا رومانوں میں نہیں کھو جائیں گے

ہمارے ملک میں پڑھے جانے والے فلمی رسالوں میں سے بعض ہندوستان سے آتے ہیں، اخلاق کے علاوہ یہ ہمارے زرمبادلہ پر بھی ڈاکہ ڈالتے ہیں، اکثر فلمی رسالوں نے معموں کا ڈھونگ رچا رکھا ہے جس کی نوعیت اکثر و بیشتر جوئے کے سوا کچھ نہیں، غرض انگلستان میں جو تباہی خوفناک مزاحیہ رسالوں نے مچا رکھی ہے اسی پیمانے پر یہ تباہی ہمارے یہاں فلمی رسالوں نے مچائی ہوئی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اساتذہ کی کوئی تنظیم ان رسالوں کی نمائش کا اہتمام کرے تاکہ رائے عامہ کے رہنما اور قانون ساز حضرات اپنی آنکھوں سے اس خوفناک کھیل کی ایک جھلک دیکھ لیں جو آنے والی نسل کے اخلاق کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے، اگر استادوں کی کسی تنظیم کو یہ توفیق نصیب نہ ہو تو پھر کسی صاحب نظر رکن اسمبلی کو چاہیے کہ اس مسئلہ کو اسمبلی میں اٹھائے ❊

مُطالعہ کا ذوق کیونکر پیدا کیا جائے

نذیر احمد

طالب علمی کے زمانے میں ہر طالب علم کو چار و ناچار تھوڑا بہت پڑھنا ضرور پڑتا ہے۔ اور نہیں تو وہ کم از کم امتحانی ضروریات کے ماتحت درسی کتابوں کے کچھ حصوں کو ضرور پڑھے گا لیکن یہ پڑھائی تعلیمی نقطہ نگاہ سے چنداں اہم نہیں، تعلیمی طور پر اہم بات یہ ہے کہ کیا طالب علم کے دل میں کتابیں پڑھنے کا اتنا شوق پیدا ہو گیا ہے کہ مدرسہ چھوڑنے کے بعد بھی وہ دل بہلانے کے لیے کوئی کتاب پڑھے؛ اگر مدرسے کی تعلیم نے اس کے دل میں یہ شوق پیدا کر دیا ہے تو اسے گویا ایک ایسی پائدار نعمت عطا کر دی ہے جو زندگی کے کٹھن راستے کو خوش گوار بنانے میں مدد دے گی، اس کے برعکس اگر مدرسہ ایسا نہیں کر سکا تو اس کی محنت نے کوئی پائدار نتیجہ پیدا نہیں کیا۔

جدید موانع

مطالعہ کے شوق کو ہر زمانے میں تعلیم کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت سمجھا گیا ہے آج کل یہ شکایت عام ہے کہ موجودہ مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبا میں مطالعہ کا شوق بہت کم ہے، یہ شکایت اپنی جگہ بالکل درست ہے، اس کے اسباب دو چند ہیں، پہلا سبب یہ ہے کہ پہلے وقتوں کی نسبت اب بہت زیادہ بچے مدرسوں کا رُخ کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ چیدہ چیدہ بچوں کے مقابلے میں ہر قسم کے بچوں میں سے ایسے طالب علم نسبتاً کم نکلیں گے جو تعلیم کی اعلیٰ تر اغراض کو پورا کریں، دوسری وجہ عہد حاضر کی وہ سائنسی ایجادیں ہیں جنہوں نے تعلیم کا کام بہت کچھ سہل بنا دیا ہے، متحرک فلم۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سائنس کے وہ معرکتہ الآرا کرشمے ہیں جن کے اندر بے پناہ تعلیمی امکانات موجود ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ تعلیمی امدادیں اکثر صورتوں میں ذوق مطالعہ کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں، پہلے ہر چیز کتاب ہی سے اخذ کی جاتی تھی۔ اب کئی معلومات فلم اور ریڈیو سے بیٹھے بٹھائے ہاتھ لگ جاتی ہیں، کہانی اور افسانے کا شوق

پہلے کتابوں کے مطالعہ پر ابھارا کرتا تھا اب اس کی نشفی کتابیں پڑھے بغیر بھی ہو جاتی ہے۔

یہ دونوں موانع کافی شدید ہیں، اس سے یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ اس دور میں ذوق مطالعہ کی تعلیمی اہمیت باقی نہیں رہی، یہ چیز آج بھی اسی طرح پسندیدہ ہے جیسے پہلے تھی۔ ذوق مطالعہ پیدا کرنے کی ذمہ داری تمام استادوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے تاہم زبانوں کے استادوں پر یہ خصوصیت کے ساتھ عائد ہوتی ہے، ایک تجربہ کار معلم زبان نے یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے جو طریقہ سالہا سال تک کامیابی سے آزمایا ہے اس کی تفصیل نیچے دی جاتی ہے۔

اتفاقیہ دریافت ایک برطانوی صدر معلم جو انگریزی زبان کے استاد بھی ہیں بیان کرتے ہیں کہ میں نے ذوق مطالعہ پیدا کرنے کا ایک بڑا کامیاب طریقہ اتفاقیہ دریافت کیا، میں ایک اور صدر معلم سے باتیں کر رہا تھا۔ بات چیت کا رُخ اتفاقاً اس طرف مڑ گیا کہ آج کل مدرسوں کے طلبہ میں ذوق مطالعہ پیدا کرنا بڑا مشکل ہو رہا ہے، میں نے اس ضمن میں اپنی دشواریاں بیان کیں، اس پر وہ صاحب بولے کہ میں نے اس مسئلہ کا ایک شافی حل ڈھونڈا ہے، آپ بھی اسے آزما کر دیکھیں، وہ حل یہ ہے کہ اعلیٰ جماعت کے طلبا میں سے ہر ایک سے مطالبہ کیا جائے کہ ایک مشہور ادیب یا ناول نگار کا مطالعہ کرے اور اس مطالعہ کے نتائج کو ایک مختصر مضمون کی شکل میں جماعت کے سامنے پیش کرے۔

حوصلہ افزا نتائج صدر معلم مذکور نے اپنے مدرسہ میں یہ طریقہ رائج کیا، اس کی صورت یہ تھی کہ سال کے آغاز میں مصنفوں کی ایک فہرست تیار کر لی جاتی اور ہر طالب علم سے کہا جاتا کہ ان میں سے اپنے لیے ایک مصنف پسند کر لے، اس ضمن میں یہ احتیاط برتی جاتی کہ کمزور طلبا نسبتاً آسان نویس مصنفوں کا انتخاب کریں اور ہوشیار طلبا زیادہ گہرے اور مشکل نویس مصنفوں کا۔ اب اگلا کام یہ تھا کہ طلبا کسی نہ کسی طرح اپنے مصنف کی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیں۔ کئی حالتوں میں یہ کام بادل ناخواستہ ہی شروع کیا گیا، لیکن جوں ہی اس کا آغاز ہوا بد دل سے بد دل طالب علم کو بھی زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہونے لگا کہ مطالعہ میں فی الواقع بڑی لذت ہے، اس

احساس کا پیدا ہو جانا اس بات کی مکمل ضمانت تھی کہ اب یہ کام جاری رہے گا

ایک طالب علم نے صدر معلم کو بتایا کہ اوّل اوّل اس کا جی مطالعہ کی طرف قطعاً مائل نہ ہوتا تھا، اسے یقین تھا کہ یہ کام ایک بدمزہ بوجھ ثابت ہوگا، جوں جوں مقررہ میعاد قریب آنے لگی اسے یہ خیال ستانے لگا کہ اس بوجھ کو جوں توں کر کے اٹھانا ہی پڑے گا، آخر دل پہ جبر کر کے پڑھنا شروع کیا، تھوڑی دیر بعد اسے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اسے مطالعہ میں لذت محسوس ہو رہی ہے، یہ کوئی اکیلا واقعہ نہیں. بہت سے طالب علموں نے اس قسم کے تجربہ کا اقرار کیا۔

طریق کار کی تفصیلیں

طلبا کو مختصر کہانیوں یا جواب مضمونوں کے مطالعہ پہ آمادہ کرنا نسبتاً سہل ہے، لیکن لمبے ناولوں کے پڑھنے پہ آمادہ کرنا مشکل، وجہ یہ کہ لمبے ناول پڑھنے کے لیے رفتار تیز رکھنا پڑتی ہے، درمیان میں زیادہ لمبا وقفہ پڑ جانے سے تسلسل کا ٹوٹ جانا بھی بہت اغلب ہے، یہی وجہ ہے کہ طالب علم عموماً ناولوں کے مطالعہ سے کترا تے ہیں، ان کتابوں کو کمرہ جماعت میں پڑھایا نہیں جا سکتا، استاد کے پاس نہ اتنا وقت ہوتا ہے اور نہ اس طرح چیونٹی کی رفتار پر پڑھنے سے کوئی لذت حاصل ہو سکتی ہے۔

طلبا نے جب اپنی اپنی پسند کے مصنف چن لیے تو انہیں ان مصنفوں کی وہ کتابیں بتا دی گئیں جن کا پڑھنا ضروری تھا۔ سال بھر کے لیے ہر طالب علم کے ذمہ چار کتابیں لگائی گئیں، ہاں جو مصنف کثیر التصنیف تھے ان کی زیادہ کتابیں مقرر کی گئیں لیکن یہ کام عام طور پر ہوشیار طلبہ کے سپرد تھا، یہ چاروں کتابیں اکثر حالتوں میں لمبے ناول تھے، ہر طالب علم کو نہ صرف اپنے حصے کی کتابوں کو پڑھنا تھا بلکہ مصنف کی زندگی کے ان حالات کا معلوم کرنا بھی جو کسی مخصوص تصنیف کا باعث ہوئے یا اس پر اثر انداز ہوئے ان تمام معلومات کو ایک مختصر مضمون کی شکل دے کر جماعت کے سامنے پیش کرنا تھا۔ ہر طالب علم کو بہت پہلے یہ بتا دیا گیا کہ اس کی باری کس تاریخ کو آئے گی، استاد اور دوسرے طلبا اس مضمون کو توجہ سے سنتے اور بعد از اں اس پر تبصرہ ہوتا۔

طالب علموں کے تحریری مقالے کو اہمیت دینے کے لیے اس کا نام تحقیقاتی مقالہ رکھا گیا، اس کی
طوالت کو مناسب حدود میں رکھنے کے لیے اس وقت کی تعیین کر دی گئی جس میں اسے پڑھ کر
سنانا تھا، یہ وقت بیس پچیس منٹ سے زیادہ نہ رکھا گیا تاکہ کچھ وقت دوسرے طلبا اور
استاد کی تنقید کے لیے بچ رہے، وقت کی اس پابندی کا سختی سے لحاظ رکھا گیا، اس سے طالب علموں میں
جلد یہ شعور پیدا ہو گیا کہ کسی طرح ایک مقررہ وقت میں مطلب کی بات کہی جا سکتی ہے، جو طلبہ ایسا نہ
کر سکے ان کا مقالہ ادھورے کا ادھورا رہ گیا، اس سے انہیں یہ تکلیف دہ احساس ہوا کہ مقالے
کے زیادہ اہم نکات اور نتائج جو آخر میں درج تھے، دوسروں کے سامنے نہ آ سکے، ان کی مثال
دوسروں کے لیے ایک مؤثر انتباہ ثابت ہوئی۔

تحریری مقالوں کی عام خوبی گو اعلیٰ ادبی سطح کو نہ پہونچی لیکن طلبا کی سطح کے لحاظ سے وہ ہمیشہ
بہت اچھی رہی، اس کی وجہ یہ کہ ہر طالب علم کو اپنے نتائج خود اخذ کرنے پڑتے تھے، وہ سنی سنائی
یا مستعار لی ہوئی آرا سے کام نہ لے سکتا تھا۔ ہر نظریے اور ہر نتیجہ کے لیے اسے شواہد اور
حوالوں سے کام لینا پڑتا تھا، استاد کی تنقید میں حوصلہ افزائی کے ساتھ ہر قسم کی کمیوں کا پورا ذکر
ہوتا تھا تاکہ آئندہ وہ کمیاں باقی نہ رہیں، جہاں استاد کو یہ یقین ہو جاتا کہ مقالہ محنت اور سنجیدگی
سے نہیں لکھا گیا (اس کی مثالیں بے حد نادر تھیں) وہاں مقالہ نگار کو خوب آڑے ہاتھوں لیا جاتا
تاکہ اسے یہ محسوس ہو کہ جماعت کا وقت لینا ایک بہت بڑا اعزاز ہے، جسے یوں ہی لاپرواہی
سے ضائع کرنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔

اس طریق کار کے نتائج بے حد کامیاب ثابت ہوئے، صدر معلم کو ایک مرتبہ ایک پرانے
طالب علم سے ملنے کا اتفاق ہوا جو مدرسے کے ایام میں درمیانے درجے کا لڑکا تھا وہ اس وقت بھی
کسی ادبی پیشے سے متعلق نہیں تھا مگر اس کا کام اچھی سوجھ بوجھ کا مطالبہ کرنے والا کام تھا
صدر معلم نے اس سے پوچھا کہو بھئی، ہائی جماعتوں میں جو کام کرایا گیا تھا اس نے زندگی میں بھی
کچھ فائدہ دیا؟ اس نے جواب دیا جی ہاں۔ مقالہ لکھنے سے مجھے جو ذہنی تربیت حاصل ہوئی تھی

وہ خصوصیت کے ساتھ کارآمد ثابت ہوئی ہے، فارغ التحصیل طلبا کی اکثریت نے ہمیشہ انہی خیالات کا اظہار کیا۔

عام نتیجہ برطانوی صدر معلم کے جس تجربہ کا حال اوپر درج ہے وہ صرف انگریزی زبان کے ساتھ مخصوص نہیں، یہ طریق کار ڈالٹن پلان سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے اور زبان کے علاوہ یہ دوسرے مضامین میں بھی کام دے سکتا ہے۔ تدریس زبان میں بھی یہ ضروری نہیں کہ اس سے ثانوی مدرسے کی آخری جماعت ہی میں کام لیا جائے، متذکرہ صدر ہیڈ ماسٹر نے اس سے ثانوی درجہ کی آخری دو جماعتوں میں کام لینا شروع کر دیا تھا۔

ہمیں اپنے مدرسوں میں اپنے کام کا آغاز اردو سے کرنا چاہیے، آٹھویں جماعت کے طلبا اور طالبات اردو میں اتنی استعداد پیدا کر چکے ہوتے ہیں کہ اپنے طور پر مولانا نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، سرسید احمد خاں اور اردو کے جدید ادیبوں کی کتابیں مزے لے لے کر پڑھ سکیں، نویں جماعت میں انگریزی مصنفوں کے ساتھ تعارف ہو جانا چاہیے، دسویں جماعت میں میٹرکولیشن امتحان کے تقاضے غالباً زیادہ وقت نہیں دیں گے، لیکن اگر آٹھویں اور نویں میں ذاتی مطالعہ کی بنیاد صحت مند طور پر رکھی جا چکی ہے تو دسویں میں اس طرف سے تھوڑی بہت بے توجہی بھی اس ذوق کو مدھم نہ ہونے دے گی، اس طریقہ پر عمل کرنے کے لیے اساتذہ کو خوب چوکس رہنا چاہیے اور مدرسے کے کتب خانے میں اچھی کتابوں کی کمی نہ ہونی چاہیے۔

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

تعلیم میں اعتقاد و عمل کی اہمیت

اس سال کے جوزف پین میموریل لیکچروں کے سلسلہ میں ایک مشہور برطانوی عالم نے ایمان اور یقین کی اہمیت کو اپنی تقریر کا موضوع بنایا، انہوں نے کہا کہ دورِ حاضر کی ذہنی افراتفری کی بڑی وجہ یہ ہے کہ افراد خود مکتفی ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ یقین بہت عام ہے کہ انسانی ترقی کا سارا مدار عقل انسانی پر ہے، سائنس کی ترقی نے اس رجحان کو اور تقویت دی ہے، لوگوں میں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ عقل کی قوت دنیا کے سب دکھوں کا علاج کر سکتی ہے، حالانکہ سائنس ہی کی ایک شاخ یعنی نفسیاتی تجزیہ نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ انسانی فطرت معقولیت اور نا معقولیت کا ایک مرکب ہے۔ انسانی عقل کی ایک اہم حیثیت سے انکار نہیں کرنا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ مفروضہ بھی بالکل خود فریبی ہے کہ تمام انسان ہمیشہ عقل کی رہنمائی ہی پر بھروسہ کرتے ہیں چوں کہ موجودہ تعلیم اس خود فریبی کو سہارا دیتی ہے اس لیے اس پر نظر ثانی ہونی چاہیے۔

اکثر سائنس داں اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ان کی عظیم ترین ایجادات وقتی القا کے زیر اثر یا محض اتفاقیہ طور پر وجود میں آئیں، سائنس کی تاریخ اس عوامی نظریے کی پوری طرح تائید نہیں کرتی کہ سائنس ایک بہت کڑے معقولیاتی ضبط کا دوسرا نام ہے تاہم عوامی نظریے میں کچھ سچائی ضرور موجود ہے، سائنس ایک معقولیاتی عمل کا نام ہے اور اس کی تعلیم ذہنی تربیت سے عبارت ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ گو یہ تعلیم بہت مفید اور پسندیدہ ہے لیکن اس میں توازن موجود نہیں۔

اگر یہ بات درست ہے کہ جذبات بھی زندگی پر اسی قدر اثر انداز ہوتے ہیں جس قدر عقل، تو اس تعلیم کے متعلق کیا کہا جائے گا جو جذبات کو نظر انداز کر دے؟ ایسی تعلیم متعلم کو خود اپنی صحیح تصویر سے بھی محروم رکھتی ہے، سائنس کی مخصوص تعلیم کا خطرہ یہی ہے کہ انسان کا مکمل مطالعہ

نہیں کرتی۔ اس عدم توازن کی اصلاح کئی صورتوں میں ممکن ہے ، مذہب، علم، ادب اور تاریخ کے مطالعہ کے لیے بھی وقت نکالنا چاہیے ۔ تاکہ انسانی زندگی کی تصویر مکمل ہو ، یہاں یہ انتباہ بھی ضروری ہے کہ اگر طلبا کو محض علم و ادب ، مذہب ، تاریخ اور دوسرے فنون ہی کی تعلیم ملے اور وہ سائنسی طریق کار سے بے خبر رہیں تو یہ امر بھی تعلیم کی بہت بڑی ناکامی ہوگی ، سائنس دان کو اس امر کا احساس ہر وقت رہنا چاہیے کہ اس کا طریق کار متعدد طریقہ ہائے کار میں سے بس ایک ہے اور حقیقت کے بعض پہلو ایسے ہیں جن پر سائنس کوئی روشنی نہیں ڈال سکتی ۔ انسانی فطرت کا بیشتر حصہ خصوصیت کے ساتھ سائنسی تحقیقات کے دائرے سے باہر ہے ، انسانی فطرت کے متعلق مذاہب نے جن صداقتوں کو وحدت سے بے نقاب کر رکھا ہے سائنس کو ان صداقتوں کا اعتراف ضرور کرنا چاہیے ، سائنس دان کے لیے یہ امر اس لیے ضروری ہے تاکہ وہ انسانی فطرت کی کیفیت کا اندازہ کر سکے ، انسانی جذبات کو سمجھنے کے لیے اسے خود اپنے جذبات کو جگانا چاہیے ، اس طور پر ایسے سائنس دان تیار ہو سکتے ہیں جو اس عملی دنیا سے اچھی طرح باخبر ہوں جس میں ان کو زندگی بسر کرنا ہے ۔

صنعتی رہنمائی

جوں جوں کسی ملک میں صنعت ترقی کرتی ہے ، اتنی ہی وہاں راہ نماؤں کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے صنعتی تہذیب معاشرے کو خصوصی حلقوں میں بانٹ دیتی ہے اور ہر حلقے میں موثر زندگی گذارنے کے لیے افراد کو تنظیمیں قائم کرنا پڑتی ہیں ، ظاہر ہے کہ رہ نماؤں کے بغیر کوئی تنظیم قائم نہیں رہ سکتی اس عام ضرورت سے قطع نظر صنعت کو اپنے پیشہ ور رہ نماؤں کی بھی ضرورت ہے جو کارخانوں اور کاروباری اداروں میں نظم و نسق کا کام کامیابی کے ساتھ سنبھال سکیں ، تجربے نے ثابت کیا ہے کہ ان آسامیوں کو پر کرنے کے لیے ایسے آدمیوں سے کام نہیں چل سکتا جو محض حکم دینا جانتے ہوں انہیں انسانوں کے ایک گروہ کی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لانا ہوتا ہے اور ایسا کرنے کے لیے ان کا رضاکارانہ تعاون حاصل کرنا پہلی شرط ہے جو منیجر یا ناظم ایسا نہیں کر سکتے وہ مقابلہ کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور جس کارخانہ یا کاروبار کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہوتی

بسخت دھکا لگتا ہے، جہاں جیہ ترقی یافتہ ملکوں میں صنعتی تنظم ونسق کے لیے یونی ورسٹی کے گریجویٹوں کو باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے اور دن بدن منیجر کی آسامی ایسے لوگوں سے پر کی جانے لگی ہے جس نے اپنے کام کے متعلق مخصوص تربیت حاصل کی ہو۔

برٹش انسٹی ٹیوٹ آف منیجمنٹ نے ۱۹۵۲ء میں اس مسئلہ کے مطالعہ کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی تھی، اس کمیٹی کی رپورٹ حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ بعض صنعت کار یہ خیال کرتے ہیں کہ جن لوگوں نے سالہا سال تک صنعت میں کام کرکے ترقی کی ہو منیجر کا کام وہی بیاقی کے ساتھ سنبھال سکتے ہیں۔ اس کے جواز میں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یہ لوگ بڑی کٹھن منزل میں گذر کر آتے ہیں۔ اس لیے ان کے قلب و نگاہ کی خوبیوں کو دوسرے نوجوان نہیں پہنچ سکتے۔ رپورٹ نے استدلال کی کمزوری پر زور دیا ہے اور کہا ہے کہ جو نوجوان اسکول اور یونیورسٹی کی منزلیں طے کر کے آتے ہیں وہ بھی کچھ کم کٹھن راستہ طے کر کے نہیں آتے، بالخصوص جس نوجوان نے اعزاز کے ساتھ ڈگری حاصل کی ہو اس کے ذہنی ضبط کے بارے میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ صنعت کو صرف اپنے اندر ہی سے منیجر حاصل کرنے چاہئیں۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اس وقت کوئی ۸۰۰۰ گریجوایٹ ہر سال تیار ہوتے ہیں جن میں سے ۱۰۰۰ کے قریب صنعت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ منیجروں کی تلاش زیادہ تر ان لوگوں میں ہونی چاہیے۔ صحیح قسم کے منیجروں کا کھوج لگانا کوئی آسان کام نہیں۔ بیس سال کی لگ بھگ عمر کے نوجوانوں میں سے ملاقات کے ذریعہ صحیح انتخاب کرنا تقریباً محال ہے۔ دوسری آسامیوں کے لیے ملاقات ایک اچھا ذریعہ انتخاب ہے، لیکن یہ ذریعہ مستقبل کے کامیاب منیجر کی درست خبر نہیں دے سکتا۔

جو گریجوایٹ انتظامی کام کے لیے چنے جاتے ہیں اور تربیت حاصل کرنے کے بعد مناسب تنخواہ کی جگہ حاصل کر لیتے ہیں وہ بھی سب کے سب بخیر و خوبی منزل مقصود پر نہیں پہنچتے۔ ان میں سے بہتوں کو احساس نامرادی آ دبوچتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ انہوں نے تربیت میں غیر ضروری طور پر لمبا عرصہ صرف کیا۔ ان کا کام نسبتاً دشوار ہے۔ ترقی کے امکانات کم ہیں اور دوسرے شعبوں میں

زندگی زیادہ خوش گوار اور منفعت بخش ہے۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جو غیر مستحسن بے صبری کے ساتھ ایسی ترقی کے لیے زور مارنے لگتے ہیں جس کی ان میں صلاحیت نہیں ہوتی۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اس مرض کا علاج یہ ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ حقیقت پسندانہ مگر دوستانہ صاف گوئی سے کام لیا جائے تاکہ وہ غیر حقیقی بلند پروازی چھوڑ کر زمین پر چلنے لگیں۔

بعض "سست رو" قسم کے لوگ بھی انتظامی عہدوں کی ہوس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو نرمی سے سمجھا دینا چاہیے کہ یہ کام ان کے بس کا روگ نہیں۔ البتہ مغرور قسم کے لوگ ناقابل علاج نہیں، زندگی میں بہت سے کامیاب آدمی ایسے ملیں گے جنہیں کسی نہ کسی وقت چند قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔ سب سے زیادہ قابل رحم حالت ان نوجوانوں کی ہے جو صنعت میں آکر علمی ذوق کے پیچھے سرد ھنتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا علاج صرف یہ ہے کہ انہیں مدرسے اور یونیورسٹی کے زمانہ میں صنعت کی سماجی اہمیت کا شعور دلایا جائے کہ وہ اس کے معاشرتی حسن کو بھی سمجھنے لگیں۔

رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مشہور مبصر نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اچھے منیجر حاصل کرنے کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ مدرسے کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نوجوانوں کو صنعت میں بھرتی کر لیا جائے اور جب آٹھ دس سال کے عملی کام سے ان کے جوہر بخوبی کھل جائیں تو ان میں سے موزوں نوجوانوں کو چن کر یونیورسٹی میں تربیتی نصاب پورا کرنے کے لیے بھیج دیا جائے۔ رپورٹ میں اعلیٰ انتظامی اسامیوں کی تربیت کی چند دقتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تجزیہ ان میں سے بہت سی دقتوں کا ایک شافی حل پیش کرتی ہے۔

Regd. No. L. 5327

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ھے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ھے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھہ روپیہ (انگریزی) اور چھہ روپیہ (اردو) ھے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر پنجاب ایجو کیشنل جرنل
آموزش
۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

د ۸ شمارہ ۳] **لاہور** [جون ۱۹۵۵

اس شمارہ میں

ارہ تحریر { پروفیسرسراج الدین / پروفیسر ایم - اے - مخدومی

معاونین { عبدالغفور چودھری / فضل احمد

تعلیمی ماہ نامہ

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

آموز

لاہور

جون ۱۹۵۵ء

جلد ———— ۸

شمارہ ———— ۳

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

ایم۔ اے۔ مخدومی

تدبر اور تفکر زندگی کے ہر میدان میں عمل کی نئی نئی راہوں کی نشان دہی کرتے رہتے ہیں۔ تعلیم کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ وہ انسانوں کو سوچنے سمجھنے کا سلیقہ عطا کرے۔ اس لیے تعلیمی میدان میں کام کرنے والوں پر یہ ذمہ داری بہت شدت سے عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے طریق کار کی لگاتار چھان بین کرتے رہیں اور عمل تعلیم کی ایسی راہیں تلاش کریں جو بدلے ہوئے حالات اور نئی ضرورتوں کا ساتھ دے سکیں۔

دنیا کی ترقی یافتہ قوموں نے اس اہم تعلیمی ذمہ داری کے معاملہ میں کبھی تساہل سے کام نہیں لیا۔ جدید علم التعلیم اور جدید نفسیات کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بچوں کی انفرادی ضروریات اور علم کی وحدت کو سائنسی طور پر ثابت کر دکھایا ہے۔ انہوں نے ان تعلیمی نظریوں کا بودا پن واضح کر دیا ہے جو مضامین کی مصنوعی حد بندیوں اور تمام طلبا کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے میں یقین رکھتے ہیں۔

ممالک متحدہ امریکہ میں ان فرسودہ تعلیمی نظریوں کے خلاف انیسویں صدی کے ربع آخر ہی میں ردِ عمل شروع ہو گیا تھا۔ اس مہم کو عملی طور پر شروع کرنے کا شرف سپرنٹنڈنٹ پرکر کو

حاصل ہے جس نے ۱۸۸۸ء میں مدرسہ کے روائتی نصاب کو ختم کرکے اس کی جگہ انفرادی کام کو رواج دیا یہ تجربہ کامیاب رہا اور تعلیمی اصلاح کی یہ تحریک زور پکڑتی گئی۔ بیسویں صدی کے ربع اول میں اس تحریک نے "ڈالٹن پلان" کی شکل اختیار کی۔ یہ پلان دوسرے ملکوں کی طرح ہمارے ملک میں بھی آزمایا گیا اور اس کے نتائج بہت حوصلہ افزا ثابت ہوئے۔

طریقہ ہائے تدریس کی اصلاح و ترمیم کا یہ کام بدستور جاری ہے، آج کل امریکہ میں وحدتی طریقہ تدریس (یونٹ میتھڈ) کا بہت چرچا ہے، یہ طریقہ نصاب کے مختلف مضامین کی بنیادی وحدت پر زور دیتا ہے اور اس چیز کا مطالبہ کرتا ہے کہ ان مضامین کی تدریس کے لیے تجربہ کی کسی ایسی وحدت کو مرکز بنانا چاہیے جو طلبہ کے لیے حقیقی دلچسپی رکھتا ہو۔

جولائی کے نصف اول میں مری کے مقام پر ایک تجدیدی نصاب کا بندوبست کیا جا رہا ہے جس میں وحدتی طریقہ تدریس کی عملی وضاحت کی جائے گی۔ تجدیدی نصاب کو چلانے والے ٹریننگ کالج کے بعض اساتذہ ہوں گے اور اس میں پنجاب کے مختلف اضلاع کے استاد حصہ لیں گے، اس کے ساتھ ہی پنجاب ایجوکیشنل جرنل کے جون اور جولائی کے شماروں میں اس طریقہ تدریس پر بہت سے مضامین چھپ رہے ہیں، ہم پنجاب کے استادوں سے درخواست کرتے ہیں کہ ان مضامین کو غور سے پڑھیں اور تجدیدی نصاب میں شریک ہونے والے ساتھیوں سے اس نئے طریقے کی عملی تفصیلات معلوم کریں اور پھر اسے کمرۂ جماعت میں آزمائیں ؁

ترکی میں تعلیم

فضل احمد

مسلسل نمبر۲

مضمون کے پہلے حصے میں ابتدائی ثانوی اور یونی ورسٹی تعلیم کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا گیا تھا، اس حصے میں تعلیمی تصویر کے باقی ماندہ حصوں کے متعلق مختصر معلومات درج کی جائیں گی۔

۱۔ ٹیکنیکل تعلیم

لڑکوں کے لیے پیشہ ورانہ تعلیم جدید ترکی کے رہنماؤں کو اس بات کا جلد یقین ہو گیا تھا کہ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی سہولتوں کو عام کیے بغیر قومی ترقی کا کوئی منصوبہ پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکتا، چناں چہ ملک کی مقتدر سیاسی جماعت پیپلز پارٹی (عوامی جماعت) نے ۱۹۳۱ء میں جو لائحہ عمل تیار کیا اس میں پیشہ ورانہ اور تجارتی مدرسوں کا اجرا بھی شامل تھا ٹیکنیکل تعلیم کی طرف ۱۹۲۶ء ہی سے توجہ ہونے لگی تھی، اس سال یورپ اور امریکہ سے ماہروں کی ایک جماعت اس غرض سے منگوائی گئی تھی کہ ملک کے مختلف حصوں کے حسب حال پیشہ ورانہ مدرسوں کے متعلق مشورہ دے تاکہ پہلے سے موجود اداروں کو مکمل کیا جائے اور نئے ادارے کھولے جائیں، اس کے ساتھ ہی ایسے شبینہ مدرسے جاری کیے گئے جو عام کاریگروں کو تربیت دیں، استادوں کی پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے بھی مرکز قائم کیے گئے۔

۱۹۲۶ء میں ۱۴۳ ترک طلبا کو یورپ کے مختلف ملکوں میں فنی تربیت حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا، تاکہ واپسی پر وہ مجوزہ پیشہ ورانہ مدرسوں میں معلمی کا کام سنبھال سکیں، کچھ معلم یورپ سے بھی منگائے گئے اور اس سارے منصوبے میں یک جہتی پیدا کرنے کے لیے اسے وزارت تعلیم کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔

فنی اساتذہ کی تربیت گاہ (مردانہ) انقرہ میں یہ تربیتی ادارہ اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ فنی اور تجارتی مضامین کی تدریس کے لیے استاد تیار کرے، تربیت کا عرصہ تین سال ہے، جوں جوں مختلف پیشہ ورانہ اداروں میں استادوں کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے، اس کے ساتھ ہی اس کالج کا دائرہ عمل وسیع ہوتا جاتا ہے۔

تجارتی انسٹی ٹیوٹ (مردانہ) ۱۹۳۴ء میں تجارتی مدرسوں کا نام تبدیل کرکے انہیں تجارتی انسٹی ٹیوٹ بنا دیا گیا، ان میں بارہ سے سترہ سال کی عمر کے لڑکے داخل کیے جاتے ہیں اور پڑھائی کا عرصہ سات سال ہے، یہ لڑکے نہ صرف کسی خاص پیشے کی تعلیم پاتے ہیں بلکہ انہیں مڈل درجہ کی عام تعلیم بھی ملتی ہے، فارغ التحصیل ہونے کے بعد یہ لڑکے کارخانوں میں ملازمت اختیار کر لیتے ہیں یا خود اپنا کام شروع کر لیتے ہیں۔

یہ انسٹی ٹیوٹ مڈل پاس طلبا کے لیے تربیت کا علیحدہ انتظام کرتے ہیں، اس طرح جو طلبا استنبول کے ٹیکنیکل مدرسہ کے شعبہ انجینئرنگ میں داخل ہونا چاہیں وہ بھی ان مدرسوں میں داخل ہو کر خاص جماعتوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

لڑکوں کے تجارتی انسٹی ٹیوٹ میں مختلف مضامین پڑھائے جاتے ہیں جن میں دھاتوں کا کام، ویلڈنگ، لکڑی کا کام، بجلی کا کام اور آٹو موبیل انجینئرنگ شامل ہیں، ان اعلیٰ تجارتی اداروں کے علاوہ اٹھائیس ادنیٰ درجے کے تجارتی مدرسے بھی ہیں۔

شبینہ تجارتی مدرسے یہ مدرسے ان نوجوانوں کو نظری اور عملی تعلیم دیتے ہیں، جو چھوٹی چھوٹی صنعتوں میں کام کرتے ہیں، ان کے علاوہ یہ ایسے طلبا کو بھی داخل کرتے ہیں جو کسی وجہ سے مڈل اسکول یا تجارتی انسٹی ٹیوٹ میں داخل نہ ہو سکے تھے، ان شبینہ جماعتوں کی مانگ بڑھ رہی ہے جسے پورا کرنے کے لیے ان کی تعداد بھی بڑھائی جا رہی ہے۔

ہوائی مستریوں کا مدرسہ ہوائی جہازوں کی صنعت کو ترقی دینے کے لیے ضروری تھا کہ ایسے مستری فراوانی سے پیدا کیے جائیں جو ہوائی جہازوں کے انجن بنا سکیں، چنانچہ انقرہ میں

اس تربیت کے لیے ایک مدرسہ جاری کیا گیا ہے، مدرسہ کے ساتھ ایک عمدہ ورکشاپ بھی ہے مدرسہ کا نصاب تین سال کا ہے اور اس میں تجارتی انسٹی ٹیوٹ کے فارغ التحصیل لڑکے داخل کیے جاتے ہیں۔

فنِ تعمیر کی انسٹی ٹیوٹ ملک کے تعمیری پروگراموں کو پورا کرنے کے لیے اچھے معماروں اور کاریگروں کی جو ضرورت تھی اسے پورا کرنے کے لیے تین انسٹی ٹیوٹ قائم کیے گئے ہیں، یہاں عرصۂ تعلیم پانچ سال ہے۔ نصابِ تعلیم کے بارے میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے کہ تازہ ترین فنی دریافتوں کے ساتھ ہمقدمی رہے، ان اداروں میں داخل ہونے والے طلبا کی تعداد ملکی ضرورتوں کے مطابق رکھی جاتی ہے، ان کے علاوہ کچھ مدرسے ادنیٰ سطح پر بھی قائم کیے گئے ہیں۔

دیہاتی نصاب (مردانہ) دیہاتی نصابوں کی غرض یہ ہے کہ دہقانوں کو جدید آلاتِ زراعت کے استعمال سے روشناس کیا جائے، انہیں ان کی مرمت کرنا سکھایا جائے۔ نیز انہیں تربیت دی جائے کہ سردی کے بے کار مہینوں میں اپنے آپ کو کسی چھوٹی موٹی دستکاری میں لگائے رکھیں سردست صرف دیہاتی بڑھئی اور دیہاتی لوہار کا کام ہی داخلِ نصاب ہے، ان نصابوں کی میعاد صرف چھ مہینے ہے، نصاب ختم ہونے پر اُستاد اگلے گاؤں کا رخ کرتے ہیں، ان نصابوں کی تعداد بڑھائی جا رہی ہے تاکہ ہر دیہاتی ان سے استفادہ کر سکے۔

ٹیکنیکل یونی ورسٹی اور ٹیکنیکل اسکول (استنبول) ٹیکنیکل یونی ورسٹی پہلے انجینئرنگ اسکول کے نام سے مشہور تھی ۱۹۴۲ء میں یہ وزارتِ تعلیم کی نگرانی میں آگئی، اب یہ ہر سال کوئی ۱۵۰ نوجوانوں کو تیار کرتی ہے عملی کام پر خاص زور دیا جاتا ہے، اس وقت یہ یونی ورسٹی مندرجہ ذیل مضامین پڑھاتی ہے۔

(الف) سول انجینئرنگ
(ب) تعمیری انجینئرنگ

(۴) ٹیکنیکل انجینرنگ
(۵) الیکٹریکل انجینرنگ

۱۹۴۴ء میں جہاز سازی کے شعبہ کا اضافہ ہوا، یونی ورسٹی میں کل کوئی ایک ہزار طلباء ہیں اور استادوں کی تعداد سوا سو کے قریب ہے۔

ٹیکنیکل اسکول بھی اسی سال وزارت تعلیم کی تحویل میں آیا یہ مستریوں اور انجینروں کو تربیت دیتا ہے، اس کے تعلیمی شعبے ٹیکنیکل یونی ورسٹی کے مضامین کی تعلیم کچھ کم تر سطح پر دیتے ہیں، طلبا کی تعداد پانچ سو کے قریب ہے اور اساتذہ کی تعداد ۳۷ -

ٹیکنیکل تعلیم کا پروگرام | ۱۹۴۴-۴۵ء میں ترکی میں مندرجہ ذیل فنی ادارے موجود تھے

	نام ادارہ	تعداد
(۱)	فنی استادوں کی تربیت گاہ (مردانہ)	۱
(۲)	لڑکوں کے لیے تجارتی انسٹی ٹیوٹ	۳۴
(۳)	لڑکوں کے لیے ادنیٰ تجارتی مدرسے	۴۵
(۴)	شبینہ تجارتی انسٹی ٹیوٹ	۳۴
(۵)	فن تعمیر کے انسٹی ٹیوٹ	۸
(۶)	دیہاتی نصاب	۱۰۰۰
(۷)	ٹیکنیکل یونی ورسٹیاں	۲
(۸)	ٹیکنیکل مدرسے	۲

۱۹۴۱ء میں ٹیکنیکل تعلیم کا الگ شعبہ قائم کیا گیا تھا، اس وقت سے کوشش یہ رہی ہے کہ ٹیکنیکل تربیت دینے والے اداروں کی تعداد لگاتار بڑھتی رہے تاکہ روزافزوں قومی ضرورتیں پوری ہوسکیں۔

نظم و نسق | جن دنوں پیشہ ورانہ تعلیم زنانہ تجارتی مدرسوں تک محدود تھی، ان دنوں اس

شعبہ کا انتظام ثانوی تعلیم کے محکمہ کے سپرد تھا، کچھ عرصہ بعد لگاتار بڑھنے والے پیشہ ورانہ مدارس کا انتظام اعلیٰ تعلیم کے محکمہ کو سونپا گیا۔ ۱۹۳۵ء میں وزارت کو یہ اختیار مل گیا کہ پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل تعلیم کا الگ شعبہ قائم کرلے، ٹیکنیکل تعلیم نے رفتہ رفتہ اتنی وسعت اختیار کی کہ ۱۹۴۱ء میں ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم کے نائب سیکرٹری کا عہدہ قائم کیا گیا اور مردانہ ٹیکنیکل تعلیم کا سارا کام اس کی نگرانی میں دے دیا گیا۔

لڑکیوں کے لیے فنی تعلیم جب سے جمہوریہ ترکیہ وجود میں آئی ہے لڑکیوں کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ وہ عام وسیع المشرب تعلیم اور فنی اور گھریلو سائنس کی تعلیم حاصل کریں جمہوریت کو صرف تین زنانہ ادارے ورثے میں ملے تھے، جب یورپ اور امریکہ سے ماہروں کو مشورہ کے لیے بلایا گیا تو ان سے یہ بھی درخواست کی گئی کہ زنانہ فنی تربیت کی توسیع کے لیے ذرائع تجویز کریں، چنانچہ ۱۹۲۷ء میں انقرہ میں عصمت پاشا زنانہ انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا۔ اسی نمونے پر ملک کے دوسرے مقامات پر زنانہ ادارے قائم ہوئے اور شبینہ مدرسے بھی یہ تعلیمی ادارے جو وزارت تعلیم کی نگرانی میں ہیں ایسے مضامین کی تعلیم دیتے ہیں جن کا تعلق گھریلو معاملات سے ہے۔

فنی استادوں کی زنانہ تربیت گاہ اول اول زنانہ انسٹی ٹیوٹ کی فارغ التحصیل طالبات کو مختلف مضامین کی اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ بھیجا گیا، تاکہ وہ واپسی پر زنانہ فنی مدرسوں میں تدریس کے فرائض سنبھال سکیں، مگر جب طالبات کی تعداد بڑھی تو استانیوں کی بہم رسانی کے لیے انقرہ کے عصمت پاشا زنانہ انسٹی ٹیوٹ میں استانیوں کی تربیت کا شعبہ کھول دیا گیا، یہاں زنانہ انسٹی ٹیوٹ کی فارغ التحصیل طالبات کو داخل کیا جاتا ہے اور تین سال تک اصول تعلیم کا مطالعہ کرایا جاتا ہے۔ متعلم استانیاں مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک مضمون میں خصوصی مہارت پیدا کرتی ہیں۔ کپڑے کاٹنا اور سینا۔ بنیان تیار کرنا۔ زری کا کام۔ مصنوعی پھول تیار کرنا، گھریلو سائنس۔ کھانے تیار کرنا، پیشہ ورانہ اور آرائشی ڈرائنگ، خانہ داری اور بچوں کی پرورش

اور نگہداشت، تربیت کے آخری سال میں طالبات کا بیشتر وقت عملی کام میں صرف ہوتا ہے، اور وہ ان اصولوں کی عملی مشق کرتی ہیں جو اب تک انہیں سکھائے گئے تھے۔

زنانہ انسٹی ٹیوٹ | زنانہ انسٹی ٹیوٹ کا نصاب پانچ سالہ ہے، یہاں مڈل درجہ کی عام تعلیم کے ساتھ گھریلو سائنس کے مختلف مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے، جو طالبات ابتدائی مدرسے سے فارغ ہو کر یہاں داخل ہوتی ہیں انہیں پہلے درجہ میں داخل کیا جاتا ہے، لیکن جو لڑکیاں مڈل اسکول یا لیسے سے آتی ہیں انہیں اوپر کے درجوں میں داخل کیا جاتا ہے، ان اداروں کی تعداد تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور آج ۷۰ زنانہ انسٹی ٹیوٹ ترکی کے مختلف حصوں میں قائم ہیں۔ ہر زنانہ انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ عملی کام کے لیے ورکشاپ، باورچی خانہ اور دھوبی گھر موجود ہے، اس کے علاوہ ایک اچھا کتب خانہ بھی ہے جس میں ترکی زبان اور غیر ملکی زبانوں کی کتابیں اور رسالے مہیا کیے گئے ہیں، ان زنانہ اداروں میں سے اکثر کو عوام کی طرف سے کام ملتا رہتا ہے، یہ کام مدرسے کی ورکشاپ میں ہوتا ہے اور لڑکیوں کو اس کی اجرت ادا کی جاتی ہے۔

زنانہ شبینہ مدارس | یہ مدرسے ان عورتوں کے لیے قائم ہیں جو کچھ سال تک مدرسے میں جا نہیں سکیں یا طالب علمی کے زمانہ کو پیچھے چھوڑ چکی ہیں، ان مدرسوں کے نصاب اس طرح مرتب کیے گئے ہیں کہ وہ سیکھنے والیوں کی عمر، ضرورت اور فارغ اوقات کے حسب حال ہوں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ گو ان کا نام شبینہ مدرسہ ہے وہ دن کے وقت بھی کام میں معروف رہتے ہیں۔ پہلے ان کا نصاب تین سال کا تھا، اب دو سال کا کر دیا گیا ہے، ہر زنانہ انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ ایک شبینہ تجارتی مدرسہ ملحق ہے، اس کے علاوہ ۲۷ اور شبینہ تجارتی مدرسے ہیں جن کا اپنا جداگانہ وجود ہے۔

زنانہ دیہاتی نصاب | چھوٹے قصبوں اور دیہات میں جہاں زنانہ انسٹی ٹیوٹ قائم ممکن نہیں وہاں مختصر زنانہ نصاب جاری کیے گئے ہیں، ایک استانی جسے اس غرض کے

خاص تربیت دی گئی ہوتی ہے، کسی ایک دیہاتی مرکز میں چند ماہ تک جماعت جاری رکھتی ہے
اور بعد ازاں دوسری جگہ جاکر یہی نصاب جاری کر دیتی ہے، ہر عملہ سال میں دو ایسے نصاب
ختم کرتی ہے، سردی کے دنوں میں ان کی سرگرمیوں کا مرکز گاؤں ہوتے ہیں اور فصل کے زمانے
میں یہ چھوٹے قصبوں میں اکٹھ آتی ہیں۔ تعلیمی ساز و سامان ایسا استعمال کیا جاتا ہے جسے آسانی
سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکے، یہ سامان وزارت تعلیم فراہم کرتی ہے۔ ان نصابوں
میں ایسے مضامین شامل ہیں جو دیہات کی گھریلو زندگی کے لیے مفید ہیں۔ مثلاً کپڑے کاٹنا اور
سینا، خانہ داری، سوئی کا باریک کام اور بچوں کی دیکھ بھال، اس قسم کا سب سے پہلا نصاب
۱۹۳۸ء میں جاری کیا گیا تھا، اس وقت ملک میں کم و بیش ڈیڑھ سو ایسے نصاب چالو ہیں

مردوں کے لیے درزی کی ادنیٰ جماعتیں اور شبینہ جماعتیں۔ یہ جماعتیں وزارت تعلیم
کے زیر اہتمام چل رہی ہیں، استنبول میں درزی کے کام کی جو ادنیٰ جماعتیں جاری ہیں وہ دو قسم کی
ہیں۔ ایک کی میعاد تین سالہ ہے اور یہاں کپڑے سینا سکھایا جاتا ہے، دوسری جماعت کی میعاد
صرف ایک سال ہے اور اس میں کپڑے کاٹنے کا کام سکھایا جاتا ہے۔ ۱۹۴۳ء میں ان جماعتوں
کے نصاب میں تاریخ جغرافیہ اور شہریت وغیرہ کے مضامین بھی شامل کیے گئے تھے، ان میں
وہ لڑکے داخل ہو سکتے ہیں جو ابتدائی مدرسے کی تعلیم پوری کر چکے ہوں، ان مدرسوں میں
شبینہ جماعتیں بھی جاری ہیں، ان مدرسوں میں لوگوں کا کام بھی لیا جاتا ہے، یہ کام ورکشاپ
میں ہوتا ہے۔

کاروباری مدرسے۔ جمہوریت کے قیام کے بعد ترکی میں تجارت کو فروغ ملنے لگا۔ قومی بینک
بیمہ کمپنیاں، اور صنعتی کمپنیاں قائم ہوئیں اور جلد تجربہ کار حساب کتاب جاننے والوں کی ضرورت
محسوس ہونے لگی، ۱۹۲۷ء میں وہ چند ادارے جو کاروباری تعلیم دیتے تھے وزارت کی تحویل
میں دے دیے گئے، اس طرح تربیت یافتہ لوگوں کی بہم رسانی کا مسئلہ اہمیت حاصل کر گیا
ازاں بعد مڈل اور ثانوی درجوں کے کاروباری مدرسے مختلف مقامات پر کھلنے لگے، اس ضمن میں

عام دستور یہ ہے کہ جہاں کاروباری مدرسہ کھولا جائے وہاں کے تاجروں سے مسلسل رابطہ رکھا جائے اور مدرسے کے طلبا کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ جس شعبہ میں وہ خصوصی تربیت لے رہے ہیں اس کے ساتھ عملی لگاؤ اور رابطہ پیدا کریں۔ ان مدرسوں میں شبینہ کاروباری جماعتیں بھی جاری ہیں۔

جو طالب علم ابتدائی تعلیم ختم کر کے کاروباری مدرسہ میں داخل ہوتا ہے، اسے تین منزلوں میں سے گذرنا پڑتا ہے، جن میں سے ہر ایک کی میعاد دو سال ہے۔ پہلی دو منزلیں کاروباری مڈل جماعتیں کہلاتی ہیں اور آخری دو سال "کاروباری لیسے" کے نام سے موسوم ہیں، اس بات کا انتظام موجود ہے کہ عام مڈل اسکولوں سے جو طلبا کاروباری مڈل اسکولوں میں آنا چاہیں وہ ایسا کر سکیں ۱۹۴۵ء میں گیارہ کاروباری لیسے موجود تھے، جن کے ساتھ دو ادنیٰ منزلیں بھی ملحق تھیں، گیارہ مڈل درجہ کے کاروباری مدرسے ان سے الگ موجود تھے، ان مدرسوں کے نصاب میں ایک غیر ملکی زبان کے علاوہ کاروباری حساب۔ بک کیپنگ۔ اکاؤنٹنگ۔ شارٹ ہینڈ۔ ٹائپ اور خط نویسی شامل ہیں۔

کاروبار اور معاشیات کے اعلیٰ مدارس جن کاروباری مدرسوں کا ذکر اوپر گذرا ہے ان کے علاوہ ملک میں دو اعلیٰ مدارس بھی ہیں، جہاں کاروبار اور معاشیات کی بلند تر تعلیم دی جاتی ہے، ان میں سے ایک مدرسہ استنبول میں ہے، اور دوسرا ازمیر میں ان میں سے استنبول کا مدرسہ ۱۹۶۳ء سے جاری ہے، یہ ۱۹۳۸ء میں وزارت تعلیم کی نگرانی میں آیا تھا ازمیر کا مدرسہ ۱۹۴۴ء میں جاری کیا گیا تھا، ان دونوں کے نصاب میں مندرجہ ذیل شعبے شامل ہیں:۔

(ا) ملکی تجارت اور مالیات

(ب) غیر ملکی تجارت اور قونصل خانوں کے فرائض۔

(ج) بینکاری اور حساب کتاب۔

کاروباری مدرسوں میں عملی کام پر خاص زور دیا جاتا ہے، طلبا کی تنظیمیں اس سلسلہ میں بڑی مفید خدمات انجام دیتی ہیں۔ مثلاً طلبا کے کوآپریٹو سٹور جو کلی طور پر طلبا کے ہاتھ میں ہیں

ہر طالب علم کو باری باری مختلف کاروباری ذمہ داریاں سنبھالنے کا موقع دیتے ہیں اسی طرح طلبا کا دفتر روزگار ملک کی کاروباری زندگی کے ساتھ تعلقات قائم رکھتا ہے اور اعلیٰ کاروباری مدرسوں کے گریجویٹوں کو کام تلاش کرنے میں مدد دیتا ہے، ان تنظیموں کے علاوہ ان طلبا نے وہ باقی تنظیمیں بھی قائم کر رکھی ہیں جو عام طلبا نے قائم کی ہیں۔

تعداد طلبا و اساتذہ | ترکی میں ٹیکنیکل تعلیم اس وقت جس مقام پر پہونچ چکی ہے اس کا کچھ اندازہ ۱۹۴۴-۴۵ء کے اعداد و شمار سے ہو سکے گا جو نیچے درج ہیں۔

تعداد طلبا	لڑکے	لڑکیاں
۴۵۵۳۹	۳۵۶۸۲	۹۸۵۷
کل تعداد اساتذہ	**استاد**	**استانیاں**
۲۷۱۵	۱۹۱۱	۸۰۴

۲۔ پرائیویٹ مدرسے

جمہوریہ ترکی کے قیام سے پہلے عثمانی قلم رو میں غیر ملکی مدرسوں کا جال پھیلا ہوا تھا ۱۸۵۰ء سے لے کر پہلی عالم گیر جنگ کے آغاز تک ان مدرسوں کی تعداد میں لگاتار اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ کوئی شہر اور قصبہ ایسا نہ رہا جہاں غیر ملکی مدرسہ موجود نہ ہو، پہلی عالمی جنگ کے دوران میں ان میں سے بہت سے مدرسے بند ہو گئے، لیکن عہد نامہ لوزان کی رو سے ان تمام مدرسوں کو دوبارہ کھلنے کی اجازت مل گئی جو جنگ کے شروع ہونے سے پہلے چل رہے تھے، لیکن اس رعایت سے صرف کوئی ایک سو مدرسوں نے فائدہ اٹھایا پہلے غیر ملکی تعلیمی اداروں کو بڑی بڑی مراعات حاصل تھیں، یہاں تک کہ ان کا وجود ایک متوازی ریاست کا درجہ حاصل کر چکا تھا، جمہوری عہد میں خاص مراعات کا یک قلم خاتمہ ہو گیا، غیر ملکی مدرسوں کی ترجیحی حیثیت ختم ہو گئی اور انہیں بالکل انہی قواعد و ضوابط کا پابند ہونا پڑا جو باقی تعلیمی اداروں پر لاگو تھے، اس بدلی ہوئی صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ

آج ترکی میں صرف ۳۱ غیر ملکی مدرسے باقی ہیں یا چند ایک لیکچر ہال ہیں۔

۱۹۳۵ء میں ایک تعلیمی قانون منظور ہوا جس کی رو سے تمام غیر ملکی مدرسوں اور تھوڑی گنتی والی قوموں کے مدرسوں کے لیے بھی یہ امر لازمی ہو گیا کہ اپنے نصاب ہائے تعلیم میں ترکی ثقافت اور ترکی زبان کو جگہ دیں، اس قانون کی رو سے یہ بھی لازمی قرار دیا گیا کہ ترکی شہریت رکھنے والا ہر بچہ ابتدائی تعلیم ایسے مدرسوں میں حاصل کرے خواہ وہ سرکاری ہوں یا پرائیویٹ یا تھوڑی گنتی والی قوموں کے، جہاں ترکی ثقافت اور ترکی زبان داخل نصاب ہو۔ سب سے زیادہ غیر ملکی مدرسے استنبول میں واقع ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ترکی کے کسی اور شہر میں اتنے غیر ملکی لوگ نہیں بستے جتنے اس شہر میں، استنبول کے غیر ملکی مدرسوں میں تین امریکی ہیں آٹھ فرانسیسی۔ پانچ اطالوی، دو انگریزی۔ ایک بلغاری اور ایک ایرانی، غیر ملکی مدرسوں کی تعداد گھٹنے کے ساتھ ساتھ ترکی پرائیویٹ مدرسوں کی تعداد بڑھتی گئی ہے، آج ان کی تعداد ۹۰ کو جا پہونچی ہے۔

ملک میں تعلیم کو ترقی دینے کے لیئے ترکی انجمن تعلیم کے نام سے ایک قومی انجمن قائم ہے جس نے چار لیسے اور چار دار الطلبہ قائم کر رکھے ہیں۔

استنبول۔ ازمیر اور جناغیل میں یونانی۔ آرمینی اور یہودی اقلیتوں نے اپنے اپنے مدرسے کھول رکھے ہیں۔ ان میں سے ۸ لیسے ہیں ۲ مڈل اسکول اور ۵، ابتدائی مدرسے۔

۳۔ فنون لطیفہ

انیسویں صدی تک جب یورپ کے ساتھ ترکی کے گہرے مراسم اول اول قائم ہوئے، ملک میں مصوری اور سنگ تراشی کی اجازت نہ تھی، فنی اظہار کا قدرتی جذبہ جو اس طرح دبا رہتا تھا اپنے اظہار کے لیے آرائشی فنون اور اس قسم کی دوسری سمتیں تلاش کر لیتا تھا۔ عثمانی عہد میں ان از فنون اور فنی تعمیر میں معرکتہ الآرا شاہکار پیدا کیے گئے، فن تعمیر کی تاریخ میں ترکی معماری کا ایک یگانہ مقام ہے۔

مغربی اثرات کے بڑھنے کے سبب مصوری اور سنگ تراشی کے متعلق پرانے تصورات ختم ہونے لگے، چناں چہ ترکی میں مصوری، سنگ تراشی اور فن تعمیر کی تعلیم کے لیے پہلا سرکاری ادارہ ۱۸۸۳ء میں جاری کیا گیا، اس کا نام فنون لطیفہ کا مدرسہ تھا، اور یہ وزارت تجارت کی نگرانی میں تھا، ۱۸۸۶ء میں اسے وزارت تعلیم کی تحویل میں دے دیا گیا، ۱۹۱۷ء میں اسے انسٹی ٹیوٹ کا درجہ دے دیا گیا اور ۱۹۲۶ء میں اسے از سر نو منظم کر کے "فنون لطیفہ کی اکادیمی" میں تبدیل کر دیا گیا، یہ اکادیمی جو مکمل طور پر مغربی خطوط پر قائم کی گئی ہے ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ ہے، طلبا سے کوئی فیس نہیں لی جاتی مگر باقاعدہ حاضری لازمی ہے، اس اکادیمی کے پانچ شعبے ہیں یعنی۔

(۱) فن تعمیر (۲) مصوری (۳) آرائشی فنون (۴) سنگ تراشی (۵) ترکی آرائشی فنون۔

شعبہ فن تعمیر | یہ شعبہ فنون کی ذیل میں آتا ہے اور ایسے ماہر پیدا کرتا ہے جن کی جدید ترکی کو سخت ضرورت ہے، عثمانی دور کے آخری زمانے میں جو عمارتیں ترکی میں تعمیر ہوئیں وہ ایسے کاریگروں نے بنائیں جو فنی حسن اور علم سے بے بہرہ تھے، آج ملک کو ایسے نوجوان کاریگر میسر ہیں جو یہ اوصاف رکھتے ہیں، فنون لطیفہ کی اکادیمی اب تحقیقی مطالعہ اور تخلیقی قوت اظہار کا مرکز بن چکی ہے۔

اکادیمی کے اس شعبہ میں داخلہ کے لیے میٹرک پاس ہونا شرط ہے، داخلہ مقابلے کے امتحان کے ذریعہ ہوتا ہے، یہ مقابلہ ڈرائنگ، ریاضی اور ترکی مضمون نگاری میں ہوتا ہے، ضرورت مند طلبا کو وظیفے دیے جاتے ہیں، اس شعبے کا نصاب پانچ سال کا ہے، پہلے دو سال نظری تعلیم میں صرف ہوتے ہیں، تیسرا اور چوتھا سال زیادہ تر سٹوڈیو میں صرف ہوتا ہے اور پانچواں سال تمام تر عملی کام کی نذر ہوتا ہے۔

مصوری اور سنگ تراشی کا شعبہ | فنون لطیفہ کے مدرسے کے قیام سے پہلے بھی بعض ترک فن کار مغربی فنون لطیفہ سے اثر قبول کرنے لگے تھے، ان لوگوں کے شاہ کار ملک میں پسند کیے جانے لگے تھے، لیکن ملک میں ایسے فن کاروں کی تربیت اور حوصلہ افزائی کے لیے کوئی خاص انتظام نہ تھا، فنون لطیفہ کی اکادیمی کا یہ شعبہ اب یہ خدمت انجام دے رہا ہے، وہ موزوں

ذوق رکھنے والے ترک نوجوانوں کی فنی صلاحیتوں کی تربیت کرتا ہے اور ان ترک فن کاروں کے لیے ایک مرکز بہم پہونچاتا ہے جو مغربی ملکوں سے فنون لطیفہ کی تعلیم پاکر واپس آتے ہیں، اس طرح یہ شعبہ ترکی فنون لطیفہ کی تخلیق کا ذریعہ ثابت ہو رہا ہے۔

مصوری کے نصاب میں ذیل کے مضامین شامل ہیں (۱) ڈرائنگ (۲) آئل پینٹنگ (۳) ماڈل بنانا (۴) دیواری تصویریں بنانا (۵) کھود کر تصویریں بنانا۔

سنگ تراشی کے نصاب میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں (۱) مجسمے بنانا (۲) رلیف تیار کرنا (۳) راونڈ سے بوس (۴) پتھر اور لکڑی کا کام۔

مصوری اور سنگ تراشی کے شعبوں میں مڈل پاس طلبا داخل کیے جاتے ہیں، داخلہ کے وقت ان کی افتاد طبع کا اچھی طرح جائزہ لیا جاتا ہے، اس نصاب کی میعاد مقرر نہیں ہے اور نہ کوئی جماعت بندی ہی ہے، نصاب کا ختم کرنا ہر طالب علم کی اپنی استعداد پر موقوف ہے ہر روز قبل از دوپہر نظری تعلیم دی جاتی ہے مستحق طلبا کو وظیفے ملتے ہیں، جو طلبا غیر معمولی قابلیت کا ثبوت دیں انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے غیر ملکوں میں بھیجا جاتا ہے، اس شعبہ کے فارغ التحصیل طلبا میں سے بعض اسکولوں میں ڈرائنگ ماسٹری کا کام کرنے لگتے ہیں۔

عثمانی دور میں جو محل ولی عہد کے لیے مخصوص ہوا کرتا تھا اسے اب مصوری اور سنگ تراشی کے عجائب گھر میں بدل دیا گیا ہے۔ یہاں ترک مصوروں اور سنگ تراشوں کے کام کی نمائش کی گئی ہے، انقرہ میں ہر سال مصوری اور سنگ تراشی کی سرکاری نمائش کا اہتمام کیا جاتا ہے، اس نمائش میں ترک مصوری اور سنگ تراشی کے بہترین نمونے پیش کیے جاتے ہیں اور چوٹی کے تین فنکاروں کو اول، دوم اور سوم انعامات دیے جاتے ہیں۔

آرائشی فنون کا شعبہ اس شعبے کی دو شاخیں ہیں، مغربی اور مشرقی۔ مغربی شعبے میں ایسے لڑکوں کو داخل کیا جاتا ہے جو تجارتی مدرسوں کا نصاب ختم کر چکے ہوں، لڑکیوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ زنانہ انسٹی ٹیوٹ یا مڈل اسکول کی فارغ التحصیل ہوں

لیکن مڈل پاس طالبات کو ڈرائنگ اور نثر کی مضمون نگاری کا امتحان پاس کرنا پڑتا ہے نصاب کی میعاد پانچ سال ہے۔

نصاب کا ابتدائی حصہ عام اصولوں اور مبادیات پر مشتمل ہے اسے پورا کرنے کے بعد ہر طالب علم مختلف مضامین میں سے ایک کو خصوصی مہارت کے لیے چن لیتا ہے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس شعبہ کے بعض گریجویٹ اپنا کاروبار شروع کر دیتے ہیں اور بعض تجارتی انسٹی ٹیوٹ میں پڑھنے لگتے ہیں بعض گریجویٹ ڈرائنگ کے استاد بن جاتے ہیں۔

آرائشی فنون کی مشرقی شاخ میں داخلہ کے لیے کم از کم مڈل پاس ہونا ضروری ہے داخلہ مقابلہ کے امتحان کے ذریعہ ہوتا ہے جس میں ڈرائنگ اور نثر کی مضمون نگاری کے مضامین شامل ہیں، نصاب کی میعاد مقرر نہیں، ہر طالب علم اسے اپنی استعداد کے مطابق ختم کرتا ہے، نصاب میں مشرقی خطاطی اور فنون کے تمام اجزا شامل ہیں، ہر طالب علم ان میں سے چند مضامین کو خصوصی مہارت کے لیے چن لیتا ہے۔

موسیقی موسیقی کے موضوع پر ترک اہل الرائے مختلف خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں مشرقی موسیقی خاص طور پر بہت دلچسپ مباحث کا موضوع بنی رہی ہے۔

عثمانی دور میں درباری گویئے موجود ہوتے تھے، رفتہ رفتہ یہ درباری موسیقی مغرب سے اثر قبول کرنے لگی، اس کے پہلو بہ پہلو عوامی موسیقی ہمیشہ سے موجود رہی ہے، اس کی دلکش لے اور دلآویز موضوعات میں ہر ترک کے لیے کشش ہے، آج نوجوان ترک موسیقار جو نغمے تیار کر رہے ہیں وہ کلی طور پر مغربی تکنیکوں پر مبنی ہیں، البتہ ان کی روح خالص ترکی ہے۔

ترکی کی جمہوری حکومت نے قوم کے دبے ہوئے ڈرامائی ذوق کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی ہے، حکومت کی طرف سے تمثیل کاری کا ایک مدرسہ قائم ہے جس کی پہلی جماعت ۱۹۴۲ء میں فارغ التحصیل ہوئی تھی اس مدرسہ کے تربیت یافتہ فن کاروں نے ڈرامہ اور اوپرا کے وہ وہ شاہکار پیدا کیے ہیں جو ترکی تمثیل کاری کی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔

موسیقی کا سرکاری مدرسہ دو درجوں پر مشتمل ہے یعنی مڈل اور اعلیٰ، موخر الذکر جماعت میں ۲۵ لیرا (ترکی سکہ) سالانہ فیس ادا کرنی پڑتی ہے، لیکن مڈل درجہ تک تعلیم کے لیے کوئی فیس نہیں، البتہ اس تعلیم کے عوض کچھ عرصہ حکومت کی ملازمت کرنا پڑتی ہے۔

موسیقی اور ڈرامہ کا شعبہ موسیقی کا شعبہ چھے شاخوں پر مشتمل ہے، ان میں سے ایک کا تعلق نغموں کے تربیت دینے اور لکھنے سے ہے۔ چار موسیقی کے سازوں سے تعلق رکھتی ہیں اور چھٹی آواز کی تربیت سے متعلق ہے، اس شعبہ میں مدت تعلیم سات سال ہے، مڈل پاس لڑکوں اور لڑکیوں کو داخل کیا جاتا ہے۔

ڈرامہ کا شعبہ تین شاخوں پر مشتمل ہے، یعنی اوپرا۔ تھیٹر اور بالے، نصاب کی مدت تین سال کی ہے، اس شعبہ میں صرف وہی لوگ داخل ہو سکتے ہیں جو تربیت آواز کے نصاب کا ابتدائی اور اعلیٰ حصہ مکمل کر چکے ہوں، اس نصاب کا آخری سال پورے طور پر عملی کام کی نذر ہوتا ہے بورڈنگ میں رہنے والے طلبا اور طالبات کو ۸۵ لیرا ماہانہ وظیفہ ملتا ہے۔

فنون لطیفہ کے مختلف شعبوں کو ترقی دے کر ترکی نے نہ صرف ملکی وسائل سے قومی تفریح کا سامان پیدا کر لیا ہے۔ بلکہ قومی دولت اور توانائی کے ایک معتدبہ حصہ کو جو پہلے بیکار دردیشی ناچ اور اس قسم کی دوسری لغویات کی نذر ہوتا تھا ایک پسندیدہ تخلیقی راہ پر لگا دیا ہے۔

۴۔ جسمانی تعلیم

جب جمہوریت وجود میں آئی اس وقت ترکی میں جسمانی تعلیم کا قومی پیمانہ پر کوئی بندوبست نہ تھا۔ صرف شوقین لوگوں نے کہیں کہیں اس کا نجی انتظام کر رکھا تھا، مدرسوں میں بھی جسمانی تربیت کی حالت کچھ بہتر نہ تھی، جنگ آزادی کے کامیاب خاتمہ پر جہاں ملک میں دوسری تعمیری اور تخلیقی قوتوں کو فروغ ملا وہاں جسمانی تعلیم اور اسکاؤٹنگ کی تحریک کو بھی ہمہ گیر ترقی ملی، آج ان کوششوں کے نتائج سب کے سامنے ہیں۔

جسمانی تعلیم و تربیت کو عام رواج دینے کے لیے ایک قومی انجمن کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا پہلا اجتماع ۱۹۲۴ء میں انقرہ کے مقام پر ہوا، اس میں تمام صوبوں کے نمائندوں نے حصہ لیا انہی دنوں انقرہ میں جسمانی کرتبوں کی نمائش کا اہتمام بھی ہوا، اس میں ملک بھر کے کھلاڑیوں نے حصہ لیا۔ جسمانی کرتبوں کے علاوہ کشتیاں، فٹ بال کے میچ اور بائیسکلوں کی دوڑیں ہوئیں۔
۱۹۳۶ء میں اس انجمن کا نام ٹرکش سپورٹس سوسائٹی رکھ دیا گیا۔ ۱۹۳۸ء میں ایک قانون کی رو سے حکومت کو اختیار مل گیا کہ تعلیم جسمانی کا ایک محکمہ قائم کرے، جو وزیر اعظم کی تحویل میں ہو۔ چناں چہ ٹرکش سپورٹس سوسائٹی ختم کر دی گئی اور اس کا کام نئے سرکاری محکمہ نے سنبھال لیا ۱۹۴۲ء میں یہ محکمہ وزیر اعظم کی بجائے وزیر تعلیم کی تحویل میں دے دیا گیا۔

جمہوریت کے قیام سے پہلے ترکی کے مدرسوں میں تربیت جسمانی صرف نام کو موجود تھی، کیوں کہ اس کے لیے نہ کوئی استاد تھے نہ کوئی سامان، ملک بھر میں صرف ایک مدرسہ ایسا تھا جس کے پاس جمنیزیم تھا، اس صورت حال کی اصلاح کے لیے پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ تعلیم جسمانی اور سکاوٹنگ کے لیے ایک ڈائرکٹر مقرر کیا گیا، ۱۹۲۸ء میں کچھ ترک طلبا جرمنی اور سویڈن بھیجے گئے تاکہ ان ملکوں کی جسمانی تعلیم کے طریقوں کا مطالعہ کریں، اس سال جسمانی تربیت کے استادوں اور استانیوں کے لیے نصاب جاری کیے گئے، ۱۹۳۳ء میں انقرہ کے غازی تعلیمی انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم جسمانی کا شعبہ بھی کھول دیا گیا جس کا نصاب دو سالہ تھا، ۱۹۳۷ء سے یہاں استادوں کے علاوہ استانیوں کو بھی تربیت ملنے لگی، جسمانی تربیت کے استادوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے ۱۹۴۲ء میں استنبول میں بھی استادوں اور استانیوں کی ایک تربیت گاہ کھول دی گئی۔

ان تمام کوششوں کی افادیت کو جانچنے کے لیے مدرسوں میں طلبا کی کامیابی کی ایک ضروری شرط جسمانی تربیت کا ایک کم سے کم معیار مقرر کر دیا گیا، اس قانون پر ۱۹۳۱ء سے عمل شروع ہے اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ نمایاں قابلیت کے طلبا کا انتخاب ہو جائے، ۱۹۳۹ء سے ہر مدرسے میں کھیلوں کا کلب قائم ہے تاکہ بچے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں۔

حصولِ آزادی کے بعد سکاؤٹنگ کی تحریک کو پھر سے زندہ کیا گیا، استنبول میں اس تحریک کا مرکز قائم کیا گیا اور بالآخر یہ تحریک وزارتِ تعلیم کی تحویل میں دی گئی۔ پرانی سکاؤٹ تحریک کی جگہ اب اس تحریک کو نئی بنیادوں پر استوار کیا گیا۔ ہر قسم کے تعلیمی اداروں میں اس کے مرکز کھولے گئے، سکاؤٹ ماسٹروں کے فرائض معین کیے گئے۔ تحریک میں داخلہ اور باقی امور کے متعلق نئے اصول باندھے گئے۔

جسمانی تعلیم کے محکمہ کے ساتھ صحتِ جسمانی کا شعبہ بھی مستقل طور پر ملحق ہے۔ جسمانی تربیت اور کھیلوں کے معاملہ میں یہ شعبہ طبی نگرانی کی خدمت انجام دیتا ہے، اس کی کوشش یہ ہے کہ طبی مشورہ اور طبی معائنہ کے لیے مرکز اور کمیٹیاں قائم کرے، ہر کھلاڑی کو اپنا نام رجسٹر کرانے سے پہلے کڑے طبی معائنہ میں سے گذرنا پڑتا ہے۔

ان کوششوں کی کامیابی اس امر سے ظاہر ہے کہ ریاست ہائے بلقان کے کھیلوں کے مقابلہ میں ۱۹۳۳ء تک ترکی پانچویں درجے پر رہا۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۹ء تک اس کا درجہ چوتھا لیکن ۱۹۴۰ء میں اس نے پہلا درجہ حاصل کر لیا، ہر قسم کے کھیلوں اور جسمانی کرتبوں میں کئی نئے قومی ریکارڈ قائم کیے گئے ہیں۔

ہر سال ملک بھر میں سائیکلوں کی دوڑیں ہوتی ہیں جن میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا جاتا ہے فٹ بال سب سے زیادہ مقبول کھیل ہے جس کے میچ جگہ جگہ ہوتے رہتے ہیں۔ ترک فٹ بال کھلاڑیوں نے کئی دفعہ غیر ملکیوں کے ساتھ مقابلے بھی کیے ہیں۔

کشتی لڑنا ترک قوم کا پرانا اور مقبول مشغلہ ہے، اس جسمانی کرتب میں بہت ترقی ہوئی ہے ترک پہلوانوں نے یونانی اور رومی طریقہ پر کشتی لڑنے میں بڑا کمال پیدا کیا ہے، بلقان کی ریاستوں کے کھیلوں کے مقابلوں میں ترک پہلوان ہمیشہ پہلا درجہ حاصل کرتے رہے ہیں۔

کوہ پیمائی اور پہیے دار جوتوں کے ساتھ برف پر دوڑنا بالکل نئے کھیل ہیں، لیکن ان کی مقبولیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ملک کے برفانی حصوں میں یہ دور دراز دیہات تک عام ہو گئے ہیں۔

ان کھیلوں کے علاوہ دوسرے مغربی کھیل مثلاً ٹینس، والی بال، باسکٹ بال وغیرہ

بڑے شوق سے کھیلے جاتے ہیں، آبی کھیل - مثلاً تیراکی کشتی رانی کشتیوں کی دوڑیں جمہوری دور میں بھی مروّج ہوئیں اور بے حد مقبولیت حاصل کر گئیں، دراصل ترکی ان کھیلوں کے لیے نہایت موزوں ملک ہے کیوں کہ یہ ایک جزیرہ نما ہے اور جھیلوں دریاؤں اور ندی نالوں کی کثرت ہے اسی طور پر چوگان بازی اور گھوڑ سواری نے بھی خوب رواج پایا ہے۔

۵ - عجائب گھر

جدید تعلیم عجائب گھروں سے جو اہم خدمت لیتی ہے اس کا حال ہر اس شخص کو معلوم ہے جس نے مغربی ملکوں کے نظام تعلیم کا مشاہدہ کیا ہے۔ لندن، نیویارک، شکاگو، بوسٹن، فلاڈلفیا اور واشنگٹن ڈی سی کے عجائب گھروں میں ہر روز طلبا کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے رہتے ہیں۔ یہ طلبا اپنے استادوں کی رہنمائی میں مختلف مضامین کی زندہ تفسیریں دیکھنے آتے ہیں مشرقی ملکوں میں عجائب گھر کا تصور بہت کچھ مختلف ہے، اسے عموماً تعلیمی مرکز کی بجائے ایک ایسا مجموعہ نوادر سمجھا جاتا ہے جو دیکھنے والوں پر حیرت کا عالم طاری کر دے، ترکی کے عجائب خانوں کی بھی بالکل حال ہی تک یہی کیفیت تھی، ترکی میں سب سے پہلا عجائب گھر ۱۸۵۵ء میں قائم ہوا، اس کی حیثیت شاہی نوادر کے ایک ڈھیر کے سوا کچھ نہ تھی، اس کا پہلا کیوریٹر ایک انگریز مقرر ہوا جس نے ان نوادر کی باقاعدہ فہرست مرتب کی اور انہیں قرینے سے منظم کیا۔ نظم و اصلاح کا یہ کام اسی طرح جاری رہا بیسویں صدی کے ربع اول میں اناطولیہ اور عثمانی سلطنت کے دوسرے حصوں میں کھدائی کا جو کام ہوا اس سے ترکی عجائب خانوں کی دولت بہت بڑھ گئی۔

جمہوری دور میں عجائب گھروں کو نئی اہمیت ملی، ابھی جنگ آزادی جاری تھی کہ محکمہ ثقافت قیام عمل میں لایا گیا ۱۹۲۲ء میں اس محکمہ کو تین حصوں میں بانٹ دیا گیا (۱) عجائب گھر (۲) فنون لطیفہ (۳) کتب خانے۔ اس محکمے کی کوشش اس بات پر صرف ہوتی ہے کہ ترکی تاریخ کے جو خزانے ملک کے مختلف حصوں میں بکھرے پڑے ہیں ان کی حفاظت کی جائے اور

لوگوں کو ان سے روشناس کرایا جائے ، جمہوری دور سے پہلے صرف شاہی عجائب خانہ ہی ملک کا سب سے بڑا عجائب گھر تھا، اب چھوٹے بڑے عجائب خانوں کی تعداد ۹۳ تک جا پہنچی ہے ، ان میں سے بعض براہ راست حکومت کی نگرانی میں ہیں بعض مقامی حکومتوں کے ہاتھ میں ہیں اور بعض نوادرات قدیمہ کے مجموعے ہیں، ان عجائب گھروں میں نہ صرف ترکی اسلامی تاریخ کے جواہر پارے جمع ہیں بلکہ بازنطینی رومی ۔ کالدی، یونانی مصری ، فونیقی اور حطی تاریخ کے کئی نوادر بھی موجود ہیں، ان تاریخی خزانوں میں دو ستر ہزار میخی خط میں لکھی ہوئی تختیاں بھی ہیں، جو ایشیائے کوچک کی قدیم تاریخ کا بڑا ماخذ ہیں، کیمیائی عمل گاہ نے ان تختیوں کو صاف کرنے کی خدمت اپنے ذمہ لے رکھی ہے تاکہ ان کی عبارتیں صاف طور پر پڑھی جا سکیں ۔

ترکی پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کر کے تمام شاہی محلوں کو عوامی املاک قرار دیا تھا اس طرح طوپکاپی سرا جگلیوں (ترکی سلطانوں کے شہرہ آفاق محلات) عجائب گھر میں تبدیل ہو گئے، اس طرح ۱۹۳۵ء میں منظور شدہ ایک قانون کی رو سے سینٹ صوفیہ کی تاریخی مسجد بھی عجائب گھر میں بدل دی گئی ۔

طوپکاپی سرا جگلیو کے محلوں اور ملحقہ عمارتوں نے ۰۰۰ ۸ ۷ مربع میٹر جگہ گھیر رکھی ہے اس مقام پر پہلا محل سلطان محمد ثانی نے پندرھویں صدی میں بنوایا تھا، اگلی پانچ صدیوں میں محلوں اور عمارتوں کا یہ سلسلہ رفتہ رفتہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، آج یہ محلات اور ان کا ساز و سامان ان بیتی ہوئی پانچ صدیوں کی منہ بولتی کہانی سنا رہے ہیں اور روزانہ ہزاروں لوگ ملک کے مختلف حصوں اور دنیا کے دور دراز گوشوں سے اس مرقع عبرت کو دیکھنے آتے ہیں ۔

یہ محل نہ صرف ترکی فن تعمیر کی تدریجی ترقی کا پتہ دیتے ہیں بلکہ دوسرے ترکی فنون کی ترقی کا حال بھی بتاتے ہیں ۔ غیر ملکی اثرات نے ان فنون میں جو تبدیلیاں پیدا کیں وہ بھی صاف طور پر

دیکھی جا سکتی ہیں، ان محلوں میں مندرجہ ذیل اشیاء کے مجموعوں کی نمائش کی گئی ہے۔
(1) آلات جنگ (ب) چینی کے برتن (ج) چاندی کے برتن اور قیمتی پتھروں سے بنی ہوئی چیزیں (د) سونے اور چاندی کے سکے۔

ایک اور اہم عجائب گھر اسلامی اور ترکی فنون کا عجائب خانہ ہے جو مشہور سلیمانیہ دارالعلوم کی عمارت میں قائم کیا گیا ہے، یہ عمارت مشہور ترک معمار سنان کی تعمیر کردہ ہے اور مسجد سلیمانیہ کے قریب واقع ہے، اس عجائب خانہ میں ترکی قالینوں اور عربی، فارسی خطاطی کے بہترین نمونے دیکھے جا سکتے ہیں، ان کے علاوہ یہاں قدیم ترکی اسلامی ثقافت کے دوسرے آثار بھی کثرت سے جمع ہیں۔

ایا صوفیہ کی مشہور مسجد جو اب ایک عجائب گھر ہے پہلے ایک گرجا تھی، اس مقام پر سب سے پہلے بازنطینی شہنشاہ قسطنطین نے ایک عبادت گاہ بنوائی تھی جو ۵۳۱ء میں گر گئی۔ اس کی جگہ جسٹی نین نے سینٹ صوفیہ کا گرجا بنوایا۔ اس کی عمارت اور اندرونی آرائش بازنطینی تعمیر اور آرٹ کے مکمل نمونے ہیں ۱۴۵۳ء میں یہ گرجا ایک مسجد میں بدل دیا گیا، اور بالآخر ترکی وزارت کے ایک فیصلہ کے مطابق یہ عجائب گھر بن گیا۔
مسجد ہونے کے زمانے میں اس تاریخی عمارت کے دیواری نقش و نگار اور تصویروں کو موٹے پلستر سے ڈھانپ دیا گیا تھا، اس پلستر کو دور کرنے کا کام ایک امریکی سائنسی وفد کے حوالے کیا گیا جس نے پروفیسر وٹیمور کی سرکردگی میں یہ کام انجام دیا اور بازنطینی مسیحی تصویریں اور نقش و نگار ازسرنو منظر عام پر آگئے، ایک مشہور جرمن ماہر آثار قدیمہ نے کھدائی کرکے بازنطینی عہد کے اور کئی نوادر کھود نکالے، غرض ایا صوفیہ آج کوئی عبادت گاہ نہیں بلکہ انمول تاریخی دولت کا ایک خزانہ ہے۔

تاریخی خزانوں کا ایک اہم جز وہ قیمتی کتابیں ہیں جو ترکی اسلامی دور میں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ جب مغربیت تنگ نظری اور مذہبی تعصب کے اندھیرے میں

کم تھا، اسلامی دنیا میں وسیع نظری اور آزاد خیالی کا دور دورہ تھا، یہ کتابیں نہ صرف ادبی اور فکری جواہر پاروں سے بھرپور ہیں، بلکہ ان کا ظاہری حسن آرٹ کا ایک لطیف نمونہ پیش کرتا ہے، یہ تمام کتابیں کتب خانوں میں محفوظ ہیں، ان کے علاوہ جدید علوم کی کتابیں بھی جمع کھول کر حاصل کی گئی ہیں، کتب خانوں کی تنظیم کا کام وزارت تعلیم نے ایک ڈائرکٹر کے سپرد کر رکھا ہے، اس وقت ترکی میں کم و بیش پچاس عوامی کتب خانے موجود ہیں۔

خاتمہ کلام مضمون کی اس آخری قسط کے ساتھ ترکی نظام تعلیم کا اجمالی خاکہ ختم ہوتا ہے، یہ خاکہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ ایک نیا حال گر اولوالعزم قوم نے اپنے لیے زندگی کا تازہ قانون کیوں کر حاصل کیا، ترکی نظام تعلیم میں کئی خامیاں بھی ہیں، لیکن اس سلسلہ میں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ دنیا کے کسی ملک کا نظام تعلیم بھی مکمل نہیں، ہاں جمہوریہ ترکی نے جس جرات اور ثابت قدمی کے ساتھ صدیوں کا جمود ختم کرنے اور زندگی کا نیا شعور پیدا کرنے کی جو کوشش کی ہے اور اس مطلب کے لیے نظام تعلیم کی جو تعمیر نو کی ہے وہ دوسری ایشیائی قوم کے لیے ایک اچھا سبق ہے ؛

جمہوریت اور مدرسہ

محمد عبد العزیز مسلسل نمبر ۲

پہلی عالمگیر لڑائی کے بعد ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ مغربی استعمار پرستوں کے لیے سوہان روح بن گیا۔ ہندوستان کو آزادی پر اصرار اور انگریز کو اپنی حکومت کے استحکام پر ناز۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، حسرت موہانی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، مولانا آزاد، ڈاکٹر اقبال اور محمد علی جناح جیسے لوگ موجود تھے۔ لیکن انگریزوں کے زیر سایہ ہندوؤں میں بھی اقتدار کا ایسا جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اپنی عددی اکثریت کی بنا پر اس ملک کے ایک ایک حصے میں رام راج قائم کرنا چاہتے تھے اور ان کے لیے حالات بھی ایسے ناساز گار نہ تھے، اس طرح اب مسلمانوں کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ متحد ہو کر یقان کے ساتھ متحد و مجتمع ہو کر زندگی کا نیا ڈول ڈالیں، چنانچہ مسلمانوں نے اپنے دینی و ثقافتی سرمائے کے تحفظ کے لیے اس برصغیر میں ایک علاحدہ مملکت کا مطالبہ کیا۔ ایک ایسی مملکت کہ جہاں مسلمان، قرآن و سنت نبوی کی روشنی میں زندگی بسر کر سکے، اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پاکستان کا مطالبہ خالص دینی اور ثقافتی تھا اور اس مطالبے کا سرچشمہ اسلام اور کتاب اللہ۔ یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد بعض اہل الرائے نے اسے عہد جدید میں اسلام کی بہت بڑی فتح قرار دیا تھا، کیوں کہ اس دور میں اللہ اور رسول کا نام لے کر ایک مملکت کا قائم ہو جانا کسی معجزے سے کم نہیں، اس کی تخلیق میں قومیت کے جغرافیائی تصور کو بھی توڑ دیا گیا۔ کیوں کہ پاکستان کے دونوں حصوں کے مابین ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے اور ان دونوں خطوں کے میل جول کی بنیاد اسلام ہے۔

ایک نیا تجربہ

دراصل پاکستان جمہوریت کا ایک نیا تجربہ ہے، اگر یہ درست ہے تو اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ پاکستان میں کس قسم کی جمہوریت قائم ہو سکتی ہے، یہی مغربی جمہوریت جس کا "پیراہن" مذہب کا کفن ہے یا ہمیں مغرب کے جمہوری نظام کو اپنے قومی اور ملی تقاضوں کے پیش نظر کچھ ترمیم و تنسیخ کر کے اپنے مزاج و آہنگ کے مطابق بنانا ہوگا، مغربی جمہوری نظام تمام تر

گم تھا، اسلامی دنیا میں وسیع نظری اور آزاد خیالی کا دور دورہ تھا، یہ کتابیں نہ صرف ادبی اور فکری جواہر پاروں سے بھرپور ہیں، بلکہ ان کا ظاہری حسن آرٹ کا ایک لطیف نمونہ پیش کرتا ہے، یہ تمام کتابیں کتب خانوں میں محفوظ ہیں، ان کے علاوہ جدید علوم کی کتابیں بھی جمع کی گئی ہیں، کتب خانوں کی تنظیم کا کام وزارت تعلیم نے ایک ڈائرکٹر کے سپرد کر رکھا ہے، اس وقت ترکی میں کم و بیش پچاس عوامی کتب خانے موجود ہیں۔

خاتمہ کلام

مضمون کی اس آخری قسط کے ساتھ ترکی نظام تعلیم کا اجمالی خاکہ ختم ہوتا ہے، یہ خاکہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ ایک تباہ حال مگر اولوالعزم قوم نے اپنے لیے زندگی کا تازہ قانون کیوں کر حاصل کیا، ترکی نظام تعلیم میں کئی خامیاں بھی ہیں، لیکن اس سلسلہ میں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ دنیا کے کسی ملک کا نظام تعلیم بھی مکمل نہیں، ہاں جمہوریہ ترکی نے جس جرات اور ثابت قدمی کے ساتھ صدیوں کا جمود ختم کرنے اور زندگی کا نیا شعور پیدا کرنے کی جو کوشش کی ہے اور اس مطلب کے لیے نظام تعلیم کی جو تعمیر نو کی ہے وہ دوسری ایشیائی قوم کے لیے ایک اچھا سبق ہے ؞

جمہوریت اور مدرسہ

محمد عبدالعزیز مسلسل نمبر ۲

پہلی عالم گیر لڑائی کے بعد ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ مغربی استعمار پرستوں کے لیے سوہانِ روح بن گیا۔ ہندوستان کو آزادی کا پر اصرار اور انگریز کو اپنی حکومت کے استحکام پر تاؤ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مولانا محمد علی، حسرت موہانی۔ ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، مولانا آزاد، ڈاکٹر اقبال اور محمد علی جناح جیسے لوگ موجود تھے۔ لیکن انگریزوں کے زیرِ سایہ ہندوؤں میں بھی اقتدار کا ایسا جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اپنی عددی اکثریت کی بنا پر اس ملک کے ایک ایک حصے میں رام راج قائم کرنا چاہتے تھے اور ان کے لیے حالات بھی ایسے ناساز گار نہ تھے، اس طرح اب مسلمانوں کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ ایقان کے ساتھ متحد و مجتمع ہو کر زندگی کا نیا ڈول ڈالیں، چنانچہ مسلمانوں نے اپنے دینی اور ثقافتی سرمائے کے تحفظ کے لیے اس برصغیر میں ایک علاحدہ مملکت کا مطالبہ کیا۔ ایک ایسی مملکت کہ جہاں مسلمان، قرآن و سنتِ نبوی کی روشنی میں زندگی بسر کر سکے، اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پاکستان کا مسئلہ خالص دینی اور ثقافتی تھا اور اس مطالبے کا سرچشمہ اسلام اور کتاب اللہ۔ یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد بعض اہل الرائے نے اسے عہدِ جدید میں اسلام کی بہت بڑی فتح قرار دیا تھا کیوں کہ اس دور میں اللہ اور رسول کا نام لے کر ایک مملکت کا قائم ہو جانا کسی معجزے سے کم نہیں، اس کی تخلیق میں قومیت کے جغرافیائی تصور کو بھی توڑ دیا گیا۔ کیوں کہ پاکستان کے دونوں حصوں کے مابین ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے اور ان دونوں خطوں کے میل جول کی بنیاد اسلام ہے۔

ایک نیا تجربہ دراصل پاکستان جمہوریت کا ایک نیا تجربہ ہے، اگر یہ درست ہے تو اب ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ پاکستان میں کس قسم کی جمہوریت قائم ہو سکتی ہے، یہی مغربی جمہوریت جس کا "پیراہن" مذہب کا کفن ہے یا ہمیں مغرب کے جمہوری نظام کو اپنے قومی اور ملی تقاضوں کے پیشِ نظر کچھ ترمیم و تنسیخ کر کے اپنے مزاج و آہنگ کے مطابق بنانا ہو گا، مغربی جمہوری نظام نام تر

یئی اور ہیولائی ہے ۔ اگر اس میں دین کو کوئی مقام حاصل ہے تو محض اس قدر کہ اتوار کو کلیسا میں چند
ئیں لگا کر واپس چلے آئیں ۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مغرب کو خداوندان مسیحیت کے ان غیر فطری
رنا قابل قبول طریق کار کے خلاف مجاہدہ کرنا پڑا ، جسے انہوں نے ایمان کا جزو بنالیا تھا ۔ قرون وسطیٰ
یں جرمنی ، فرانس ، ہسپانیہ اور انگلستان میں دین کے خلاف جو کچھ ہوا وہ اس کلیسائی طاقت
ے خلاف ایک کھلا ہوا چیلنج تھا ، حتیٰ کہ زعمائے مغرب نے مذہب کو ایک نجی اور انفرادی مسئلہ قرار
ے کر اسے اپنی سماجی زندگی سے خارج کر دیا یا حسب ضرورت اسے اپنی سیاسی ضروریات کے
تابع بنا لیا اور قومیت کو نسل و رنگ اور جغرافیائی وحدت کے محبس میں بند کر دیا ۔

ضمیر اس مدنیت کا دیں سے ہے خالی فرنگیوں میں اخوت کا ہے نسب پہ قیام
بلند تر نہیں انگریز کی نگاہوں میں قبول دین مسیحی سے برہمن کا مقام
اگر قبول کرے دین مصطفیٰ انگریز سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

یہ درست ہے کہ مسیحیت یورپ کو ایک ایسا نظام زندگی نہ دے سکی جو دنیا میں رہ کر طاقتور دنیا
سے وابستہ ہو کر خدا سے بھی غافل نہ ہوتا ، مغرب والوں کو دراصل رہبانیت نے مذہب گریز بنایا
اور اب تو وہ اس ڈگر پر اس قدر تیز گام ہیں بلکہ اتنی دور جا چکے ہیں کہ ان کا واپس آنا ناممکن ہو گیا ، اس سے
یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایک ایسا جمہوری نظام جو تمام تر مغربی ہے ہمارے لیے قابل قبول نہیں اور نہ
اسے ہم یہاں کی معاشرتی زندگی پر منطبق کر سکتے ہیں ، اس لیے اس قسم کی کوئی کوشش قومی خودکشی
کے مترادف ہو سکتی ہے ۔

اس وقت ہمارے ملک میں تین قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جو مغرب کی اندھا دھند تقلید کو
اپنا ایمان سمجھتے ہیں ، دوسرے وہ جو مغرب کی ہر چیز سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ وہ مغرب کی ہے
ان دونوں گروہوں کے بین بین ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ ہمیں اپنی سماجی زندگی کی تعمیر نو میں
مغرب سے بھی بہت کچھ سیکھنا ہے ، لیکن وہ اس کے مشرقی جسم پر مغربی لباس کا ایک ناموزوں
خول اڑھا کر "تجدد" کا نام دینے کے لیے تیار نہیں ، اور حق یہ ہے کہ ہمارے لیے موزوں ترین

راستہ بھی یہی ہے، دو سو سالہ مغربی روابط کے باوجود اس ملک کے نوے فی صدی لوگوں کی زندگی
ان کا طریق فکر ان کا تمدن اور ان کی بول چال خالص دیسی اور مشرقی ہے، انگریزی تہذیب و تمدن
کی سرکاری سرپرستی بھی ہماری آبادی کے ایک بہت بڑے طبقے پر مغربی تہذیب کی چھاپ نہ لگا سکی۔
اگرچہ اس مقصد کے حصول کے لیے آقایان فرنگ نے مشرقی طرز کے مدرسوں کو بند کر دیا
تھا کیوں کہ افکار و خیالات کی ترویج اور تہذیب و تمدن کو رواج دینے میں تعلیم گاہیں سب سے
اہم اور موثر ذریعہ ثابت ہو سکتی تھیں۔

ہماری ضروریات

ان حالات کے پیش نظر امریکی مدرسوں کی طرح ہمارے مدارس بھی چار
بنیادی اصولوں کو اپنا کر طلبا کی تہذیب و تربیت میں نمایاں حصہ لے سکتے
ہیں، یہ اصول جن پر ہمارے جمہوری معاشرے کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے بظاہر کوئے گرہی کے اصول
ہیں، لیکن ہمیں اپنے قومی تقاضوں کے مطابق انہیں اپنے رنگ میں ڈھال لینا ہوگا۔

(۱) روشن ضمیر شہریوں کی تخلیق
(۲) قومی اتحاد کی تعمیر
(۳) اسلامی مزاج کی ترویج
(۴) سماجی یک جہتی کی تشکیل

جمہوریت کی ترقی و استحکام کے لیے ہر شہری کا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے، اسی لیے تو
تعلیم گاہوں کو جمہوریت کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے یعنی جو خیالات و نظریات بچپن میں عنفوان شباب
تک بچوں کی اجتماعی اور ہمہ گیر نشوونما کا جزو ہوں گے، آگے چل کر وہ انہیں اپنی زندگی سے علاحدہ
نہیں کر سکتے وہ عمر بھر اسی ڈگر پر چلتے رہیں گے، پاکستان ایک نیا ملک ہے لیکن اس کے
بعض ادارے بہت قدیم اور پرانے ہیں، اس کی تمدنی زندگی سو دو سو برس نہیں ہزاروں برس
پرانی ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ اسلامی جمہوریت کی ایک سچی تجربہ گاہ ہے جہاں قرآن و سنن نبوی
کی روشنی میں ایک نیا دستور مرتب کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جو بظاہر وقت کے نئے رجحانات

کے مطابق ہوگا، لیکن اس کا مزاج اور اس کی اصل اسلامی ہوگی جس کی تعمیر و تشکیل میں ہماری
تعلیم گاہیں سب سے اہم پارٹ ادا کرسکتی ہیں۔

شہری جمہوریت، روشن ضمیر، بالغ نظر اور بلند فطرت رائے دہندوں کے بغیر ایک
جسدِ بے روح بن جاتی ہے، کیا ہم اپنی اس نئی جمہوریت کو حق آگاہ رائے دہندگان
کی عدم موجودگی میں چلا سکتے ہیں، اس کا جواب بہرصورت نفی میں ہوگا۔ لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا
ہے کہ اس قسم کا شہری کہاں اور کس طرح پیدا کیا جائے، آخر انسان ہے اسے مشین میں ڈھالا تو نہیں
جا سکتا، اس کی تخلیق اور تعمیر و تشکیل کے لیے کوئی ایسا ادارہ ہونا چاہیے جو ایسی تربیت دے کہ وہ
زندگی اور اس کے حقائق سے ایک رابطہ اور ہم آہنگی پیدا کرلے، ہماری معاشرتی زندگی میں شہریت
کی تربیت کے تین اہم ادارے ہیں۔ پہلا اہم ادارہ تو گھر اور اس کا ماحول ہے، بچے کی معاشرتی
زندگی گھر ہی سے شروع ہوتی ہے وہ یہیں بولنا، چلنا، اٹھنا، بیٹھنا اور اس کے ساتھ ساتھ
دوسرے معاشی آداب سیکھتا ہے جس کا اثر اس کی زندگی میں تا دمِ آخر باقی رہتا ہے، جب بچہ
قدرے بڑا ہوتا ہے تو گھر کے ماحول سے نکل کر اپنی گلی اور محلے کے بچوں سے رابطہ قائم کرتا ہے
ان کے ساتھ مل کر کھیلتا ہے، خود ان کا اثر قبول کرتا ہے اور اپنا اثر ان پر ڈالتا ہے، اس کے
بعد جب بچہ ذرا اور بڑا ہوتا ہے تو وہ ایک تیسرے سماجی ماحول سے متاثر ہوتا ہے، یہ اس کے
مدرسے کا ماحول ہے، یہاں اسے بے شمار بچے ملتے ہیں جن کی ذہنی، اخلاقی اور سماجی سطح
ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہے، ان میں امیر کبیر بھی ہوتے ہیں اور مفلس و نادار بھی
شریف النفس اور خوش اخلاق بھی ہوتے ہیں، کج رو اور کم بین بھی، وہ اس نئے ماحول میں
دو ایک دن تو ضرور اجنبی رہتا ہے، لیکن بہت جلد وہ اس سے اس قدر مانوس ہوجاتا ہے کہ
یہی ماحول اس کی اصل زندگی بن جاتا ہے، اب گھر، محلے اور مدرسے کا ماحول بچے کی زندگی پر اپنے اپنے
نقوش مرتسم کرنے میں مصروف ہوجاتے ہیں، اور یہی نقوش اس کی شہریت کی تربیت ہوتے ہیں، یہاں
جو کچھ وہ سیکھتا ہے، جو کچھ حاصل کرتا ہے اس پر وہ اپنے مستقبل کا محل تعمیر کرتا ہے جس میں معمار کا

شخصیت کے مطابق تجدد کی میناکاریاں بھی ہو سکتی ہیں اور اس کے کام کا رنگ روغن بھی، لیکن اگر اس کی
تعمیر میں ذرا سی بھول چوک ہو گئی تو آگے چل کر ایک اچھے معمار کی کاریگری بھی اس کی دیواروں کو
قائم نہیں رکھ سکتی۔ چنانچہ ان تینوں اداروں میں مدرسہ شہریت کی تعمیر و تشکیل کا سب سے بڑا عمل
ہے۔ مدرسے ہی میں قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ لارڈ ولنگٹن کے اس قول میں کہ واٹرلو کی لڑائی ایٹن
کے میدان میں جیتی گئی جو صداقت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس عمل میں انسان کی
شخصیت کا تجزیہ ہی نہیں ہوتا اس کی صحیح تعمیر و تشکیل بھی ہوتی ہے اور بقول بنجمن رش "جمہوریت کو
تادیر زندہ رکھنے کے لیے تعلیم کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے"۔ تعلیم سے بیگانہ رہ کر جمہوری
نظام کو چلانا ممکن نہیں۔

امریکہ والوں کو ناز ہے کہ ہم نے مختلف النوع انسانوں کو ایک قوم بنا کر ان میں اتحاد و اتفاق
پیدا کیا اور ایک ایسے نظام حکومت کی بنیاد ڈالی جس میں ایک آمر کے لیے کوئی گنجائش نہیں
یہ ممکن ہے کہ ایک متوسط ذہن و دماغ کا آدمی صدر منتخب ہو جائے، لیکن کسی فوجی آمر کا
حکومت پر قبضہ کر لینا امریکی جمہوری نظام میں ناممکن ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ
امریکی شہری اپنے حق رائے دہندگی کو ایک مقدس امانت سمجھ کر اس کا صحیح استعمال کرتا ہے، وہ
جانتا ہے کہ اس کی ایک لغزش سے پوری قوم کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، مگر یہ سوجھ بوجھ
اور یہ سلیقہ کیوں کر اور کیسے پیدا ہوتا ہے، اس کے لیے دانش اور صحیح جمہوری مزاج کی ضرورت ہے
جسے ملک کے مدرسے ہی مہیا کر سکتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کیا ہم اپنے مدرسوں سے اس قسم کا
کام لیتے ہیں یا شہریت کی تعمیر و تشکیل میں اس قسم کا کام لے سکتے ہیں۔

ہمارے ملک میں حالات بالکل مختلف ہیں، یوں تو یہاں جمہوری نظام قائم ہو چکا ہے اور
لوگوں کو حق رائے دہندگی بھی مل چکا ہے مگر ابھی تک ہم نے اس حق کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ
نہیں لگایا، یا ہم اس جہالت کی تاریکی میں صحیح اندازہ لگا بھی نہیں سکتے، پنجاب کے پچھلے انتخابات
میں مجھے اپنے گاؤں جانے کا اتفاق ہوا، اس حلقے میں ایک پیر صاحب اور دو دوسرے

امیدوار انتخابی مہم کے طوفانی دورے پر تھے، پیر صاحب پچھلے بیس پچیس برس سے اس حلقے سے بلا مقابلہ منتخب ہوجایا کرتے تھے، آزادی کے بعد ان کے مقابلے میں دو امیدواروں کا اس طرح میدان میں آجانا ان امیدواروں کی بہت بڑی جسارت تھی جس کے لیے وہ ہر حریت پسند کے تشکر کے مستحق ہیں، اسی زمانے میں ایک دن ایک پڑوسی ایک خط لکھانے کے لیے میرے چھوٹے بھائی کے پاس آیا، خط لکھاتا رہا اور بیچ اس سے گپ شپ بھی کرتے رہے، میرے چھوٹے بھائی نے پوچھا "اللہ دین ووٹ کسے دو گے" اس نے نہایت بے پرواہی سے پوچھا۔" کی آکھیا جے ووٹ کینوں دیساں" میرے بھائی نے اس بات پر زور دیتے ہوئے پھر کہا۔" ہاں ہاں ووٹ کینوں دیساں"

اب اللہ دین مسکرایا اور کہنے لگا۔" تو سی شاہ دراں میناں نال مخول (مذاق) پئے کرندے او" اور اس نے میری طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھا کہ اس سلسلے میں اس کا ہم نوا ہو جاؤں۔ میرے بھائی نے اب کے ثقہ اور سنجیدہ بن کر کہا کہ میں تم سے مذاق نہیں کر رہا اور جب میرے یقین دلانے سے اسے کچھ یقین آیا تو اس نے نہایت سکون سے جواب دیا" ایہہ کہڑی وڈی گل اے۔ ووٹ کینوں دیساں۔ پیراں نوں دیساں ہور کینوں دیساں۔ آسی تو اہناں دے غلاماں دے غلام۔ پیر بادشاہ"

اس کے بعد یہ بحث دیر تک ہوتی رہی، ہم سب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی نہ ہٹا، اس کی نگاہوں میں پیر کی جو خیالی عظمت تھی وہ کسی طرح کم نہیں ہوسکتی تھی اور نہ اس کی نظروں میں ووٹ کی اتنی قدر و قیمت تھی کہ وہ اسے ایک مقدس امانت سمجھ کر ملک اور قوم کے مفاد کے پیش نظر استعمال کرتا، تھوڑی دیر بعد بوڑھا چلا گیا۔ میں اس کی معلومات، ووٹ کی قدر و قیمت اور عمومی حق رائے دہندگی کے متعلق دیر تک سوچتا رہا، کیا اس ملک میں جمہوری نظام جاری کیا جا سکتا ہے، کیا اس طرح کم کوش، عیش پرست اور حکومت پسند عناصر کو آگے آنے کا موقع نہیں مل سکتا، اس ملک میں جمہوریت بیمار ہے اور اس کے علاج کے لیے

نشتر و مرہم دونوں کی ضرورت ہے، چناں چہ ایسے ملک میں جہاں جمہور کے معلومات کا یہ عالم ہو ایک روشن ضمیر شہریت کی تخلیق میں مدرسے کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔

مدرسہ بچوں میں ایسے جمہوری خواص پیدا کر سکتا ہے کہ جمہوری زندگی ان کی زندگی کا جزو بن جائے انہیں یہ احساس ہو کہ ہمارے ایک ووٹ میں قوم کی تعمیر و تخریب کے بے شمار پہلو مضمر ہیں، ایک اچھے شخص کو ووٹ دے کر ہم قوم کی خدمت بھی کر سکتے ہیں اور ایک غیر ذمہ دار شخص کو اپنا نمائندہ بنا کر ہم قوم کو تباہ بھی کر سکتے ہیں، کیوں کہ

نہ سگ دامنِ کاروانے درید	کہ دہقانِ نادان کہ سگ پرورید

اس کے لیے ضروری ہے کہ مدرسوں میں ایسی جمہوری فضا پیدا کر دی جائے کہ بچے غیر شعوری طور پر جمہوریت میں رس بس جائیں، انہیں خود اپنی ذات کا احترام کرنا آجائے اور وہ دوسروں کے احساسات و نظریات کا احترام کرنا بھی جانتے ہوں، ان کے ایک ساتھی کو دکھ پہنچے تو اس کی کسک ان کے دل میں بھی موجود ہو، ان کی باہمی محبت مصنوعی اور تجارتی نہ ہو بلکہ اس میں اخلاص کی شدت ہو، یہی اجتماعی زندگی ان میں جمہوری مزاج اور جمہوری شعور پیدا کر سکتی ہے، درسی کمروں میں، کھیل کے میدانوں میں، انجمنوں اور کلبوں کے جلسوں میں، جماعتی اور نجی اجتماعات میں اگر ہر مدرس اسے اپنا مقدس فرض سمجھ کر بچوں کو زندہ دل اور حریت آشنا بنانے کی کوشش کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے مدرسے ایک قلیل مدت ہی میں ایک بلند و قار نظام شہریت کے پیش رو بن جائیں، یہ ہمارا فرض ہے اور اسی پر ہماری قومی یک جہتی کا مدار ہے، اس لیے اس سے آنکھیں بند کر کے عہد حاضر کے تندخو اور مفاد پرست گمر چابک دست سیاست دان سے قطع نظر قوم کی شیرازہ بندی میں ہمیں بیش از بیش حصہ لینا ہے۔ کچھ دنوں بعد سیاست کے یہ بادل چھٹ جائیں گے، مفاد پرستی کی یہ گھر آلود فضا دور ہو جائے گی۔ اور اقربا نوازی کے یہ دل دوز واقعات ماضی کی ایک کہانی بن جائیں گے، اس وقت ایک نئی دنیا دت ایک نیا مسلک اور نیا آئین ہوگا۔ اگر آج کا مدرسہ ان توقعات کو پورا کرنے میں ناکام رہا تو آنے والی نسلیں اسے کبھی معاف نہ کر سکیں گی کیوں کہ

از خلش کرشمۂ کار نمی شود تمام — عقل و دل و نگاہ را جلوہ جدا جدا طلب

عشق بسر کشیدن است شیشۂ کائنات را — جام جہاں نما مجو، دست جہاں کشا طلب

چوں بہ کمال می رسد فقر دلیل خسروی است — مسند کیقباد را در تہ بوریا طلب

پیش نگر کہ زندگی راہ بعالمے برد — از سر آنچہ بود و رفت درگزر، انتہا طلب

قومی اتحاد

دوسرا اہم کام قومی اتحاد اور اشتراک عمل ہے۔ جسے ہماری قومی زندگی میں سنگ میل کا درجہ حاصل ہے، کوئی قوم دنیا میں اتحاد و یگانگت، اور اشتراک و تعاون کے بغیر دنیا کی نگاہوں میں باوقار نہیں بن سکتی، اس سلسلے میں ہمارا کام قدرے مشکل ہے، تقسیم ملک کے بعد ہماری قوم کو جن حادثات اور جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے اس کی مثال تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملتی خدا کا شکر ہے کہ اب وہ حالات تو باقی نہیں رہے، لیکن اب بھی کبھی کبھی "درماندہ رہرو کی صدائے دردناک" سنائی دے جاتی ہے جو ایک حساس آدمی کے لیے آج بھی کتنی مہیب کتنی بھیانک اور کتنی الم ناک ہوتی ہے، اس کا اندازہ کچھ وہی لگا سکتے ہیں جو اس درد کی کسک سے خود لذت آشنا ہیں۔

اس ملک کی تخلیق میں دینی اور ثقافتی سرمائے کے تحفظ کا جو شدید جذبہ کارفرما رہا اسی نے انگریزوں اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے اس جائز مطالبے کو منظور کرنے پر مجبور کر دیا اور یہ ملک وجود میں آگیا، آج اس میں جو لوگ آباد ہیں وہ رنگ و نسل اور زبان و معاشرت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ان کے مابین جو چیز مشترک ہے وہ مذہب ہے، اس جذبۂ اشتراک نے آج سے کوئی پندرہ سولہ برس پہلے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کر دیا تھا قیام پاکستان کے بعد اس اتحاد و اتفاق کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں اور مسلمان ایک بار پھر پنجابی، سندھی، سرحدی، اور بنگالی کے متنازع گروہوں میں تقسیم ہو گیا۔ ان گروہی تفرقوں سے اس وقت ملک میں جو زہرناک فضا پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے قوم کی ہیئت اجتماعی کو شدید نقصان پہنچایا ہے، چناں چہ نام نہاد لیڈر اپنے نام و نمود اور اپنے اقتدار کے لیے پنجابی، بنگالی اور

سرحدی کا جھنڈا بلند کرتے رہتے ہیں، اور اگرچہ دشمن کی تلواروں کی جھنکار اور توپوں کی باڑھ کی آواز ہمارے کانوں تک پہونچ رہی ہے، مگر اس کے باوجود ہمارے یہ گروہی جھگڑے ختم نہیں ہو رہے خدا کا شکر ہے کہ ان تباہ کن حالات میں حکومت کے بعض حساس اہل الرائے نے مغربی پاکستان کو ایک واحدے میں مدغم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، اس سے رفتہ رفتہ اس حصۂ ملک میں وہ کھنچاؤ ختم ہو جائے گا جس سے قومی اتحاد کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔

ہماری قومیت کا انحصار ملک و نسب پر نہیں قرآن پر ہے جو محض چند تقریباتی دعاؤں کا مجموعہ نہیں۔ زندگی کا نصب العین اور لائحہ عمل ہے، اس میں قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل بھی ہیں اور اخلاق و پندار کی باتیں بھی، اگر اپنے ایمان کے اس رکن اعظم کو ہم حرز جان بنانے میں کامیاب ہو جائیں تو ہماری سیکڑوں معاشرتی بیماریاں آپ سے آپ دور ہو جائیں، ہم ایک دوسرے سے استہزاء، مکر و فریب اور طعن و تشنیع کرنے سے خود ہی گریز کرنے لگیں گے، آج اخوت، مساوات اور بھائی چارہ کے دل خوش کن الفاظ ہمارے دلوں میں ایک جوش پیدا کر دیتے ہیں، لیکن کیا ہم نے کبھی یہ سوچا کہ مغرب کی یہ خوش آئند صدا ہمارے ہی قافلۂ رفتہ کی آواز بازگشت ہے۔ اخوت و مساوات کا سبق یورپ کے جمہوری اداروں نے پاپائے روم کی تعلیمات سے نہیں، دین محمدی کے پیرووں سے سیکھا، طوفانوں سے لڑنے اور دنیا میں اپنی عظمت کا پھریرا لہرانے کا عزم انہوں نے مسلمانوں سے حاصل کیا، کشورکشائی اور جہاں آرائی کا فن انہی کے ناخن گرہ کشا کا رہین منت ہے، ان حالات میں یہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ہم مغرب کے اس منظر یہ کو صحیفۂ آسمانی سمجھ کر اپنانے کے لیے دوڑیں، یہ تو دراصل فروعات کا غازہ ہے جسے ہم اپنے چہروں پر مل کر اپنی فطری خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں پیغمبر برحق نے اس دنیا میں ایک ہیئت اجتماعیہ عربیہ کی بنیاد نہیں ڈالی بلکہ آپؐ نے ایک ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کی بنیاد ڈالی جس میں جغرافیائی وحدت، رنگ و نسل اور زبان کا امتیاز نہ تھا۔ آپؐ اگر چاہتے تو ہیئت اجتماعیہ عربیہ کی طرح ڈال کر ابوجہل سے صلح کر لیتے، ایک قوم پرست کی راہ تو ہوتی مگر پیغمبر خدا اور ہادی برحق کی راہ نہ ہوتی اس لیے آپ اپنے موقف سے نہ ہٹے اور ابوجہل ماتم ہی کرتا رہا۔

سینۂ ما از محمد داغ داغ — از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ
مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب — از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

امیرانِ قریش اس بدعت کو برداشت نہ کر سکے اس لیے وہ حضور سے برسرِ پیکار رہے لیکن بالآخر حق کو کامیابی اور باطل کو شکست ہوئی۔ اس سے پہلے مغربی مفکرین کی تصنیفات حریت و مساوات کے اس نظریے سے یکسر خالی تھیں، جمہوریت اور مساوات کا اس سے بڑا اور اتنا ہمہ گیر تجربہ دنیا میں سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں عرب کے صحرا نشینوں نے کیا۔ ایتھنز کی جمہوری ریاست میں شہری اور غلام کی طبقاتی تقسیم موجود تھی، روما کے اربابِ فکر بھی گروہی امتیازات کو قائم رکھ کر حریت اور مساوات کا یہ عالم گیر نظریہ پیش نہ کر سکے، اس طرح دنیا میں اسلام ہی پہلا نظامِ حیات ہے جس میں انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے ایک وقیع مقام دیا گیا، لیکن آج ہم اپنی تعلیمات کو فراموش کر کے خود تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں کرتے نظر آتے ہیں، اگرچہ یہ ساری چیزیں تو ہماری خود اپنی ہیں دوسروں کی دریوزہ گری سے کیا حاصل۔

ان حالات کے پیشِ نظر قومی اتحاد کی تعمیر و تشکیل میں مدرسہ ایک اہم پارٹ ادا کر سکتا ہے اس ماحول میں بچے یک جہتی، تعاون اور اشتراکِ عمل کے زندہ اور عملی نمونے دیکھ سکتے ہیں اور جب انہیں مدرسہ میں ایک جماعت کی حیثیت سے کام کرنا سکھایا جائے گا تو ان میں یہ خواص آپ سے آپ پیدا ہو جائیں گے، مدرس نصاب کی چند روکھی پھیکی باتوں کو پڑھانے کے علاوہ ان کی شیرازہ بندی بھی کر سکتا ہے، ان میں متحد و مجتمع رہنے کا جذبہ بھی پیدا کر سکتا ہے، آج اگر ہر مدرس اتحاد و اتفاق کا پیامبر بن کر آنے والی نسلوں کو ایک بنانے کا مقدس فرض ادا کرنے کی ہمت کر لیں تو بے گانگی میں یگانگت اور اخلاق میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے، لیکن اگر مدرس کی کوتاہ بینی اسے اس کے محدود تخیل سے ماورا نہیں لے جاتی تو سماج کے بچوں کو اس کی ذات سے فائدہ پہنچنے کی بجائے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوگا، اس وقت میرے سامنے

دونوں قسم کے اساتذہ کی کوششیں اور ان کے نتائج ہیں، ایک گروہ ایسے اساتذہ کا ہے جو ملت کی تعمیر نو میں اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو بطریق احسن انجام دینے کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور اگرچہ بچوں کا گھریلو ماحول اور عمومی معاشری زندگی اس سے بالکل مختلف ہے، لیکن کم سے کم دو چار تو ایسے بچے نکل ہی آتے ہیں جو ان عالم گیر نظریات سے متمتع ہو سکتے ہیں، اس کے برعکس میرے سامنے ایک ایسے مدرس کی بھی مثال ہے جو علم و فن میں بزعم خود افلاطون و ارسطو کا ہم پلہ ہے، اور تدریسی تکنیک میں بھی ڈیوی، کینڈل اور سیدین کا مثیل، اس پر طرہ یہ کہ اساتذہ کے تربیتی کالج میں وہ اپنے زمانے میں اول بھی آئے، یونی ورسٹی نے امتیازی تمغا بھی عنایت کیا۔ شاید ہمہ دانی کا یہ جذبہ اس اعزاز کی بدولت پیدا ہو گیا ہو، بہر صورت جو بچے دو تین سال تک ان کی زیر تربیت رہے ان میں سے ایک ایک کی شخصیت بالکل مجروح ہو چکی ہے، ان میں زندگی کی حرارت ہے نہ عزم و حوصلے کی سرگرمی۔ وہ بجھے بجھے اور خاموش خاموش منازل حیات طے کرتے جاتے ہیں جیسے انہیں زندہ رہنے کی آرزو ہی نہ ہو، میں نے خود انھیں ایک مرتبہ ایک جماعت کے بچے کو بھری جماعت میں زجر و توبیخ اور زد و کوب کرتے دیکھا، اس وقت ان کی زبان گوہر بار سے جو کلمات نکل رہے تھے، اس سے قومی یک جہتی تو کیا، استاد اور شاگرد کی یک جہتی بھی قائم نہیں رہتی، بالآخر بچے کا یہی جذبہ فروتنی اور استاد کی یہی سرزنش ایک جماعتی نفرت کا پیش خیمہ بن گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان بچوں میں ایسی خرابیاں پیدا ہو گئیں جو آگے چل کر ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوں گی، کمزوریاں ہر شخص میں ہوتی ہیں اور ایک انسان کی حیثیت سے مدرس بھی اس سے مبرا نہیں لیکن اس کی نگاہ بلند اور اس کا عمل پاکیزہ ہونا چاہیے ۔

استادوں کی اجرت کا مسئلہ

اویس احمد

استادوں کی تنخواہوں کا مسئلہ ایک عالمگیر مسئلہ ہے، ڈاکٹر وکیل، انتظامی افسر، فوجی جرنیل صنعت کار، تاجر، غرض دولت اور حکومت کے بڑے سے بڑے مالک بھی استاد ہی کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے دولت اور حکومت کے مقام کو پہنچتے ہیں، لیکن ان لوگوں کے مقابلہ میں استاد کو اپنا مادی معاوضہ ہیچ نظر آنے لگتا ہے اور وہ اکثر اوقات یہ سوچنے لگتا ہے کہ میں اپنی جنت کی حسن نظری بلندی میں یقین کیے بیٹھا ہوں کہیں وہ خود فریبی تو نہیں کہیں یا رلوگوں نے "معمار قوم" جیسے دل خوش کن القابات محض اس لیے تو نہیں گھڑ رکھے کہ مجھے خالی خولی الفاظ ہی سے ٹرخا دیا جائے اور قومی دولت کے انعامات تو ہضم کر لیے جائیں۔

ہر ملک کے اساتذہ یہ خیال کرتے ہیں کہ مادی معاوضہ کے معاملہ میں غالباً وہ اپنے غیر ملکی بھائی بندوں سے پیچھے ہیں، حالاں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ملک بھی ایسا نہیں جہاں وکیل، ڈاکٹر، انجینئر اور دوسرے عملی پیشوں کے لوگ استادوں کی نسبت کئی گنا زیادہ کماتے ہیں، حال ہی میں ایک سن رسیدہ امریکی پروفیسر پاکستانی استادوں کی ایک جماعت سے خطاب کر رہے تھے، وقفہ سوالات میں موضوع سخن قدرتی طور پر امریکی استادوں کی تنخواہوں کی طرف پھر گیا، فاضل مقرر نے کہا کہ اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے ایک ذاتی تجربہ بیان کروں گا، میرا ایک بیٹا ہے، دوسری عالمی جنگ کے زمانہ میں وہ کالج میں پڑھتا تھا، ڈگری کا نصاب پورا کیے بغیر وہ بحری فوج میں بھرتی ہو گیا اور بحر الکاہل کے محاذ جنگ پر بھیج دیا گیا، کوئی دو سال بعد وہ واپس گھر آ گیا اور اپنا ڈگری کا نصاب پورا کر لیا، اب آئندہ پیشے کا سوال درپیش تھا، میں نے کہا بیٹا معلمی ایک اچھا پیشہ ہے اسے اختیار کر لو، وہ بولا

بے شک معلمی بہت اچھا پیشہ ہے میں اس کی تعلیم کرتا ہوں مگر آپ جانتے ہیں آج کل ٹیکسوں کا بوجھ کتنا بھاری ہے، کہنے میں کم از کم ایک آدمی تو ایسا ہونا چاہیے جو اس بوجھ کو آسانی سے اٹھا سکے میں ایک تجارتی کارندہ بننا چاہتا ہوں، چنانچہ اس نے ایک مختصر سا کاروباری نصاب پورا کیا اور ایک موٹر کمپنی میں فالتو پرزے بیچنے پر مامور ہو گیا، بظاہر یہ کام چنداں دل چسپ نہیں ہر وقت آہنی پرزوں سے سابقہ رہتا ہے، مگر چھ سات سال کی نوکری کے بعد میرا بیٹا اب اتنی تنخواہ پا رہا ہے جو مجھے پچیس تیس سال کی نوکری کے بعد بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔

یہ واقعہ ایک ایسے ملک کے استاد نے بیان کیا جو دنیا بھر میں اپنی دولت اور تعلیمی ترقی کے لیے بے مثال ہے، حقیقت یہ ہے کہ امریکہ میں بھی استاد کو آغاز ملازمت میں ایک عام مزدور سے زیادہ اجرت نہیں ملتی اور اپنے پیشے میں اچھا مقام پیدا کر لینے کے بعد بھی اس کی آمدنی دوسرے متوازی پیشوں کی نسبت بہت کم رہتی ہے، پس جہاں تک اجرت کا تعلق ہے معلمی کا پیشہ اپنے اندر کچھ زیادہ کشش نہیں رکھتا، یہ صرف انہی لوگوں کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے جو تدریس کے ساتھ غیر معمولی لگاؤ رکھتے ہوں یا ایسے لوگوں کو جو کم ہمت اور عافیت کوش ہونے کے باعث دوسرے پیشوں کی پر ہنگامہ زندگی کا مقابلہ نہ کر سکتے ہوں، پہلی قسم کے استاد ایسے لوگ ہیں جنہیں پڑھانے میں لذت محسوس ہوتی ہے وہ اس لذت کی خاطر تھوڑی تنخواہ کی بھی پرواہ نہیں کرتے اور اپنے کام کو دلی سکون کے ساتھ کیے جاتے ہیں، لیکن ایسے استادوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ تمام ضرورتوں کے عشر عشیر کو بھی پورا نہیں کر سکتی، لامحالہ تعلیم ان تمام لوگوں کی خدمات قبول کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے جو باقی سمتوں سے مایوس ہو کر یا ان کے کٹھن مطالبوں کی تاب اپنے میں نہ پا کر پیشہ معلمی کی پناہ ڈھونڈتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو معلمی کی معمولی اجرت سے جلد اکتا کر اس پیشہ کو کوسنا شروع کر دیتے ہیں اور عمر بھر اسے کوستے رہتے ہیں، یہاں تک تو شاید کچھ زیادہ مضائقہ نہ ہو، بشرطیکہ یہ لوگ اپنے کام کو پوری ہمت اور دیانت کے ساتھ کرتے جائیں، مگر مصیبت یہ ہے کہ ایسے استادوں کی بڑی اکثریت تدریسی فرائض کے متعلق بھی

بددل ہو جاتی ہے، یہ بددلی نئی پود کو ضروری تربیت سے محروم رکھ کر قومی دولت کے خسارے کا موجب
ہوتی ہے اور اساتذہ کی مالی زبوں حالی کا منحوس چکر ختم ہونے میں نہیں آتا۔

ایک معمہ

بعض اساتذہ کو یہ بات بالکل ایک معمہ نظر آئے گی کہ وہ قومی دولت کی کمی بیشی کے
ذمہ دار کس طرح گردانے جا سکتے ہیں، اگر ان کی تنخواہ کم ہے تو اس کی ذمہ داری
خود ان پر کس طرح عائد ہوتی ہے؟ اس کی صریح ذمہ داری حکومت پر ہے جو استادوں کی
تنخواہوں پر زیادہ روپیہ صرف نہیں کرتی اور جب استادوں کی طرف سے تنخواہیں بڑھانے کا
مطالبہ کیا جاتا ہے تو زبانی ہمدردی کے باوجود اس مطالبہ کو اس بنا پر ٹال دیتی ہے کہ میزانیہ
میں گنجائش نہیں، اگر حکومت کا یہ عذر درست بھی مان لیا جائے تو بھی اسے بری الذمہ
قرار نہیں دیا جا سکتا، کیوں کہ میزانیہ میں گنجائش پیدا کرنا حکومت ہی کا کام ہے، استادوں یا
کسی اور شخص کا کام نہیں۔

اس استدلال میں جو بنیادی غلطی ہے وہ معاشیات کے کسی طالب علم پر پوشیدہ
نہیں رہ سکتی، ہر قوم کو قدرت نے کچھ وسائل عطا کر رکھے ہیں، یہ وسائل قدرتی دولت کے خزانے
اور قومی آبادی کے بدنی اور ذہنی قویٰ پر مشتمل ہوتے ہیں، یہ انسانی قویٰ سال بھر کے عرصہ میں
قدرتی وسائل کی مدد سے قومی دولت کی ایک مقدار پیدا کرتے ہیں جو قوم کے مختلف افراد میں
بٹ جاتی ہے بعض افراد کو اس میں سے وافر حصہ ملتا ہے اور بعض کو کم، اگر کم حصہ پانے والے
افراد کو زیادہ دینا مقصود ہو تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، اول یہ کہ زیادہ حصہ پانے والے
افراد سے اس قدر چھین لیا جائے کہ کم نصیب لوگوں کے حصوں میں خاصہ اضافہ ہو سکے، دوسری
صورت یہ ہے کہ قومی دولت کی پیداوار اتنی بڑھ جائے کہ کم نصیبوں کو خود بخود زیادہ ملنے لگے
پہلا طریق کار پر تشدد انقلاب کا راستہ ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی مثال نہیں (اسلام کا عہد زریں
ایک استثنے ہے) جب قومی دولت کے ڈھیروں کو سمیٹنے والوں نے بخوشی یہ ڈھیر اپنے نادار
بھائیوں میں بانٹ دیے ہوں، چوں کہ پر تشدد انقلاب خون و آتش کا راستہ ہے جس کے تعا

کم سے کم استادوں کی اجرت میں اضافہ ہو جانی چاہیے، اس لیے ان کے سامنے صرف ایک راستہ کھلا رہ جاتا ہے اور وہ ہے قومی دولت کی مجموعی پیدائش میں اس حد تک اضافہ کی کوشش کہ استادوں کو خواہ مخواہ اس میں سے زیادہ حصہ ملنے لگے۔

بعض استادوں کو اس تجویز پر اچنبھا ہوگا۔ بھلا بیچارے استاد قومی دولت کے بڑھانے میں کیا حصہ لے سکتے ہیں؟ ایسا خیال کرنا دراصل اپنے کام کی صحیح نوعیت سے لاعلمی ہی کی پیداوار ہو سکتا ہے۔ آج امریکہ کی دولت کا چرچا ساری دنیا میں ہے، اس امیر ملک کی مالی مدد اور خیرات کے لیے دنیا کے چھوٹے بڑے ملک دامن پھیلا رہے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ کیوں کہ اس ملک کو اللہ نے بے پناہ قدرتی وسائل دے رکھے ہیں۔ درست۔ مگر قدرتی دولت کے یہ خزانے تو اس وقت بھی موجود تھے جب سفید قوموں نے ابھی نئی دنیا میں قدم نہ رکھا تھا اور امریکہ میں سُرخ ہندی ہی ان خزانوں کے پاسبان تھے۔ ان پاسبانوں کی زندگی کیسی تھی؟ تاریخ جانتی ہے کہ بے پناہ قدرتی دولت کے ان بدبخت پاسبانوں کو نیم برہنگی کے بھونڈے لباس اور بے کیف موٹی جھوٹی غذا کے سوا کبھی کچھ نصیب نہ ہو سکا، دفعتہً یورپ سے ایک اور قوم آئی جس کے بازوؤں میں سرخ ہندیوں سے زیادہ قوت نہ تھی، مگر جس کا ذہن علم و حکمت کی روشنی سے منور تھا، اس نو وارد قوم نے غافل سرخ ہندیوں کو پیچھے ہٹا کر قدرتی دولت کے خزانوں کی پاسبانی سنبھالی اور دیکھتے دیکھتے ملک میں دولت کی وہ ریل پیل ہوئی کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں۔

آج ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ایک استاد کی اوسط تنخواہ ایک عام مزدور کی اوسط اجرت سے بہت زیادہ نہیں، لیکن مزدور کی اوسط اجرت بھی اتنی معقول ہے کہ زندگی کی ساری ضروریات آسودگی کے ساتھ پوری ہو جاتی ہیں، اس کے مقابلے میں ایک پاکستانی استاد کی اوسط اجرت ایک عام مزدور کے مقابلے میں بُری نہیں، لیکن پاکستانی مزدور فاقوں مر رہا ہے، اس لیے پاکستانی استاد بھی نیم فاقہ کشی پر مجبور رہے۔ میزانیہ میں زیادہ گنجائش پیدا کرنے کے لیے نئے ٹیکس لگانے پڑیں گے فاقہ کش مزدور اور دہقان میں کسی نئے مالی بوجھ کے اٹھانے کی سکت نہیں، اس لیے میزانیہ میں

اس وقت تک مزید گنجائش نکالنا مشکل ہے جب تک مزدوروں اور دہقانوں کی آمدنیوں میں معقول اضافہ نہیں ہو جاتا۔

مزدوروں اور کسانوں کی مالی حالت بہتر بنانے میں استاد کیا کر سکتے ہیں، یہ وہ سوال ہے، جو بعض استادوں کی طرف سے پوچھا جائے گا، استاد یہ کر سکتے ہیں کہ جو بچے تعلیم و تربیت کے لیے ان کے سپرد کیے جائیں انھیں جاں سوزی اور شفقت کے ساتھ اس طرح پڑھائیں اور ان میں محنت، استقلال اور جستجو کے ایسے اوصاف پیدا کریں کہ وہ آگے چل کر بہتر مزدور، بہتر کسان، بہتر بڑھئی، بہتر کاریگر اور بہتر انسان بنیں، ایسے کردار کے لوگ یقیناً پہلے سے زیادہ فصلیں اور زیادہ اشیائے ضرورت پیدا کریں گے، قومی دولت کے اس طرح بڑھ جانے سے استادوں کا حصہ بھی بڑھ جائے گا۔

مسئلے کے اس حل کو سن کر بعض استاد یقیناً یہ کہیں گے کہ واہ، تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود، جب تک یہ علاج بار آور ہوگا اس وقت تک ہم میں سے اکثر قبروں میں سو رہے ہوں گے، اس وعدہ فردا کی امید پر کون جیئے؟ اس میں کلام نہیں کہ مسئلہ کا یہ حل وعدہ فردا کے سوا کچھ نہیں، لیکن یہ وہ وعدہ ہے جس کے درست ہونے میں رتی بھر کلام نہیں موجودہ استادوں کو اپنی محنت اور انتظار کا پھل کھانا نصیب ہو یا نہ ہو لیکن ان سے بعد میں آنے والے ان کے بوئے ہوئے بیج سے ثمر حاصل کریں گے اور ان سابقون الاولون کا نام عزت اور نیکی کے ساتھ لیں گے جنھوں نے اسی راہ میں پہلا قدم اٹھایا، تاریخ نے اپنے بے نفس جاں بازوں کے لیے یہی انعام مقرر کر رکھا ہے اور حق یہ ہے کہ یہ بہت بڑا انعام ہے۔

اس ضمن میں ایک اور نکتہ بھی توجہ طلب ہے، قومی دولت میں مجموعی طور پر اضافہ ہو جانے پر بھی یہ ضروری نہیں کہ استادوں کو بیٹھے بٹھائے اپنا جائز حق مل جائے زندگی ایک مسلسل دوڑ ہے جس میں ہر شخص دوسروں سے آگے بڑھ جانے کی دھن میں لگا ہے قومی دولت میں سے جائز حصہ وصول کرنے کے لیے استادوں کو منظم کوشش کرنی چاہیے، ٹیک نیتا

استاد یقینی طور پر مایوس ہوتے ہیں، جب وہ دیکھتے ہیں کہ صلہ محنت اور دیانت کا نہیں بلکہ خوشامد اور ذاتی ممنونیت کا مل رہا ہے، یہ معاشرتی بیماریاں قومی دولت کے درخت کو گھن کی طرح چاٹ جاتی ہیں، استاد انفرادی طور پر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، ہاں ان کی قومی تنظیم ان روح کش بیماریوں کو بڑی حد تک جڑ سے اکھاڑ سکتی ہے، دوسرے ملکوں کے استادوں نے موثر تنظیموں ہی کی بدولت خوشامد۔ رشوت، اقربا پروری اور اس طرح کے دوسرے قومی امراض کا کامیاب علاج کیا ہے اور ان کی جگہ محنت، پیشہ ورانہ دیانت اور تدریسی قابلیت کو انعام و صلہ کا پیمانہ مقرر کیا ہے، استادوں کی موثر قومی تنظیم آج ہماری سنہ لیولسی تعلیمی ضرورت ہے، ایک ایسی تنظیم جو ملک بھر کے چھوٹے بڑے تمام استادوں کو مشترکہ مقاصد کے لیے یکجا کر دے قومی دولت اور استاد کی اجرت بڑھانے کے لیے یہ ایک کامیاب اور آزمائی ہوئی راہ ہے ؛

ببیں تفاوت رہ

فضل الرحمان ناصر صدیقی

برطانوی پارلیمنٹ کے ایک رکن یہ مسودہ قانون پیش کرنے والے ہیں کہ ملک بھر میں سات سال سے کم عمر بچوں کو بدنی سزا دینا قانونی جرم قرار دے دیا جائے، تحریک پیش کرنے والے رکن پارلیمنٹ نے بہت سے دوسرے اراکین کو ہم خیال بنالیا ہے، اگر یہ قانون منظور ہوگیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ برطانیہ میں نہ صرف استاد بلکہ والدین بھی سات سال سے کم عمر کے بچوں کو بدنی سزا نہیں دے سکیں گے۔ تاہم اس قانون کے نافذ کرنے میں بہت سی دقتوں کا سامنا ہوگا۔ مدرسوں کی مار پیٹ پر نگاہ رکھنا نسبتاً سہل ہے۔ مگر ہر گھر کے بچوں کی کیفیت سے خبردار رہنا ایک بے حد مشکل کام ہے۔ پولیس کو دور رس اختیارات دینے پڑیں گے اور عدالتوں کو عجیب و غریب شکایتوں کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔ برطانوی عوام شخصی آزادی کی جن روایات کے عادی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ مشکل نظر آتا ہے کہ یہ مسودہ منظور ہو کر ملکی قانون کی شکل اختیار کر سکے۔ والدین کی سزا کے تعین میں عدالت کو طرح طرح کی الجھنوں کا سامنا ہوگا اور اگر حمایت اطفال کی بعض پرجوش جماعتوں نے والدین کو نشانہ بنانا شروع کردیا تو بعض بے گناہ والدین بھی شاید یوں ہی دھر لیے جائیں، ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ قیاس غلط نہیں کہ متذکرہ صدر مسودہ قانون منظور نہیں ہوگا۔

بچوں کی جنت

مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں نے بچوں کی تعلیم اور ان کی بے روک ٹوک جسمانی، ذہنی اور اخلاقی نشو ونما کے لیے جو سہولتیں بہم پہنچا رکھی ہیں ان کے پیش نظر ان ملکوں کو بچوں کی جنت کا نام دینا ہرگز کوئی مبالغہ نہیں۔ ان ملکوں نے اس حقیقت کو پوری طرح تسلیم کرلیا ہے کہ ہر متمدن آبادی کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ نئی پود کو پسندیدہ جسمانی۔ ذہنی اور اخلاقی اوصاف کا حامل بنائے، اس کا یہ فرض اتنا ہی اہم ہے

جتنا اپنے نان نفقہ کا بندوبست کرنا، مقامی آبادی کی اس ذمہ داری کا کچھ اندازہ اس فیصلہ سے ہو سکتا ہے جو حال ہی میں برطانیہ کی ایک اعلیٰ عدالت نے ایک کاؤنٹی کونسل کے خلاف دیا ہے، واقعات یہ ہیں کہ ایک نرسری اسکول کا ایک بچہ مدرسہ سے بھٹک کر سڑک پر آ نکلا، سامنے سے ایک ٹرک پوری رفتار پر چلا آ رہا تھا، ڈرائیور نے بچے کو بچانے کی کوشش میں ٹرک کو یک دم موڑنا چاہا۔ ٹرک سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے سے ٹکرا گیا اور ڈرائیور اسی حادثہ میں جاں بحق ہو گیا اس کی بیوہ نے عدالتی چارہ جوئی کی اور عدالت نے اس کے شوہر کی موت کے لیے اس کاؤنٹی کونسل کو ذمہ دار ٹھہرایا جو نرسری اسکول کو چلا رہی ہے۔ چنانچہ کاؤنٹی کونسل کو مالی ہرجانہ ادا کرنا پڑا۔

مغربی ملکوں میں بچوں کو متوازن غذا بہم پہونچانے کے لیے جو اہتمام ہوئے ہیں وہ بذاتِ خود ایک داستان ہیں، قوانین صحت سے بے خبری اور مالی بدحالی بہت سے والدین کو اس قابل نہیں چھوڑتی کہ اپنے بچوں کو مناسب قسم کی غذا مہیا کریں۔ اس کا نتیجہ بچوں کی بدنی اور ذہنی کمزوری کی صورت میں نکلتا ہے، مدرسوں اور مقامی آبادیوں کے لیے ابھی یہ تو ممکن نہیں ہو سکا کہ بچوں کی تمام غذائی ضرورتوں کو پورا کریں، لیکن ان کے دوپہر کے کھانے کا بندوبست ہر جگہ ہو چکا ہے، دوپہر کے کھانے کا وقت اوقات مدرسہ میں آتا ہے اس لیے برطانیہ جیسے "قلت خوراک" والے ملک میں بھی یہ انتظام کیا گیا ہے کہ بچوں کو دوپہر کا کھانا مدرسے میں ملے، یہ تازہ اور متوازن غذا جس کے ساتھ دودھ کی ایک خاصی مقدار بھی دی جاتی ہے اس بات کی ضمانت بہم پہونچاتی ہے کہ ہر بچے کو دن میں ایک بار ضرور ایسا کھانا ملے گا جس میں اس کی مخصوص بدنی ضرورتوں کا پورا لحاظ رکھا گیا ہو، یہ کھانا بہت سستی قیمت پر مہیا کیا جاتا ہے کیونکہ حکومت اور مقامی آبادیاں اس کے اخراجات ایک حصہ خود برداشت کرتی ہیں، اس پروگرام سے نہ صرف بچوں کی عام صحت میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ بلکہ قوم کی غذائی عادات کے وسیع پیمانہ پر درست ہو جانے سے قومی صحت و تندرستی اور درازیِ عمر میں واضح طور پر اضافہ ہوا ہے۔

اضلاع متحدہ امریکہ میں مقامی آبادیوں کی تنظیم: ذمہ داری کے اصول کو اس حد تک ما

جا چکا ہے کہ بچہ جن مخصوص ذہنی رجحانات کا اظہار کرے ان کی نشو و نما اور تربیت کی سہولتیں پیدا کرنا والدین کی بجائے مقامی آبادی کا کام ہے۔ ہر ریاست متعدد تعلیمی اضلاع میں بٹی ہوئی ہے۔ ان اضلاع کی حدیں سیاسی تقسیم کی حدوں سے بالکل الگ ہیں، تاکہ سیاسی دھڑے بندیاں تعلیم پر اثر انداز نہ ہونے پائیں۔ ہر تعلیمی ضلع آزادانہ انتخاب کے ذریعہ تعلیمی بورڈ کے اراکین کا چناؤ کرتا ہے۔ تعلیمی بورڈ ضلع کی تعلیمی ضرورتوں کا جائزہ لے کر ضروری اخراجات کا تخمینہ رائے دہندوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ تخمینہ کے منظور ہو جانے کے بعد بورڈ کو حق حاصل ہو جاتا ہے کہ مقامی آبادی پر ٹیکس لگا کر یہ رقم پیدا کرلے۔
اس طرح تعلیمی اخراجات کا بوجھ صرف والدین پر نہیں بلکہ ساری مقامی آبادی پر ایک سا پڑتا ہے، یہ بوجھ ایک بے اولاد شخص پر بھی اسی طرح پڑتا ہے جس طرح ایک کثیر العیال آدمی پر۔ بعض تعلیمی اضلاع ایسے بھی ہیں جو پوری کوشش کے باوجود ہر طرح کی تعلیمی سہولتیں خود مہیا نہیں کر سکتے، مثلاً بعض تعلیمی اضلاع گھڑی سازی یا کسی دوسری قسم کی ٹیکنیکل تعلیم کا بندوبست خود نہیں کر سکتے، ایسی صورت میں ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ٹیکنیکل تعلیم کی خواہش رکھنے والے طلبا کو کسی ایسے قریب ترین تعلیمی ضلع میں بھیجیں، جہاں مطلوبہ قسم کا ادارہ موجود ہو۔ یہ ٹیکنیکل ادارہ غیر اضلاع کے طلبا سے یقیناً فیس وصول کرے گا کیوں کہ اس نے خود اپنی مقامی آبادی کے روپے سے اپنے بچوں کے لیے یہ ادارہ قائم کر رکھا ہے، ایسی صورت میں فیس طلبا کے والدین نہیں بلکہ ان کا تعلیمی بورڈ ادا کرتا ہے فیس کے علاوہ بورڈ کو روزانہ آنے جانے کے اخراجات اور اگر ہر روز آنا جانا ممکن نہ ہو تو بورڈنگ ہاؤس کے اخراجات بھی ادا کرنے پڑتے ہیں۔
یہ تمام باتیں اس بنیادی مفروضہ کی پیداوار ہیں کہ بچوں کی تعلیم و تربیت ماں باپ کی نجی ذمہ داری نہیں بلکہ اس ذمہ داری میں ساری مقامی آبادی شامل ہے، معاشرے کو اپنی اس ذمہ داری کا اس حد تک احساس ہے کہ نہ صرف وہ بخوشی ہر مالی بوجھ کو قبول کرتا ہے بلکہ بچوں کی زندگی کو زیادہ سے زیادہ پرمسرت بنانے کے لیے ہمیشہ تدبیریں سوچتا رہتا ہے۔ یہ ساری جدوجہد اس احساس کا نتیجہ ہے کہ بچے قوم کی سب سے قیمتی دولت ہیں اور اسی دولت کی صحت مند نشوونما پر قوم کے سارے

مستقبل کا مدار ہے۔

کچھ اپنے متعلق

مغربی ملکوں کے ساتھ موازنہ کرنے سے ہمیں اپنی حالت پر افسوس کرنا چاہیے یہاں یہ احساس غالباً نہ مقامی آبادی کو ہے اور نہ استادوں کو کہ بچے قوم کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ دنیا جہاں کی گلی سڑی چیزیں ہر روز بچوں کے پیٹ میں جھونکی جاتی ہیں۔ مگر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ مکھیوں۔ مچھروں اور دوسری غلاظتوں کا سب سے شدید حملہ ان بے خبر ننھی روحوں پر ہوتا ہے لیکن کسی کو پرواہ نہیں، سورج نکلنے سے لے کر اس کے غروب ہونے تک آلو۔ چھولے ۔ کلیجے۔ کباب۔ املی۔ آئس کریم۔ قلفی اور نہ معلوم کس کس نام پر طرح طرح کی ناخوردنی چیزیں غلاظت اور جراثیم سے بھرے ہوئے برتنوں میں اور ان سے زیادہ میلے کچیلے ہاتھوں سے بازاروں۔ بول و براز کی بدبو سے بھری ہوئی نالیوں اور گرد و غبار سے بھرپور سڑکوں اور گلیوں کے کنارے بچوں کے حلقوں سے نیچے اترتی رہتی ہیں، یہ سارا کھیل ماں باپ۔ استادوں اور دوسرے معزز شہریوں کی آنکھوں کے سامنے کھیلا جاتا ہے لیکن کسی کو یہ توفیق نصیب نہیں ہوتی کہ اس کے خلاف آواز اٹھائے یا اس کے نباہ کن اثرات سے رائے عامہ کو آگاہ کرے۔

اس غلاظت خوری کا نتیجہ انحطاط پذیر قومی صحت کی صورت میں سب کے سامنے ہے، اکثر لوگ گذرے ہوئے وقتوں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور آہ سرد بھر کر کہتے ہیں کہ پچھلے زمانوں میں دودھ گھی اور دوسری کھانے پینے کی چیزیں بے حد ارزاں ہوا کرتی تھیں، اس لیے نوجوان خوب تنومند اور باہمت ہوتے تھے ، آج کل کے بچوں اور نوجوانوں کو نہ یہ غذائیں نصیب ہوتی ہیں اور نہ ان کی جسمانی ترقی تسلی بخش طور پر مکمل پذیر ہو سکتی ہے، یہ خیال پوری طرح درست نہیں پہلے وقتوں کی اچھی صحت کا ایک راز صاف ستھری خوراک میں تھا۔ ان دنوں عام غذا نہ صرف سادہ اور قوت بخش ہوا کرتی تھی، بلکہ بڑی حد تک صاف ستھری بھی، غلیظ اور ناخوردنی چیزوں کا کھانا پر ہجوم شہری آبادیوں کے ظہور کے ساتھ وجود میں آیا ہے، لیکن پر ہجوم شہری آبادی صرف ہمارے ملک ہی تک محدود نہیں، دوسری قوموں میں یہ چیز کئی گنا شدید صورت میں موجود ہے، لیکن جہاں دوسری